کلنک
ہیرامنڈی کی درپردہ ثقافت
فوزیہ سعید
پیش لفظ: آئی اے رحمان
ترجمہ: فہمیدہ ریاض
اوکسفرڈ
JALAL BOOKS

کلنک
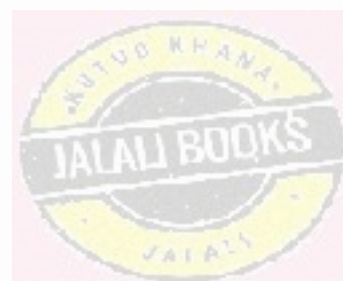
ہیرامنڈی کی دَرپردہ ثقافت

فوزیہ سعید

پیش لفظ: آئی اے رحمان

ترجمہ: فہمیدہ ریاض

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

گریٹ کلیرنڈن اسٹریٹ، اوکسفرڈ OX2 6DP

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس یونیورسٹی آف اوکسفرڈ کا ایک شعبہ ہے۔ یہ دنیا بھر میں
درج ذیل مقامات سے بذریعہ اشاعت کتب تحقیق، علم و فضیلت اور تعلیم میں اعلیٰ معیار کے
مقاصد کے فروغ میں یونیورسٹی کی معاونت کرتا ہے:

اوکسفرڈ نیویارک

اوکلینڈ کیپ ٹاؤن دارالسلام ہونگ کونگ کراچی
کوالالمپور میڈرڈ میلبرن میکسیکوسٹی نیروبی
نیودہلی شنگھائی تائپی ٹورونٹو

درج ذیل ممالک میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کے دفاتر ہیں:

ارجنٹائن آسٹریا برازیل چلی چیک ریپبلک فرانس یونان
گوئٹے مالا ہنگری اٹلی جاپان جنوبی کوریا پولینڈ پرتگال
سنگاپور سوئٹزرلینڈ تھائی لینڈ ترکی یوکرین ویتنام

Oxford برطانیہ اور چند دیگر ممالک میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے۔

پہلی اشاعت ۲۰۰۳ء

یہ کتاب اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کراچی نے
TABOO!: The Hidden Culture of a Red Light Area
کے نام سے ۲۰۰۱ء میں شائع کی۔

ISBN 0 19 579887 2

سرورق ڈیزائن: آصف شاہجہان

تصاویر: ساجد منیر

دوسری طباعت ۲۰۰۵ء

پاکستان میں ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس کراچی میں طبع ہوئی۔
امینہ سید نے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس
پلاٹ نمبر ۳۸، سیکٹر ۱۵، کورنگی انڈسٹریل ایریا،
پی او بکس نمبر ۸۲۱۴، کراچی۔ ۷۴۹۰۰، پاکستان سے شائع کی۔

فہرست

KUTUB KHANA
JALALI BOOKS
JALALI

پیش لفظ

شاہی محلہ وہ بازارِ حسن ہے جس کو پاکستانی عورتوں کا پہلا جنگی محاذ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں عورت اپنی آزادی، منزلت اور معاشرے میں باعزت مقام کے لیے مسلسل جدو جہد کر رہی ہے۔ مگر اس جدو جہد کو کم ہی سمجھا اور پہچانا جاتا ہے۔ یوں تو اس کو بہت سے ناموں سے جانا جاتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ہیرا منڈی یا شاہی محلّہ ہمارے ملک کی سب سے بڑی انسانی منڈی ہے۔ جہاں طوائفیت اور فنونِ لطیفہ انسانی رشتوں کے جال میں پھنسے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شاید ہی کوئی واقفِ حال اس علاقے کے مکینوں کے اصل احوال سے ناواقف ہوگا مگر ان کی حیثیت کو سمجھنے اور تدبیر کرنے کے لیے شاید ہی کوئی تیار ہوگا۔ جو کوئی بھی اس علاقے کی جانب رخ کرتا ہے، چاہے کسی سبب بھی ہو، اس کا یہ عمل اپنی عزت کو بٹہ لگانے اور ماتھے پہ کلنک لگانے کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ جو شخص ان تمام حالات پہ بحث کرنا چاہتا ہے تو وہ تو عزتِ سادات غارت کرنے کے علاوہ بھی موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ بہت سے اخبار نویسوں نے یہ باور کیا کہ فوزیہ سعید شاہی محلے کی ثقافت پر تحقیق کرنے کے نام پہ اسکینڈل میں پھنس رہی اور بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال رہی ہیں۔ یہ اخبار نویس کسی خاص طبقۂ فکر سے تعلق نہیں رکھتے تھے، البتہ ان کا احساسِ فکر ہماری معاشرتی سوچ کی آئینہ داری کرتا ہے۔

اس علاقے پہ بات کرتے ہوئے ریاست کی باریک بینی سے مطالعاتی تشریح ہو سکتی ہے۔ حدود آرڈیننس ملک کے تیسرے فوجی سربراہ ضیاء الحق نے ۱۹۷۹ء میں نافذ کیا تھا۔ انہوں نے ماورائے ازدواج تعلقات پہ حد اس طرح جاری کروائی کہ شدید سزائیں تجویز کی گئیں جس میں

چند سالوں کی قید سے لے کر سنگسار کرنے تک کی سزا شامل تھی۔ اس قانون کے نفاذ کا مقصد قحبہ خانوں کی بندش تھی مگر نہ ہی مذہب کے توسط اور نہ قانون کے ذریعے پاکستان میں طوائفیت ختم کی جا سکی ہے۔

لاہور کے قحبہ خانے یا ملک بھر میں شہروں شہروں پھیلے چکلے نہ صرف موجود ہیں بلکہ تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ چکلوں میں اضافے کی وجوہات میں بہت سے مسائل اجاگر ہوتے ہیں۔ یعنی قانون کی منطقی فوقیت اس لیے تسلیم نہیں کی جا رہی کہ معاشرتی مسائل کو قانون لاگو کرنے سے حل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جو طبقہ طوائفیت کے پیشے کے ذریعہ موجود ہے اس نے قانون سے ماورا طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ بہت وسیع دائرہ ہے جس میں لڑکیاں بیچنے والے، خریدنے والے، لڑکیاں اغوا کرنے والے، لڑکیوں کا سودا کرنے والے، دھندے کے لیے شرائط طے کرنے والیاں اور خود قانون نافذ کرنے والے شامل ہیں۔ ان سب کا ایسا تانا بانا موجود ہے کہ یہ جسم کی تجارت بھرپور طریقے پر جاری و ساری ہے۔ اس سارے دائرے کو دنیا کے قدیم ترین پیشے یعنی جسم بیچنے اور ان کو خریدنے والے تماش بینوں نے کس طرح بڑھاوا دیا ہے، اس کا کم کم ہی تجزیہ کیا جاتا ہے۔ وہ جو مزا لوٹنے والے ہیں وہ بہت مرتبے والے ہیں جبکہ شاہی محلے کی مکین تو محض طوائفیں ہیں۔

شاہی محلے کے مسلسل قائم و دائم رہنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شاہی محلہ ایک ایسی دلچسپی کی جگہ ہے جہاں پیشہ ور عورتیں اپنے گاہکوں کی گانے اور رقص سے دلداری کرتی ہیں۔ جہاں موسیقاروں کا اپنا کاروبار فروغ پاتا ہے۔ جہاں تھیٹر اور فلم سے متعلق لوگ جاذبِ نظر چہروں اور جسموں کی تلاش میں آتے ہیں کہ موجود قانون میں گانے بجانے اور تماش بینوں کی دلداری کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا ہے۔ جبکہ مذہبی رہنماؤں کی جانب سے بار بار یہ مطالبہ رہا ہے کہ یہاں ہر قسم کی ''بے ہودگی'' کو ممنوع قرار دیا جائے کہ انہیں تمام فنون میں عریانیت نظر آتی ہے۔

فنونِ لطیفہ اور طوائفیت کا تعلق اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ طوائف کا پیشہ۔ اس کو کسی بھی نام سے یاد کیا جائے طوائف پدرسری نظام (patriarchy) کا شکار رہی ہے اور اس نظام کو چیلنج کرتی رہی ہے۔ اس نے اپنے حسن اور جسم کو اپنی مرضی سے وضع اور استعمال کیا اور وہ اپنا طرزِ زندگی اور گھومنے پھرنے کی آزادی پر اپنے وضع کردہ قاعدوں کے مطابق عمل پیرا رہی! موسیقی اور رقص وہ بنیادی ذرائع اظہار تھے جو اس آزادی کا مظہر تھے۔

لاہور اور دوسرے پاکستانی شہری علاقے طوائفیت کا مرکز بنے مگر یہ بہت بعد کی بات ہے۔ برصغیر کے پرانے سلطنتی مراکز مہابلی پورم، لکھنؤ اور دہلی میں یہ پیشہ بہت پرانا چلا آتا تھا۔ یہ سکہ بند

طوائفیں ہوتی تھیں جو بادشاہوں اور فوجی سربراہوں کی رائے پر بھی اثر انداز ہوتی تھیں۔ شمالی ہندوستان میں مسلم حکومت کا علاقہ، جس کا شمال مغربی حصہ اب پاکستان کہلاتا ہے، اس میں طوائف کے درجے میں بلا کی تبدیلی آئی۔ قیامِ پاکستان سے قبل مذہبی راہنماؤں نے طوائفیت کو ناگزیر برائی کے طور پر قبول کیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ایسے ہی راہنماؤں نے اسے فوری طور پر لعنت قرار دیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد خانم طبقے کی خواتین کی جگہ کم بلکہ معدوم ہوتی گئی کہ جو بادشاہوں اور شہزادوں کو مسخر کرتی تھیں، اپنے کوٹھے اور حرم رکھتی تھیں اور ان خانموں کی تعداد بڑھ گئی جو لوگوں کے حرم تک محدود تھیں۔ مگر تمام سلطنتی عہد میں ہمیں طوائفوں اور گائیک خواتین کے حوالے ملتے ہیں جن کی محفلوں کو بادشاہِ وقت اور شہزادے آراستہ کرتے تھے۔ یہی گائیک خواتین تمام شاہی ضیافتوں میں لطفِ طبع فراہم کرتی تھیں۔ ان کی خوبصورتی اور فنکارانہ صلاحیتیں شاہی دربار کی خاصیتیں متصور ہوتی تھیں۔ مگر تمام تر تجزیے میں ایک عورت نے بطور بیوی اپنی دشمنِ جاں سے بیشتر اہمیت اور طاقت حاصل کی۔ خانم دوسرے سیارے کی مخلوق کی طرح بدقماش، طاقت کی پرستار اور دولت کی ہوس میں سرشار دکھائی جاتی تھی۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ ابنِ بطوطہ نے محسوس کیا تھا کہ محمد تغلق کے دربار میں وہ عورتیں رقاصاؤں کو لے کر آئی تھیں جو کہ ان راجاؤں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جنہیں کچھ عرصہ پہلے شکست ہوئی تھی۔[۲] جہانگیر کے حرم میں چھ ہزار عورتیں تھیں جن میں چین، کوہ قاف اور افریقہ کی عورتیں شامل تھیں۔ گویا یہ علامتیں تھیں بادشاہ کی برتری کی، اگرچہ وہ ان ممالک کا سربراہ نہیں تھا مگر ان کی عورتیں اس کے حرم میں تھیں۔ بہرحال مغلوں نے فنونِ لطیفہ کی بڑی پذیرائی کی۔ انہوں نے حوصلہ افزائی کے وہ تمام راستے کشادہ رکھے جن کے ذریعے کوئی گائیکہ یا رقاصہ اعلیٰ درجے اور اوصاف کی طوائف بن سکتی تھی۔ مغلوں کے دور میں طوائف کی ثقافت بھرپور طریقے سے ابھری۔

مغلوں کے زوال اور اس کی جگہ پنجاب اور سرحد میں سکھوں کے عروج نے طوائفیت کے خلاف تعصبات کو اور کم کیا۔ اب طوائفیت کھلم کھلا ہونے لگی۔ سکھ حکومت کے خاتمے اور برطانوی تاجداروں کی آمد سے طوائفیت کے نئے پرستار سامنے آ گئے۔ شاہی محلے کے درودیوار گواہ ہیں کہ نئے عمائدین کیسے گورے چٹے تھے۔ ادبی اور ثقافتی اطوار بدلے گئے۔ ایک معمولی سی کوشش کے بعد کہ اخبار فارسی اور عربی میں شائع کیے جائیں اور طب کا مضمون اردو میں پڑھایا جائے انگریزی زبان، لباس اور طرزِ زندگی پرانے طور طریقوں اور ثقافتی آداب پر چھا گئے۔ اوّلین معیارات کہ جن کے توسط سے طوائفیں اپنے حسن اور حسِ مزاح کے ذریعے مردوں پر راج کرتی تھیں، وہ سب اطوار

بے معنی ہو گئے۔اب نچلے درجے کی طوائفوں کی حاکمیت شروع ہو گئی۔

آزادی کی پانچ دہائیوں کے دوران شاہی محلے کے پرستاروں اور گاہکوں میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔راجاؤں کی جگہ سیاست دانوں نے لے لی جو کہ ثقافتی سطح پر راجاؤں سے کم تر روایات کے مالک تھے۔یہ لوگ جنسی تسکین کے دلدادہ اور فنونِ لطیفہ کی تحسین کرنے کے قابل نہ تھے۔اب ایک اور نیا طبقہ سامنے آیا جس میں تجارتی گروہ، مل مالکان اور سرکاری افسران شاہی محلے کے خریدار اور پرستار بن کر ابھرے۔دیکھتے ہی دیکھتے اچھے اور نفیس گانے اور رقص کی کمیابی اور اوچھے رقص اور بے سُری گائیکی کو فروغ حاصل ہوا۔ ۴۰ سال پہلے موسیقی کے رسیا کے لیے کوئی ایک کوٹھا منتخب کرنا آسان تھا کہ وہاں عمدہ کلاسیکی گانے والیاں رہتی تھیں۔مگر آج یہ انتخاب نہ صرف مشکل ہے بلکہ لاحاصل بھی۔بیس برس پہلے اگر کوئی کن رسیا غالبؔ، اقبالؔ یا حسرتؔ موہانی کو سننا چاہتا تھا تو سن سکتا تھا۔مگر اب وہ گانے والی نسل کمیاب ہو گئی ہے۔اگر آج آپ فیضؔ یا فرازؔ کے شعر اس بازار میں سن لیتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہ شعر سینما اور مہدی حسن یا غلام علی کے ذریعے عام گانے والوں اور لوگوں تک پہنچ سکے ہیں۔آج کی معراج بھارتی فلمیں یا کیبل ٹی وی ہے۔اب فنونِ لطیفہ اور طوائفیت میں تمیز ناممکن ہو چکی ہے۔سینما، تھیٹر اور اعلیٰ درجے کے ورائٹی شو کے لیے گائیکہ یا گائیکہ طوائف کے سازندے چونکہ مخصوص ہوتے ہیں اس لیے کچھ غنیمت گانا سننے کو میسر آجاتا ہے ورنہ قحبہ خانے کا کلچر اب شاہی محلے کو بہت پیچھے چھوڑ کر سارے شہر میں پھیل چکا ہے۔البتہ آدھے گھنٹے میں وقتی جنسی تلذذ کے لیے آج بھی شاہی محلے کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

اس صدی میں طوائف اور گانے والی کے گروپ کا ساختیاتی منظرنامہ بھی بدل چکا ہے۔فوزیہ سعید نے تحقیق کے ذریعے جو مواد حاصل کیا ہے یہ پوری تفصیل اسی طرح مسعود سعد سلمان کی تحریروں میں بھی مل جائے گی۔یہ دانشور گیارھویں صدی عیسوی میں تھا۔اس کی ایک نظم میں شہزاد شہزادے کے دربار میں تعظیم میں سازندوں کا حوالہ گانے والیوں اور رقاصاؤں سے پہلے آتا ہے۔سب سے اہم منصب بانسری بجانے والے کو دیا گیا ہے، جس کے طائفے میں بہت سے دوسرے سازندے اور ایک طوائف بھی شامل تھی۔[۳]

شاہی محلے کی ثقافت کا تجزیہ کرنا ایک جان جوکھوں کا کام ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مسحور کن عمل بھی ہے۔یہاں ایک لڑکی کی پیدائش پر لڑکے کی پیدائش سے زیادہ خوشی منائی جاتی ہے۔لڑکے کی جانب قطعی توجہ نہیں دی جاتی ہے۔یہ بات سمجھ میں آتی ہے کیوں کہ معیشت اس سے وابستہ نہیں سمجھی جاتی۔کنوارپنے کی فروخت کا مسئلہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔اس طرح کنواری لڑکی کے جسم کی فروخت ایک نوآموز کے لیے مسحور کن اور شادی کی پابندیوں سے آزادی کا لطف فراہم کرتی

ہے۔ اس ثقافت میں اپنی مدافعت کا پہلو بھی نکلتا ہے کہ پیسے دے کر لذت حاصل کر لی جاتی ہے۔ شاہی محلے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نئے ابھرتے فنکاروں کی وہ تعلیمی درسگاہ ہے جہاں غریب اور امیر نوجوانوں کو گانے اور رقص کا ابتدائی ذائقہ مل جاتا ہے۔ ان فنکاروں کے باعث گانے اور رقص کی ثقافت زندہ ہے اور ان ہی کی وجہ سے سینما میں جان آئی ہے۔ البتہ وہ تمام گانے والیاں اور رقاصائیں جو اپنا جسم نہیں بیچتیں بلکہ اپنا فن بیچتی ہیں انہیں بھی طوائف کہا جاتا ہے۔ انہیں طوائفوں کے ساتھ بھی تعلق رکھنا پڑتا ہے کہ وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی، ان کے کاروبار کو دبانے کی کوششوں کے خلاف، اپنی مدافعت کر سکیں۔

تاریخ میں بہت پہلے طوائفیت کے خلاف تحریک شروع ہو گئی تھی۔ منو پہلی صدی عیسوی کا پروہت تھا۔ رامائن کے مطابق، قدیم شہر ایودھیا منو نے قائم کیا تھا۔ منو فاحشہ عورت کو مجرموں کی اس قطار میں کھڑا کرتا ہے جہاں وہ چوروں اور جوا کھیلنے والوں کو رکھتا ہے۔ وہ بھی زمانہ تھا کہ برصغیر میں ایک خاص حکومت نے اعلان کیا تھا کہ طوائف کو مارنا کوئی جرم نہیں ہے۔ مگر اس حکومت نے جلد ہی اس حقیقت کو پہچان لیا کہ طوائفیت کے توسط سے تو خزانے میں خاصی رقم وصول ہو جاتی تھی۔ اس لیے طوائفیت سے پابندی تو نہیں ہٹائی گئی البتہ متعدد حکمرانوں نے اس تجارت کو قانونی طور پر رواں کرنے کے لیے کئی قوانین وضع کیے۔ طوائفوں کو شہری علاقے کے کنارے آباد ہونے اور اپنا دھندا چلانے کی اجازت ملی۔ شہنشاہ اکبر نے قحبہ خانوں میں آمد و رفت پہ نظر رکھنے کے لیے بہت وسیع منصوبہ بندی کی تاکہ ایک جانب سرکار کے مفادات محفوظ رہیں تو دوسری طرف طوائفوں اور ان کے خریداروں کے کاروبار میں کوئی دخل اندازی نہ ہو۔

اصول وضوابط اس لیے ضروری تھے کہ حکومتی کارندے مکمل طور پر صرف تماش بینوں پہ قوانین کو قربان نہ کر دیں۔ یہ طریقِ کار برطانوی دورِ حکومت تک جاری و ساری رہا۔ بازارِ حسن اور دیگر بہت سے علاقوں کو برطانوی افواج کے داخلے کے لیے ممنوعہ علاقے قرار دیا گیا۔ غیر ضابطہ قوانین قیامِ پاکستان کے بعد تک جاری رہے، جب تک کہ انفرادی طوائفیت کو ایک قابل برداشت برائی سمجھا جاتا تھا نہ کہ جرم۔ جبکہ لڑکیوں کی خرید و فروخت اور قحبہ خانے چلانا، ایسے معاملات کو تعزیری جرم سمجھا جاتا تھا کہ باقاعدہ طوائفیت کا فروغ روکنا مقصود تھا۔ اب یہ سوال کہ طوائفیت کو کس طرح ضوابط میں لایا جائے، بے معنی ہے کہ اب تو اسے سنجیدہ تعزیری جرم قرار دیا جا چکا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی بھی شخص غیر قانونی تجارت کو ضابطے کے دائرے میں نہیں لا سکتا ہے۔ جیسا کہ آپ اسمگلنگ یا ڈاکہ زنی یا منشیات کے کاروبار کو قانون کے دائرے میں نہیں لا سکتے ہیں اسی طرح

طوائفیت پر بھی کسی قانونی حد کے ذریعہ قابو نہیں پایا جا سکتا ہے۔ چونکہ پرانے ضابطے یعنی طوائف کا میڈیکل چیک اپ قسم کی باتیں رو بہ عمل نہیں ہیں، اس لیے طوائفیں بھی حمل سے نجات پانے و دیگر جنسی بیماریوں کے علاج کے لیے نیم حکیم قسم کی ڈاکٹروں اور دائیوں کے ہتھے چڑھ گئی ہیں۔

معاشرے نے ریاست کے طریق کار کو اپناتے ہوئے طوائفیت کو اپنی اخلاقیات و معاشرت سے باہر رکھ دیا ہے گویا کہ ان کے وجود سے انکار ہی اصلاحِ معاشرہ ہے۔ لاہور کے بارے میں تاریخی مخطوطات میں مشکل ہی سے طوائفوں کا ذکر ملتا ہے۔ انسانی جسم کی اس تجارت کا احوال یا تو جنوبی ہندوستان کے کلاسیکی ادب میں ملتا ہے جبکہ طوائف کے بارے میں بیان کو نہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا تھا اور نہ اسے برے لفظوں سے یاد کیا جاتا تھا یا پھر زمانۂ وسطیٰ کے یورپین سیاحوں کے سفر ناموں میں مشرقی منافقت کو خوب کھل کر بیان کیا گیا ہے۔ یہ روایت بھی جاری و ساری ہے کہ طوائف کے وجود کو روایت کے حصے کے طور پر زیرِ بحث بھی لایا جائے۔

اب حالات ذرا سے بدلے ہیں۔ اب چونکہ مختلف اقسام کے تشدد پر بالخصوص عورت کے حوالے سے یہ بات ہونے لگی ہے اور یہ سوال بھی اٹھا ہے کہ عورت کو اپنے بدن پر اختیار ہونا چاہیے تو طوائفیت سے متعلق سوالات بھی اٹھنے لگے ہیں۔ اس لیے عورتوں کے مرتبے سے متعلق کمیشن کی حالیہ رپورٹ میں لکھا گیا ہے کہ:

> زبردستی طوائفیت اور عورتوں کی تجارت، تشدد کے وہ طریقے ہیں جن کی متعدد عورتیں شکار ہیں۔ کم آمدن والے طبقوں میں لڑکیوں سے زبردستی طوائفیت کرانا ہمیشہ سے موجود تھا، اس لیے خواہش کے باوجود بہت کم لڑکیاں اس جال سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو سکی ہیں۔ البتہ بہت کم کوششیں کی گئی ہیں کہ اس تجارت کو کم کیا جائے یا پھر اس جرم کی شکار خواتین کی بحالی کا کام کیا جائے۔[۴]

یہاں بھی زبردستی کی طوائفیت کو ختم کرنے سے متعلق کوئی خاص بات نہیں کہی گئی اور جو عورتیں خود ہی طوائف اس لیے بن جاتی ہیں کہ وہ خاندانی روایات سے بغاوت کرتی ہیں یا زبردستی کی ناخوشی سے رہائی چاہتی ہیں، اس کے علاوہ وہ خواتین جنہوں نے جسم کی تجارت کو تقدیر سمجھتے ہوئے سمجھوتا کر لیا ہے اور وہ جو اپنی مرضی سے یہ پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں، ان کے بارے میں تو کچھ بھی مذکور نہیں ہے۔

نیشنل پلان آف ایکشن کے مصنفین نے خواتین کے ساتھ تمام اقسام کے امتیازی سلوک کے خاتمے کے لیے کنونشن (CEDAW) پر عملدرآمد کا یقین دلانے کی کوشش ہے تاہم ایک لفظ بھی موجود طوائفیت اور معاشرے پر اس کے اثرات کے بارے میں نہیں لکھا ہے۔ یہ موضوع بھی عورتوں

کے تشدد کے زمرے میں ڈال دیا گیا ہے۔ گروہی زنا بالجبر اور تھانوں میں مجرمانہ جنسی حملوں کے بعد، بچوں پر جنسی تشدد، دفتروں و دیگر کام کی جگہوں پر جنسی تشدد، ان سارے موضوعات پر ایکشن پلان میں صرف بیانیہ تحریر ملتی ہے، جس میں متشدد طوائفیت، عورتوں کی تجارت اور شادی کے وقت دلہن کی قیمت لگانے جیسے موضوعات اٹھائے گئے ہیں۔[۵]

کوئی بھی حکومت یا شخص طوائفیت کے موضوع پر بات کرنے کو تیار نہیں ہے کہ اس کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ طوائفیت کو ممنوع قرار دیا جائے۔ یہ کوشش لاحاصل طریقے پر کئی حکمرانوں نے کی جس میں اورنگ زیب سے ضیاء الحق تک کا زمانہ شامل ہے کہ انہوں نے طوائفوں کی شادی کی تجویز پیش کی تھی۔ فیروز تغلق نے کہا تھا کہ وہ ایماندار اور نیک لوگ جو طوائفیت ختم کرنا چاہتے ہیں، آگے آئیں اور طوائفوں سے شادی کریں۔ جب ایک بھی رضا کار آگے نہیں بڑھا تو اس نے یہ موضوع ہی ٹھپ کر کے بند کر دیا تھا۔ اسی طرح کا منصوبہ ضیاء الحق نے بھی اپنے دور میں پیش کیا تھا مگر کوئی نیک دل شریف شخص طوائف کو بیوی بنانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ گزشتہ کئی سالوں میں مسلمان مصلحین نے طوائفوں کو شادی کر کے پاکباز زندگی گزارنے کی دعوت دی مگر جب کبھی کسی نائیکہ نے کسی ایسے مصلحِ قوم کو دعوت دی کہ وہ آگے آئے اور اس سے شادی کرے، تو یہ شعلگی اسی لمحے فنا ہو گئی۔

یہ سوال کہ کیا ایک طوائف اپنا دھندہ چھوڑ کر شادی کر کے گھر کے کونے میں بیٹھ جائے، کئی ایک نئے موضوعات کا دروازہ کھولتا ہے۔ اس کے علاوہ اس طریقِ کار سے ایک ایسے بندھن کا رستہ کھلتا ہے جس میں کم از کم پاکستانی معاشرے میں آزادی نام کی کوئی شے باقی نہیں بچتی ہے۔ فوزیہ سعید کو آخر اس کا جواب مل جاتا ہے اور وہ پدرسری نظام کی اس خاصیت پہ بات کرتی ہے جہاں عورت کو 'اچھی' یا 'بری' عورت کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا موقع ہے جہاں مصنفہ اپنا کردار بطور ماہر بشریات چھوڑ کر بہت حد تک عورتوں کے حقوق کی علمبردار کی حیثیت سے سامنے آجاتی ہے۔ اس کی تحقیق آخر اس نزاعی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے جہاں وہ تاریخی تناظر پر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنے عصری محقق کے ساتھ یہ بحث کرتی ہے کہ طوائفیت اور پدرسری نظام کے جال میں آخر تانا بانا کیا ہے۔ یہ بحث راستہ بناتی ہے ان محققین کے لیے جو آگے چل کر یہ وضاحت کر سکیں کہ آخر کیوں اور کیسے طوائفیت پھیلتی ہے یا کنٹرول کی جاسکتی ہے۔

یہ بحث شروع کرتے ہوئے اس مفروضہ کو منقطع کر دیا گیا ہے کہ طوائفیت کوئی مسئلہ ہے۔ اس حقیقت کو مان لیا گیا ہے کہ طوائفیت ہمارے معاشرے کے معاشی مسائل اور معاشرتی جکڑ بندیوں کی گنجلک کی پیداوار ہے۔

کوک شاستر، طبقۂ امرا کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی تھی۔ یہ درس دیتی ہے اس طریقِ زندگی کا جس میں تلذذ اور گھر کی پاسداری، دونوں یکجان ہو جائیں۔ پاکستانی معاشرہ اور ریاست دونوں طوائفیت کے فروغ کا باعث اس لیے بنتے ہیں کہ یہاں ایک طبقہ بلا کوئی کام کیے دولتمند بن جاتا ہے۔ وہ جس طرح چاہے عیاشی میں دولت خرچ کرتا ہے اور یوں فنونِ لطیفہ کو سراہنے کے سارے راستے مسدود کرتا ہے۔ جب تک دولت کی نامنصفانہ تقسیم کا یہ سلسلہ جاری رہے گا، جب تک موسیقی، رقص، ہنسا اور محبت کرنا گناہ سمجھے جاتے رہیں گے طوائفیت بڑھتی رہے گی۔

ایک اور مشکل مسئلہ ہے کہ ہمارا معاشرہ عورت کو کون سا درجہ دیتا ہے۔ پاکستان میں طوائفیت ایک طرح سے عورت کو وراثتاً عزت اور حق نہ دینے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سب سے مکروہ شکل ہے۔ پہلا مجرمانہ حملہ تو عورت کے حقوق پر اس کو کام نہ کرنے دینا ہے تاکہ وہ پدرسری نظام کی جکڑبندیوں سے آزاد نہ ہو سکے۔ طوائف کے لیے ایک لفظ استعمال ہوتا ہے ''کسبی'' جس کا مطلب ہے کہ جو اپنا رزق خود کماتی ہے۔ ہمارے مڈل کلاس معاشرے میں طوائف کا کام ''پیشہ کرنا'' کہا جاتا ہے۔ گویا ہر وہ عورت جس کا کوئی پیشہ ہے، جو عزت سے اپنی روزی کماتی ہے، اس پر بھی طوائفیت کا کلنک لگا دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں پدرسری نظام بری عورتوں کا ایک گروہ پیدا کرتا ہے اور انہیں بہکاوا دینے والی، گھر برباد کرنے والی، مرد کا دماغ خراب کرنے والی، نوجوان نسل کو تباہ کرنے والی کہا جاتا ہے گویا ان تمام برائیوں اور برے لوگوں کی ذمہ داری تمام تر عورتوں پر ڈال کر بری الذمہ ہوا جاتا ہے۔

پاکستانی عورت کے آشوب پر ابھی بہت لکھا جانا اور اس نوعیت کی تحقیق کرنا باقی ہے کہ ہمارے عمومی عقائد سے رہا ہو کر اس آزاد ذہن سے لکھا جائے جہاں سچ نامعلوم سے معلوم کی حدوں تک آ جائے۔ ان حالات میں کہ جہاں تمام تر اخلاقی معیارات کی ذمہ داری عورت پر ڈال دی جاتی ہے۔ جہاں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ جبریہ جنسی عمل نہیں کرتا ہے۔ جہاں عورت، شادی کے نام پر فروخت کی جا سکتی ہے۔ جہاں عورت کے کام کرنے کا حق سودا طے ہونے پر منحصر ہے، جہاں عورتوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والی تمام خواتین مخربِ اخلاق سمجھی جاتی ہوں اور جہاں عورتوں پر مذہبی پروہت زبردستی کی شادی تھوپتے ہوں، وہاں پاکستان کی عورتوں کو بہت سے محاذوں پر لڑنا ہے۔ شاہی محلّہ تو بس ان سارے محاذوں میں سے ایک ہے!

مئی ۲۰۰۱ء

آئی اے رحمان

حواشی

۱۔ جنوبی ایشیا کے مندروں کی دیوداسیوں کی کہانیاں مشہور ہیں۔ پاکستان کے مسلم معاشرے کے کچھ حصوں میں اب بھی ایک عورت کو "پیر" کے حوالے کردیا جاتا ہے جو کہ "پیر کی اونٹنی" کہلاتی ہے۔ یہ لازماً ایک کمسن کنواری ہوتی ہے اور وہ پیر کے ساتھ ہم بستری کے بعد کسی اور سے شادی نہیں کرسکتی۔

۲۔ ابن بطوطہ کا سفرنامہ، اردو مترجم محمد حسین، تخلیقات، لاہور ۱۹۹۶ء، ص ۱۳۲۔

۳۔ سید ہاشمی فرید آبادی، معاصر لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۶ء ایڈیشن ص ۱۰۳ تا ۱۰۵۔

۴۔ تحقیقاتی کمیشن برائے خواتین، ۱۹۹۷ء ص ۸۵۔

۵۔ قومی منصوبہ عمل برائے خواتین، وزارت بہبود خواتین اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۲۷۔

لاہور کا نقشہ
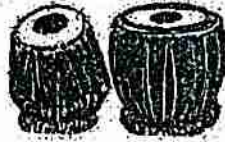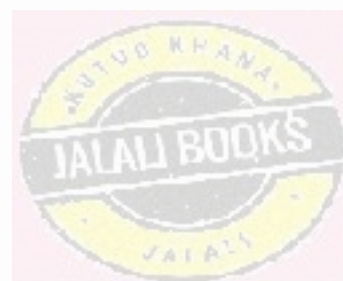
تعارف

امریکا میں اپنا ڈاکٹریٹ مکمل کرنے کے بعد میں پاکستان واپس آ گئی۔ اپنے ماں باپ کے پاس اسلام آباد میں رہتے ہوئے میں نے مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ میں ہمیشہ سے عورتوں کے مسائل کے حوالے سے کام کرنا چاہتی تھی۔ یہ عزم و ارادہ اس وقت سے تھا جب میں پاکستان میں محض ایک طالبہ تھی۔ امریکا میں عورتوں کی تنظیموں کے ساتھ سرگرمِ عمل رہتے ہوئے مجھے مسائل کے ادراک اور کام کرنے کا کافی تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ میرے اندر پختہ اعتقاد تھا کہ پاکستان میں عورتوں کی تحریک کو مزید فعال بنانے کے لیے ہمیں اپنی روایتی اقدار کو کھنگالنا پڑے گا۔ ہمیں اپنے معاشرے میں موجود ترقی پسند عوامل کی بنیاد پر ایک معتدل امتزاج پیدا کرنا ہوگا۔ مجھے بالکل پسند نہیں ہے کہ ہم درآمد کرکے ان نظریات کی پیروی کرنے کی کوشش کریں جن کی جڑیں پاکستان کی ثقافت میں موجود نہ ہوں۔ مجھے پختہ یقین تھا کہ تبدیلی تو صرف ہمارے اپنے معاشرے کے اندر سے رونما ہوگی اور اس کی بنیاد ہماری مروجہ مناسب اقدار کے اندر رہ کر ہی ممکن ہو سکتی ہے۔

ذاتی طور پر مجھے دلچسپی ہوئی کہ میں اپنی ثقافتی جڑوں، اپنے ملک کی لوک روایتوں، اقدار اور طبقوں میں تقسیم، اور معاشرے کے اندر موجود ثقافتی تقسیم کا مطالعہ کروں۔ کیونکہ ہمارے متوسط درجے کے پاکستانی لوگ جس میں میں خود کو شامل کرتی ہوں، ان سارے شہری بابوؤں کو، بچپن ہی سے ان عوامل سے آشنا نہیں کرایا جاتا۔ مجھے احساس ہوا کہ ہر چند مجھے بہت سے عوامل کا ادراک ہو چکا ہے اور عورتوں کے موضوع پر کام کرنے سے بہت سے تجربات بھی میری ذات کا حصہ ہیں،

پھر بھی مجھے دیہات میں آباد عورتوں تک رسائی کرنی چاہیے اور شہروں کے اندرون میں رہنے والی عورتوں کی روایات کو سمجھنا چاہیے۔ ایک محقق کی حیثیت سے میرا دل چاہتا تھا کہ ہمارے مختلف طبقات میں عورت کا جو کردار رہا ہے، اس کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ بھی دیکھا جائے کہ روایات کو عورتوں کے ساتھ کس طرح جوڑا جاتا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ اس سے قبل کہ ہم معاشرے میں اپنی ذاتی حیثیت اور وقار کو بحال کرنے کی جدوجہد شروع کریں ہمیں اس بات کو سمجھنے کے لیے اور جاننے کے لیے ابھی بہت کام کرنا ہے کہ کیسے کیسے ماحول اور حالات سے ہم عورتیں گزرتی ہیں۔ مجھے خاص دلچسپی اس امر سے ہوئی کہ کون کونسی باتیں روایات میں عورتوں کے لیے شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہیں کہ وہ جن کے بارے میں نہ اظہارِ رائے کرسکتی ہیں اور نہ آزادی سے بول سکتی ہیں۔

مجھے لوک رقص سے ہمیشہ سے ہی بہت دلچسپی رہی ہے اور میں نے پاکستان کے بہت سے لوک رقص سیکھے بھی ہیں۔ مجھے اکثر رقص سے متعلق تعصبات کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ کبھی کبھی تو خاندانی اجتماع میں بھی مجھ پر اعتراضات کیے گئے۔ وہ عورتیں جو کسی طور رقص، موسیقی اور گانے سے منسلک ہیں ان کو صحیح یا غلط طریقے پر طوائفیت سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔ میں جب شروع شروع میں لوک تھیٹر پر تحقیق کر رہی تھی تو مجھے معلوم ہوا کہ تھیٹر میں ڈائریکٹرز صرف اس وقت ہیرامنڈی کی لڑکیوں کو منتخب کرتے ہیں جب انہیں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ خاندانی لڑکیاں ناظرین کے سامنے تھیٹر میں کام نہیں کرسکتیں کیونکہ ان کے والدین اس کی اجازت نہیں دیتے۔ بالی جٹی کے حالاتِ زندگی میں نے اپنی ابتدائی تحقیق کے زمانے میں لکھے تھے۔ بالی جٹی تھیٹر میں کام کرتی تھی۔ ہر چند اس نے کبھی طوائف کا پیشہ اختیار نہیں کیا مگر ایک عورت اداکارہ ہونے کے ناتے اسے بھی بری عورت ہی سمجھا گیا۔ بے پناہ دشواریوں اور مراحل کے بعد بالی جٹی کو ایک معروف اسٹیج فنکارہ کی حیثیت سے پہچانا گیا۔ بعدازاں بالی جٹی ہی وہ پہلی عورت تھی جس نے اپنا لوک تھیٹر قائم کیا۔

اس حقیقت کو پہچاننے کے بعد کہ پاکستان کے بیشتر موسیقاروں، گائیکوں اور فلم اسٹاروں، خاص طور پر خواتین کا تعلق ہیرامنڈی کے علاقے ہی سے ہے، مجھے احساس ہوا کہ میں اس ماحول کو قریب سے دیکھوں اور اس کا گہرا مطالعہ کروں۔ مجھے مطالعے کا شوق اس لیے پیدا ہوا کہ ایک طرف ان کو صدارتی اعزازات سے نوازا جاتا ہے، جبکہ دوسری طرف بیشتر خاندانوں میں لڑکیوں کو موسیقی یا رقص کی تربیت حاصل کرنے سے منع کیا جاتا ہے۔

یہ کتاب اس تحقیقی مواد پر مبنی ہے جو کہ میں نے لاہور کی ہیرامنڈی سے حاصل کیا۔ اس علاقے میں روایتی طوائفیت کا ماحول صدیوں سے قائم ہے۔ شاہی محلہ جنوبی ایشیا میں سب سے

مشہور طوائف مرکز رہا ہے۔ یہاں طوائفیت کے ساتھ ساتھ بہترین موسیقی اور رقص کے فنکار پنپتے رہے ہیں۔ یہ علاقہ مغرب کے عنوانِ عام کے بازارِ حسن سے بہت مختلف ہے کہ یہ علاقہ صدیوں سے فنکاروں کی تربیت گاہ، شاعروں، گائیکوں، اداکاروں، موسیقی کے استادوں اور موسیقاروں کا مرکز رہا ہے۔ کلاسیکی موسیقی یہیں پلی، یہیں سے نکلی اور پورے برصغیر پر چھا گئی۔ یہ شاہی محلہ، جدید لاہور اور دوسرے پاکستانی شہروں میں پھیلتے قحبہ خانوں سے بھی مختلف ہے کہ قدیم طوائفیت کی رسم کے مطابق صرف چند منتخبہ خاندان اس پیشے کو اپنا سکتے تھے۔ ان میں سے ایک خاندان کنجر کہلاتا تھا۔ کنجروں کے گھرانے ہی طوائف کا پیشہ اختیار کر سکتے تھے اور یہ روایت صدیوں سے جاری ہے۔ دوسرا موروثی خاندان میراثیوں کا ہے۔ یہ لوگ براہ راست طوائفیت سے منسلک نہیں ہوتے مگر یہ کنجروں کو موسیقی کی سنگت فراہم کرتے ہیں۔ پورے جنوبی ایشیا میں بہت سے موروثی خاندان، اپنے روایتی ہنر کو قائم و دائم رکھے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں کنجر اور میراثی، یہ دونوں قبیلے اپنی روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

اپنی تحقیق کے لیے مواد جمع کرنے کے لیے میں نے شاہی محلے کے باسیوں سے متعلق معلومات پر بطور ایک ماہر بشریات، باقاعدگی اور تسلسل کے ساتھ کام کیا۔ میں نے بہت سے پیشوں سے متعلق کوئی دو سو گھرانوں کے لوگوں کے انٹرویو کیے۔ یہ سارے گھرانے براہ راست یا بالواسطہ طور پر طوائف کے پیشے سے منسلک تھے۔ یہ بنیادی کام طوائفیت کی سماجیات کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوا اور اس طرح میں ان کی روایات، کاروبار اور دقیق مشکلات کو بھی اچھی طرح سمجھ سکی ہوں۔ مجھے طوائف کے خاندان کے سماجی محرکات کا دلچسپ علم بھی حاصل ہوا مثلاً ان گھرانوں میں عورت گھر کی سربراہ ہوتی ہے، لڑکی کی پیدائش پر جشن ہوتا ہے اور لڑکے کی پیدائش پر افسوس۔

علمِ بشریات معاشرے کے ایک رخ کو ایک کھڑکی سے دیکھنے میں اور یوں پورے وسیع نظام کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح میں نے نہ صرف طوائفیت کے حصار کو سمجھا ہے بلکہ اس طرح پاکستانی معاشرے میں مردانہ اور زنانہ کرداروں کی تفہیم میں بھی مدد حاصل کی ہے۔ میں نے یہ تحقیق گویا پاکستانی عورت کو خود کو سمجھنے میں مدد دینے کے لیے کی ہے۔ اگر میں اس کتاب کو تحقیقی مسوّدے کے طور پر مرتب کرتی تو میں اپنے مذکورہ بالا مقصد میں کامیاب نہ ہوتی لہٰذا میں نے بیانیہ انداز اختیار کیا۔ یہ وہ انداز ہے جو شاہی محلے کے مکینوں کی زندگی کی شفاف تصویر پیش کر رہا ہے۔ اس طرح گویا ہمارے معاشرے میں اس علاقے کا جو تصور جا و بے جا ابھارا جاتا ہے، اس کو بھی تحلیل کر رہا ہے اور میں ان لوگوں کو ویسا ہی دکھا رہی ہوں جیسے کہ وہ ہیں۔ سخت کوش یا کاہل،

اچھے یا برے، بے یارومددگار یا طاقت ور، ذہین یا نالائق، اپنی تمام تر مرادوں، خوابوں، امیدوں اور ناامیدیوں کے ساتھ، وہ اس کتاب میں منعکس ہیں۔ میری تحقیق کے ذریعے یہ انسان بن کر سامنے آتے ہیں، وہ انسان کہ جو زندگی بسر کرنے کے لیے مشقت کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ پاکستانی معاشرے میں ان کا کیا مقام ہے۔

میں نے دس سال کے عرصے میں بے شمار افراد سے ملاقاتیں کیں۔ بہت سوں کو اس علاقے میں زندگی سے گزرتے دیکھا۔ اس پوری تحقیق نے میری، بہت سے مسائل اور خاص کر طوائفیت کے مسائل کو سمجھنے میں، بہت مدد کی ہے۔ اس ساری جستجو کے دوران میری اپنی بہت تعلیم ہوئی ہے۔ فیمینسٹ (feminist) تحقیق کا ایک مشکل ترین مقام وہ ہوتا ہے جہاں تحقیق بہت واضح نظر آنے لگے۔ سنڈرا ہارڈنگ نے 'فیمینزم اور میتھاڈولوجسٹ' (Feminism & Methodologist) میں لکھا ہے:

> بہت اچھی فیمینسٹ (feminist) تحقیق اختراع وایجاد کی منزلوں سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ یہ جتاتی ہے کہ محقق خود کو اس مقام پر رکھ کر دیکھے اور پھر معاملہ فہمی کی کوشش کرے اس طرح تحقیق کا پورا نظام اس مدار میں آجاتا ہے جو محقق نے اپنے گرد ہالے کے طور پر قائم کیا ہوا ہے۔

اس لیے یہ جاننے کی خواہش کہ آخر اس عورت کے خلاف جو پبلک میں ڈانس کرتی ہے، ہمارے سماج کے اتنے کڑے تعصبات کیوں ہیں۔ یہ سوال میرے لیے ایک نئے سفر کا حکم بن گیا۔ یہ وہ سفر تھا جس میں حیرت ناکیاں بھی تھیں اور اس بنیادی سوال کے جواب کے لیے زادِ سفر بھی کہ آخر معاشرے میں طاقت اور مردانگی کا آپس میں کیا تعلق ہے اور بالآخر میری سمجھ میں آیا کہ پدرسری نظام نے آخر کس طرح پورے سماج کے سارے رشتوں کو مدوّن کیا ہے۔

میں نے کوشش کی ہے کہ اپنی تحقیقی معلومات کو اس ذیلی ثقافت کو سمجھنے میں بنیادی مبادیات کے طور پر استعمال کروں۔ یہ تحقیق لوگوں کی کہانیوں کی شکل میں پیش کی جارہی ہے۔ دس برسوں میں جمع شدہ مواد کو ان کہانیوں میں مربوط کر دیا گیا ہے جو اس کتاب میں پیش کی جارہی ہیں۔ اس کتاب میں پیش کردہ چند کردار تو اس علاقے کی بہت اہم شخصیات ہیں کہ ان کے طرزِ زندگی اور ان کے الفاظ کے توسط سے یہ ذیلی ثقافت واضح نظر آتی ہے۔ کچھ لوگوں کے نام بدل دیے گئے ہیں۔ یہ تبدیلی ان کے تحفظ کے لیے ہے، مگر شاہی محلے کے بارے میں باقی سب معلومات حقیقت پر مبنی ہیں۔ بنیادی تحقیق پنجابی زبان استعمال کرتے ہوئے کی گئی ہے مگر کہیں کہیں اردو بھی ذریعۂ اظہار رہی ہے۔

بہت سے دیگر محققین طوائف کی بجائے ''کمرشل سیکس ورکر'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ میں نے اپنی تحقیق میں طوائف کا لفظ ہی ستعمال کیا ہے۔ میرے خیال میں ''سیکس ورکر'' کا لفظ بہت محدود معانی رکھتا ہے کہ یہ لفظ ان عورتوں اور لوگوں کے لیے استعمال نہیں ہوسکتا کہ جن کے توسط سے فنونِ لطیفہ وسعت پاتے ہیں اور جو صرف ''سیکس ورکر'' نہیں ہیں۔ اس طرح ''کمرشل سیکس ورکر'' کے استعارے کا استعمال جاپانی گیشا کے استعارے کی جگہ بھی نہیں لے سکتا ہے۔

برصغیر میں طوائفوں کے کئی درجے اور نام ہیں۔ لفظ طوائف عام طور پر اعلیٰ درجے کی طوائفوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کنجری، گشتی، کسبی اور متی کھانی 'نچلے' درجے کی طوائفوں کے لیے یہ لوگ خود بھی استعمال کرتے ہیں۔ برصغیر کے مختلف علاقوں کی تقریباً ہر زبان میں ان کے طبقات کے الگ الگ نام ہیں۔ میں نے اس کتاب میں لفظ طوائف کو اس کے رائج معانی کی بجائے وسیع پیرائے میں استعمال کیا ہے۔ اسی طرح میں سمجھتی ہوں کہ جسم فروشی کی اصطلاح بھی پوری طرح طوائفیت (prostitution) کا احاطہ نہیں کرتی مگر یہاں دوسری کوئی مناسب اصطلاح دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے میں نے اسی کا استعمال کیا ہے۔ ہوسکتا کہ کچھ لوگوں کو ان اصطلاحات پر اعتراض ہو مگر اس کتاب کا مقصد اس لفظ پر بحث کرنے کی بجائے عورت کے اِس پیشے سے منسلک کلنک کو سمجھنا اور اسے ہٹانے کی کوشش کرنا ہے، جس کے لیے ہمیں لفظ کے صحیح یا غلط ہونے سے بالاتر ہوکر آگے چلنا ہے۔

''سیکس ورکر'' کا لفظ ان عورتوں کے لیے زیادہ مناسب ہوگا کہ جو قحبہ خانوں میں صرف بدن فروخت کرنے کا کاروبار کرتی ہیں۔ ''سیکس ورکر'' کا لفظ مغربی معاشرے میں بھی مناسب ہے کہ وہاں بھی اس طرح کی عورت صرف جسم فروخت کرنے کا کاروبار کرتی ہے۔

آخر میں، میں صرف یہ کہوں گی کہ یہ کتاب طوائفیت کے پیشے سے متعلق تعصّبات کو ختم کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔ اس کوشش کے انجام تک کے حصول کے لیے ہم سب کو سیاسی نظام کی ابتری پر برافروختہ ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنا ہے۔
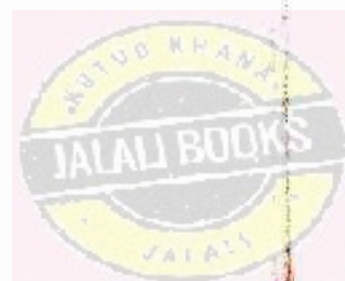
اظہارِ تشکّر

میں یہاں ان لوگوں کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گی جن کے تعاون کے بغیر میرے لیے یہ کتاب مکمل کرنا ممکن نہ تھا اور شاید الفاظ میرے جذبات کا ساتھ نہ دے سکیں۔

سب سے پہلے تو میں شاہی محلّے کے لوگوں کی شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنے گھر اور دِلوں کے دروازے میرے لیے کھول دیے اور مجھے قابلِ اعتبار سمجھا۔ اُن کی مدد کے بغیر میں شاہی محلّے کی دنیا کا دروازہ شاید دوسروں کے لیے نہ کھول سکتی۔ ان لوگوں کے تحفظ کے لیے میں ان کے نام یہاں نہیں لے سکتی مگر ہاں استاد صادق اور محمود کنجر صاحب کا نام ان کی اجازت سے ضرور لکھنا چاہوں گی۔ ان کے نام میں نے کتاب میں تبدیل نہیں کیے۔

میں اپنے والدین سعید احمد اور فرحت سعید کی مشکور ہوں جنہوں نے میرا ایسے موضوع پر تحقیق کرنا قبول کیا جو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مجھے فخر ہے اپنے ماں باپ پر جو اپنے بچوں کی خوشی، تعلیم اور سیکھنے کی جُستجو کو ہر چیز پر ترجیح دیتے ہیں۔ میرا بھائی ڈاکٹر کامران احمد اور بھانجی صدف احمد میرے مسوّدے کے ہر مرحلے پر رائے دیتے رہے۔ میری بہن ملیحہ مجھے مفید مشورے دیتی رہی اور ساتھ ساتھ میری سلامتی اور حفاظت کے لیے دعائیں مانگتی رہی۔

میرے شوہر اور میرے بہترین دوست پال لنڈ برگ نے مجھ پر سب سے بڑا احسان تو یہ کیا کہ مجھے عالمانہ لکھائی سے ہٹا کر عام زبان میں ہمارے معاشرے کے نوجوانوں کے لیے لکھنے کو کہا۔ اپنی کتاب کی ساری لکھائی کے دوران میں اپنے خیالات پر ان سے بات چیت کرتی رہی۔

ٹیبُو کے اِس اردو ترجمے کے لیے فہمیدہ ریاض کی تو میں شکرگزار ہوں ہی جس نے میری تحریر کا اسی جذبے سے ترجمہ کیا جس جذبے سے میں نے اُسے لکھا مگر اس کے علاوہ اپنے دوست یاسر نعمان کی بھی بے حد مشکور ہوں جس نے نا صرف روایتی ثقافت اور موسیقی کے ماہر ہونے کے ناتے مفید مشورے دیئے بلکہ اردو مسوّدے کے ہر مرحلے کو سنبھالا اور ایک نگران کا کردار ادا کیا۔

اردو ترجمے کے کئی حصّوں کو زیادہ جامع بنانے کے لیے میں اپنی بھابھی انشین قنبرانی اور کشور ناہید کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔

آئی اے رحمان ہمیشہ مجھے یہ تحقیق ختم کرنے اور اس کو جلد از جلد شائع کروانے کی تاکید کرتے رہے ہیں۔ مجھے اس تحقیق میں جو بھی مشکلیں آئیں رحمان صاحب ان سے واقف رہے اور میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔

اور آخر میں مجھے ایک بہت ہونہار فوٹو گرافر کا شکریہ ادا کرنا ہے؛ ساجد منیر، جن کا اپنے شعبے میں ایک نام ہے۔ انہوں نے دِلی جذبے سے اس کتاب کے لیے تصویریں کھینچیں۔

باب ا

توجہ کا غلط مرکز

میری تحقیق کو ابھی تقریباً چودہ ماہ ہوئے تھے۔ اس عرصہ میں میری پرانی ٹویوٹا ہزاروں میل چلی تھی۔ میں نے لاہور میں ہیرا منڈی کے ان گنت باسیوں سے ملاقاتیں کی تھیں، گھنٹوں پر محیط بات چیت ریکارڈ کی تھی، کئی بار پولیس سے الجھنا الگ پڑا تھا اور اسی دوران کسی نے (مجھے اس تحقیق سے باز رکھنے کے لیے) میری گاڑی کے چار ٹائر کاٹ ڈالے تھے۔ اس کے باوجود میرے سارے سوالوں کا جواب ابھی تک نہ ملا تھا۔ میں کسی ایسے شخص سے گفتگو کے لیے بیتاب تھی جو یہ سمجھنے میں میری مدد کر سکے کہ لاہور میں طوائفوں کے مسلمہ رواج کا معاشرے سے دراصل کیا رشتہ بنتا ہے۔

خوش قسمتی سے اسلام آباد واپس آنے پر مجھے پیغام ملا کہ امجد شاہ کو ٹیلی فون کروں۔ امجد شاہ اسلام آباد میں پولیس کے اعلیٰ افسر تھے اور میرے ذاتی دوست بھی۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میرا تحقیقی کام کیسا جا رہا ہے، انہوں نے مجھے اپنے گھر مدعو کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ میرے لیے کافی پریشان تھے اور جاننا چاہتے تھے کہ میں خیریت سے تو ہوں۔

اُن سے دوستی کے باوجود میں نے کبھی انہیں بنا وردی کے نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس روز وہ مجھے شلوار قمیض میں نظر آئے۔ نئے طرز پر خوبصورتی سے سجے ہوئے ان کے ڈرائنگ روم میں ان سے اور ان کی بیگم صادقہ سے میری دعا سلام ہوئی۔ اُن کی بیگم پس منظر میں پرچھائیں کی طرح کمرے میں آتی جاتی رہتی تھیں۔ وہ مزیدار ہلکے پھلکے پکوانوں سے مہمانوں تواضع کرتیں اور مزید کھانے پر

اصرار کرتی ہوئی، ہمیشہ اصل بات چیت شروع ہونے سے پہلے خاموشی سے اُٹھ کر چلی جاتیں۔

ہم کمرے میں بیٹھ گئے تو گفتگو کا آغاز ہوا۔ امجد نے کہا، ''سُنا ہے پولیس نے تمہاری تحقیق کی کافی مزاحمت کی۔'' میں نے انہیں بتایا کہ صرف پولیس کی طرف سے ہی نہیں، وزارتِ ثقافت کی جانب سے بھی خاصی مزاحمت ہوئی ہے۔ لاہور کے اس بازارِ حسن کا مشاہدہ اور اس پر تحقیق کرنے کی جانب وزارت کا رویہ قطعی منفی تھا۔ اس کے علاوہ میں نے ایک اور سمت سے مزاحمت کا ذکر کیا جو قدرے پوشیدہ ہونے کے باوجود موجود تھی۔ معاشرہ یہ بات پسند ہی نہ کرتا تھا کہ ایک متوسط طبقے کی خاتونِ اس قسم کے موضوعات سے اُلجھے۔ اس علاقے اور پیشے کے بارے میں سب کچھ اس قدر ''ناگفتنی'' اور ''ممنوع'' تھا کہ کسی نے بھی یہاں تحقیق کرنے کی ہمت افزائی نہیں کی تھی لیکن ساتھ ہی قدرے سنسنی خیز توقعات بھی تھیں؛ گویا میں اس کام کے نتیجے میں کچھ چٹخارے دار کہانیاں نکال لاؤں گی۔

میں نے امجد سے معلوم کرنا چاہا کہ اس محلے کے بارے میں اس قدر رازداری سے کیوں کام لیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اتنا دشوار کیوں ہے؟ میں نے کئی سرکاری دفاتر سے رجوع کیا تھا اور پولیس سے رابطے کی کوشش کی تھی لیکن صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ اس تحقیق میں نہ کوئی تعاون کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی معلومات فراہم کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

''آخر اسے اتنا پُر اسرار کیوں بنایا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس سے ذہن میں جو تصویر اُبھرتی ہے وہ ایک طرف تو بہت رومانوی اور دوسری طرف نہایت گھناؤنی اور خوفزدہ کرنے والی ہے۔''

''بھئی اس سے بڑے بڑوں کو زک پہنچ سکتی ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''میں نے تو آپ کو پہلے ہی بتادیا تھا۔''

''دراصل بات اس سے بڑھ کر ہے۔ لوگوں کا ردِعمل تقریباً جبلتی ہوتا ہے۔''

''جبلتی؟'' انہیں حیرت ہوئی۔ ''تو کیا تمہارے خیال میں لوگوں کو اس پیشے سے پیدائشی نفرت ہے؟''

''نہیں، تقریباً جبلتی سے میری مراد ہے کہ ان گنت نسلوں سے اس خوف اور گھبراہٹ نے معاشرے میں اتنی گہری جڑ پکڑ لی ہے کہ لوگ بالکل بھول جاتے ہیں کہ یہ ردِعمل قدرتی نہیں، صرف معاشرے کا تشکیل کیا ہوا ہے۔ یہ بڑی گہرائی میں ہمارے معاشرے کی نفسیات کا حصہ بن گیا ہے۔ اس پر کوئی غور نہیں کرتا۔ معاشرے میں عورتیں جو بھی کردار ادا کرتی ہیں ان سبھی کے بارے میں یہی عام رویہ ہے۔'' میں نے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ سنجیدہ ہو کر بولے ''یہ ہے ہی ممنوعہ بات۔ یقیناً معاشرے کی اقدار اس سے خوف کھانا سکھاتی ہیں۔''

''ہر ایک تو خوفزدہ نہیں ہے۔ آخر اس معاشرے کے لوگ یہاں مستقل گاہک بن کر جاتے ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے نے کچھ مفروضات گھڑ لیے ہیں جن کا مقصد ہے کہ ایک طرف تو اس مخصوص محلے کو ایک فاصلے پر رکھا جائے۔ اس کے چاروں طرف ایک پُر اسرار جال بُن دیا جائے۔ عام لوگوں میں یہی تاثر قائم رہے کہ چند سماج دشمن عناصر اس دھندے میں ملوث ہیں اور دوسری طرف یہی طوائفیں معاشرے کے جن افراد کی خدمت کرتی ہیں ان پر کوئی حرف نہ آنے پائے اور وہ بالکل محفوظ رہیں۔''

امجد شاہ نے پاس کی تپائی سے اپنا پائپ اُٹھا کر سلگایا۔ پھر کرسی میں دراز ہو کر مجھ سے پوچھا۔

''کیا مفروضات؟''

''آپ زنا بالجبر (rape) کی مثال لیجئے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ طوائف کا پیشہ زنا بالجبر ہے، میں صرف مثال دے رہی ہوں۔ آپ یہ تو مانتے ہیں کہ معاشرہ زنا بالجبر کی پوری طرح مذمت کرتا ہے؟''

امجد نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں! بالکل!''

''اس کے باوجود ہم مجرم مرد کا عادتاً دفاع کرنے لگتے ہیں۔ اس کے لیے بعض تیار شدہ مفروضات کو کام میں لایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ غلطی ضرور عورت کی ہی ہوگی۔ اس کے لباس میں کوئی اکسانے والی بات ہوگی، اس نے خود ہی کوئی ایسا اشارہ دیا ہوگا۔ زانی مرد کے لیے بھی مفروضات گھڑے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایسے مجرم مرد یقیناً پاگل ہوتے ہیں۔ عام سمجھ بوجھ کا مرد تو زنا بالجبر کر ہی نہیں سکتا۔ یہ جذبات کی شدت میں کیا ہوا جرم ہے جو قابل معافی ہے۔ یہ معاشرے کی پابندیوں اور گھٹن کی وجہ سے سرزد ہو جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زنا بالجبر کے جرم کا تعلق جنس سے نہیں بلکہ طاقت اور دھونس سے ہوتا ہے۔ جرم کے بعد دوسرے مفروضات کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ زنا بالجبر کا شکار ہونے والی عورت سے کوئی شادی نہیں کر سکتا۔ وہ اب 'داغی' ہو چکی ہے۔ اس کا 'گوہر عصمت' لوٹا جا چکا ہے۔ عورت سب کچھ گنوا چکی۔ لیکن مرد بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ مرد کی عصمت ہوتی ہی نہیں جس کے لُٹنے کا سوال پیدا ہو۔'' میں نے بات جاری رکھی۔

''یہ تمام مفروضات معاشرے کو اجازت دیتے ہیں کہ عورت کو ساری توجہ کا مرکز بنا دیا جائے اور اُسی کو موردِ الزام ٹھہرایا جائے۔ جب کہ مجرم مرد پس منظر میں روپوش ہو جائے اور صاف بچ نکلے۔ اس ملک میں ہم مجرم مرد کو اکثر معاف کر دیتے ہیں۔ یہ سوچ ہمیں ورثے میں ملی ہے کہ 'کون سی بڑی بات ہے؟ جوانی میں تو ایسا ہو ہی جاتا ہے۔' وغیرہ۔ لیکن عورت اب شرمساری سے چھٹکارا

حاصل نہیں کر سکتی۔ وہ عمر بھر کے لیے داغدار ہوگئی۔ اور ہمارے یہ بڑے بڑے سیاستدان بھی جب کسی ایسی واردات میں 'انصاف' دلانے کا وعدہ کرتے ہیں اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں تو ٹی وی کی اسکرین پر عورت کا ہی سر ڈھانپتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ اصل مجرم کو کبھی کیمرے کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!" امجد نے کہا "تم یہ کہہ رہی ہو کہ ہم ساری توجہ کا مرکز جرم کا شکار ہونے والی عورت کو ہی سمجھتے ہیں اور اس کی آڑ میں مجرم سے نرم سلوک کرتے ہیں۔ لیکن اس کا طوائف کے پیشے سے کیا تعلق ہے؟ طوائف کس طرح جرم کا شکار ہوتی ہے؟"

"اس طرح کہ معاشرہ طوائف کے سلسلے میں بھی یہی رویہ اپناتا ہے۔ شاہی محلے اور بازارِ حسن کے بارے میں مفروضات گھڑے گئے ہیں جن سے خوف اور پُراسراریت کا دھندلکا چھا جائے۔ توجہ کا مرکز وہ 'بُرے لوگ' رہیں، طوائف اور دلال، جو یہ 'بُرا' کام کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ مفروضہ بھی سماج میں عام ہے کہ اگر معاشرے کی کوئی عورت اکیلی یا مرد کے بغیر رہے تو بڑی آسانی سے ان لوگوں کے جال میں پھنس سکتی ہے اور ایک نہ ایک دن ضرور کوٹھے پر جا بیٹھے گی۔ اور ایک بار پھنس گئی تو پھر نجات پانا ممکن ہی نہیں۔ معاشرہ اسے کبھی قبول نہیں کرے گا۔ آپ نے خود یہ بات ہزار بار سنی ہوگی۔ ہماری تہذیب نے ورثے میں ہمیں یہی سوچ دی ہے اور ادب، فلموں اور مختلف طریقوں سے اسی بات پر اصرار کیا جاتا ہے۔"

امجد نے ایک طویل سانس لی پھر کہنے لگے۔

"لیکن اگر میں کہوں کہ اس بازار سے فاصلہ رکھنا ضروری ہے تو آپ کیا کہیں گی؟ میں نہیں چاہوں گا کہ میری بیٹی کو اس بارے میں زیادہ علم ہو۔ یہ خوف اسے اس جگہ سے دور تو رکھتا ہے نا۔"

"لیکن کیا آپ اپنے بیٹے کے لیے بھی ایسا ہی سوچیں گے؟" میں نے سوال کیا۔ "کیا بیٹے کو ایسی جگہ سے اور بھی زیادہ نہیں ڈرنا چاہیے؟ دراصل میں یہی بتانا چاہ رہی ہوں۔ ہم یہ بالکل نظرانداز کردیتے ہیں کہ طوائفیں ایک پورے معاشرتی عمل کا حصہ ہیں۔ اس عمل میں طوائفوں کے گاہک دراصل زیادہ اہم ہیں لیکن ان کے بارے میں بالکل غور نہیں کیا جاتا۔ معاشرہ ان کا بچاؤ کرتا ہے۔ اب ہمیں اپنی توجہ کا مرکز ان کو بنانا چاہیے۔ یہ ہمارے چاروں طرف موجود ہیں اور ہم انہیں نہیں جانتے۔ شاہی محلے میں پولیس گاہکوں کو بچاتی ہے اور طوائفوں کو تنگ کرتی ہے۔ میری مراد اُن گاہکوں سے نہیں ہے جو کسی بھی رات گیارہ سے ایک بجے تک کوٹھوں پر جاتے ہیں بلکہ ان گاہکوں سے ہے جو اثر و رسوخ والے ہیں اور طوائف کے پیشے کو زندہ اور قائم رکھتے ہیں۔ میں طوائف کے

بارے میں آپ کو درجنوں مفروضات سُنا دوں لیکن کیا آپ گاہک کے بارے میں ایک بھی مفروضہ سُنا سکتے ہیں؟''

امجد شاہ مسکرانے لگے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''کہا جاتا ہے کہ عورت کے چار روپ ہیں۔ ماں، بیوی، بہن اور طوائف۔ اگر کوئی طوائف دوسرے کردار اپنانا چاہے تو اسے درد و غم کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ ہمارے کلچر میں طوائف کا وجود دوسرے تمام رشتوں سے علیحدہ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔''

''اس میں کچھ سچائی ضرور ہوگی...'' امجد نے ہچکچاتے ہوئے کہا، ''میں یہ نہیں کہتا کہ وہ معاشرے میں جذب نہیں ہو سکتیں مگر.....''

''کیا طوائفیں کسی درخت پر اُگتی ہیں؟'' میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔ ''کیا وہ مائیں، بیٹیاں اور بہنیں نہیں ہیں؟''

''ہاں ہاں! ضرور ہوں گی، یعنی آپس میں... مگر...''

''ہم انہیں عجیب مخلوقات کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن مجھ سے بہتر آپ خود جانتے ہیں کہ لاہور کے اعلیٰ طبقے کی کتنی ذہین نوجوان عورتیں فرصت کے اوقات میں یہ پیشہ کرتی ہیں۔ ''کال گرل'' یعنی خاموشی سے کسی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں بلائی جانے والی طوائفوں کا رواج پھل پھول رہا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اب کتنا عام ہو چکا ہے۔ جگہ جگہ عام علاقوں میں بھی یہ دھندا جاری ہے۔ انہیں الگ الگ خانوں میں بانٹا نہیں جا سکتا۔ میں صرف اس محلے کی ''روایتی'' طوائف پر تحقیق کر رہی ہوں مگر اس پر بھی کہ گلبرگ سے کتنی ہی عورتیں اپنی کاروں میں یہاں آتی ہیں، ہیرا منڈی میں اپنی ''دکان'' کا تالا کھولتی ہیں اور رات کے گیارہ سے ایک بجے تک مجرا کرنے کے بعد اپنے گھروں کو لوٹ جاتی ہیں۔''

امجد پائپ پیتے ہوئے خلا میں گھورتے رہے۔

میں نے بات جاری رکھی۔ ''اور یہ مفروضہ کہ اگر کسی عورت نے اس بازار میں قدم رکھا تو یہاں کے باسی اسے زبردستی طوائف بنا دیں گے۔؟ اس میں کونسا سچ ہے؟ کیا لوگوں کو معلوم ہے کہ شاہی محلے میں ایسی کئی خواتین رہتی ہیں جن کا طوائف کے پیشے سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں۔ یہاں دکانداروں کے کئی خاندان رہتے ہیں۔ ان کی بیویاں طوائفیں نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ کنجر برادری کی بہوئیں کبھی یہ پیشہ نہیں کرتیں۔ ان کی کئی بیٹیاں بھی اپنی مرضی سے یہ پیشہ اختیار نہ کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، فرض کیجئے کہ ہم یہ مفروضات ختم کر دیتے ہیں، پھر بھی اس سے

حاصل کیا ہوگا؟'' انہوں نے کہا۔

''حقیقت کا ذکر میں نے صرف مفروضات کا بودا پن ثابت کرنے کے لیے کیا ہے۔ میں اس بات پر اصرار کروں گی کہ مفروضات قائم رکھ کر ہم ساری توجہ صرف طوائفوں تک محدود رکھتے ہیں جو کہ اس معاشرتی رواج یا تصویر کا صرف ایک حصہ ہے۔ پوری بات سمجھنے کے لیے ہمیں اس کے دوسرے حصے پر بھی نظر ڈالنی ہوگی۔ تب ہی پوری تصویر سامنے آئے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

امجد نے ایک ابرو اُٹھا کر مجھ سے پوچھا: ''یعنی...؟؟''

''یعنی باقی سماج پر توجہ دینی ہوگی۔ توجہ کا مرکز اب ہم کو بننا چاہیے! طوائفیں اپنی خدمات آخر پیش کسے کرتی ہیں؟ ان خدمات سے مستفید کون ہوتا ہے؟ سماج نے خود کیا خدمات ان کے ذمے لگائی ہیں؟ کیا ہم ان موضوعات پر کھل کر بحث و مباحثہ کرنا چاہتے ہیں؟ کیا ہم اس کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں؟ یا ہم صرف ہر بات سے مکرتے رہنا چاہتے ہیں؟ محض 'اُن خراب لوگوں' کو الزام دیتے رہنا چاہتے ہیں جو اس محلے میں رہتے ہیں اور ہمارے مردوں کو غلط راہ پر ڈال دیتے ہیں!''

''تمہاری بات میرے دل کو تو نہیں لگتی۔'' امجد نے کنکھیوں سے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر یہ رازداری اور مزاحمت آخر کیوں ہے؟ اس موضوع سے خوف کیوں کھایا جاتا ہے؟ کیا ہم اس سے ڈرتے ہیں کہ ہمارے دوغلے پن اور منافقت کا پردہ فاش ہو جائے گا؟ اب یہ نہ کہیے گا کہ آپ بھی اسے بہتر سمجھتے ہیں کہ ہم جھوٹ موٹ یہ ظاہر کرتے رہیں کہ ہمارے وطن میں جسم فروشی ہوتی ہی نہیں۔''

''سوچنا پڑے گا!'' انہوں نے جواب دیا۔

میری آواز بلند ہوگئی'' آپ یہ بتائیے، اگر ہم سب اس پیشے کے خلاف ہیں تو اس کاروبار میں جو قوتیں کارفرما ہیں ان کی سچائی جاننے میں کیا ہرج ہے؟ کون سی عورتیں اپنی خوشی سے پیشہ کرنے لگتی ہیں؟ زبردستی کن کے ساتھ ہوتی ہے؟ پیسہ کس کو ملتا ہے؟ انہیں تحفظ کون فراہم کرتا ہے؟ اگر کوئی اس نام نہاد سماجی 'ناسور' سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے تو اسے اس کے بارے میں معلومات تو حاصل کرنی ہی ہوں گی۔ یہ سمجھنے کے لیے اس پیشے کی 'پُر اسراریت' ختم کرنی لازمی ہے۔ جب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ بھی بالکل ہم جیسے ہی لوگ ہیں؛ کوئی طاقت ور ہے تو کوئی بے بس، کوئی خوش ہے تو کوئی غمگین، بس جیسے تیسے مشکل وقت گزار رہا ہے اور جدوجہد کر رہا ہے، کوئی ایماندار ہے تو کوئی سب سے آگے نکل جانے کے لیے کوشاں ہے اور ہماری طرح وہ لوگ بھی ہنستے ہیں، روتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں، تو پھر شاید ہم صرف ان کی بجائے اپنے اوپر یعنی باقی معاشرے پر بھی نظر ڈال سکیں۔''

امجد کی بیگم صادقہ نے ٹوکا: ''آیئے باہر لان میں بیٹھیں۔ میں نے آپ لوگوں کے لیے چائے وہیں لگائی ہے۔''

میں امجد کی بیگم کے ساتھ باہر جانے لگی۔ امجد نے کہا: ''کیا تم سچ مچ یہ سمجھتی ہو کہ طوائفوں کو ہم نے خود تخلیق کیا ہے؟''

میں نے مڑ کر جواب دیا: ''ہم یہ نظرانداز نہیں کر سکتے کہ تاریخی لحاظ سے طوائفیں وسیع تر معاشرے کے لیے مخصوص خدمات انجام دیتی رہی ہیں۔ اس کے کافی ثبوت موجود ہیں۔ 'کنجر' بھی مختلف پیشہ ور ذاتوں کی طرح ہیں۔ امجد صاحب کیا آپ اس کا مطلب سمجھے؟ یعنی کئی نسلوں سے شاہی محلے کی یہ عورتیں پیدا ہی اس ذات میں ہوئی ہیں۔ انہیں سماج نے پیدا ہوتے ہی اسی پیشے کے لیے تیار کیا ہے۔ یہ کوئی بدچلن عورتیں نہیں تھیں جو طوائف بننا چاہتی تھیں اور نہ انہیں بچپن میں غریب ماں باپ نے فروخت کیا تھا۔''

امجد کی بیگم نے میرا بازو پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ ہم باہر چائے کی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ میں نے پھر بات چھیڑی: ''دوسری ذاتوں کی طرح کنجروں کے سپرد بھی ایک مخصوص پیشہ کیا گیا تھا۔ جیسے نائیوں، قصائیوں، چماروں اور لوہاروں کے مخصوص پیشے تھے۔ قدیم جاگیرداری نظام میں سماج کو مطلوب ہر کام کرنے والوں کا موجود ہونا ضروری تھا۔ سماجی درجہ بندی اسی ضرورت کے تحت کی گئی تھی۔ اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ سماج کی تمام ضروریات پوری ہوتی رہیں اور نظام بدستور قائم رہے۔ ہندوستان میں ایسی ذاتوں پر کافی تحقیقی کام ہوا ہے جن میں لڑکیوں کو صرف خاندانی پیشہ یعنی طوائف بننا ہی سکھایا جاتا ہے۔ دوسرے پیشوں کی طرح ان ذاتوں کا بھی سماج میں ایک خاص مقام ہوتا تھا۔ ہم اس مسئلہ کو ایک وسیع تر سیاق و سباق میں کیوں نہیں دیکھ سکتے؟''

صادقہ ہماری باتوں سے اکتا گئی تھی، اس نے بات کاٹی: ''خدا کے لیے بس بھی کرو۔ چائے پیو، کچھ کھاؤ اور کسی خوشگوار موضوع پر بات چیت کرو۔''

میں مسکرا دی۔ میں نے صادقہ سے اس کے خاندان کے بارے میں گفتگو شروع کر دی۔ اس کے بعد ساری شام امجد شاہ خاموش رہے۔ بس اپنی مونچھوں سے کھیلتے ہوئے خلا میں تکتے رہے۔

باب ۲

شاہی محلّہ: دن میں اور رات میں

اپنی تحقیق کا باقاعدہ آغاز کرنے سے کوئی آٹھ ماہ قبل میں پہلی بار شاہی محلے میں گئی تھی۔ وہاں جا کر ہی میرے دل میں اس تحقیق کی خواہش پیدا ہوئی۔ اسلام آباد میں قومی ثقافتی ادارے ''لوک ورثہ'' کے سربراہ عکسی مفتی نے مجھے اور اپنے دوسرے دو دوستوں کو دعوت دی کہ اُن کے ساتھ لاہور چلیں (تب میں لوک ورثہ میں کام کر رہی تھی)۔ یہ تینوں باضابطہ فوٹو گرافر تھے۔ مجھے دراصل بسنت کے سالانہ تہوار پر لوک ورثہ میوزیم کے لیے پتنگیں خریدنے لاہور جانا تھا۔ ہمارے ساتھی پرانے شہر کی تصویریں اُتارنا چاہتے تھے جہاں یہ تہوار ہر سال بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔

میں قسم قسم کی پتنگوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی جب کسی نے بتایا کہ ہم اس وقت مشہور شاہی محلے میں ہیں۔ میں نے حیران ہو کر گردوپیش پر نظر ڈالی مگر مجھے اس جگہ اور پرانے لاہور کے دوسرے کسی بھی بازار میں کوئی خاص فرق نظر نہ آیا۔ وہی تنگ گلیاں، ویسی ہی عمارتیں، راہگیروں کی بھیڑ، رکشاؤں، سائیکلوں اور تانگوں کے بیچ دوڑتے ہوئے بچے، سب کچھ ویسا ہی تو تھا۔ بازار میں مردوں کا میری طرف رویہ بھی مختلف نہ تھا۔ میں نے یہ تو محسوس کیا کہ ہم جب بھی کوئی پتا پوچھنے کے لیے کہیں رکتے ہیں تو آن کی آن میں تماش بینوں کی ایک بھیڑ جمع ہو جاتی ہے؛ لیکن ایسا تو دوسرے بازاروں میں بھی ہوتا ہے۔ اور ہر لحاظ سے یہ گلیاں کسی راہگیر عورت کے لیے بالکل شہر کی دوسری گلیوں جیسی ہی تھیں۔

دن کے وقت شاہی محلے کی ڈھکی ہوئی بالکونیاں

خاموش کوٹھے، بند دریچے، رات میں جاگ اٹھنے کے انتظار میں

رات کی روشنیاں گاہکوں کے لیے کشش کا باعث ہیں۔

''آفس'' کا وقت شروع: شلوار قمیض میں ملبوس اپنے گاہکوں کی آمد کے انتظار میں

گاہکوں کے لیے چھوٹے کرنسی نوٹ فراہم کر کے محلے کا یہ لڑکا مناسب کمیشن حاصل کر لیتا ہے۔
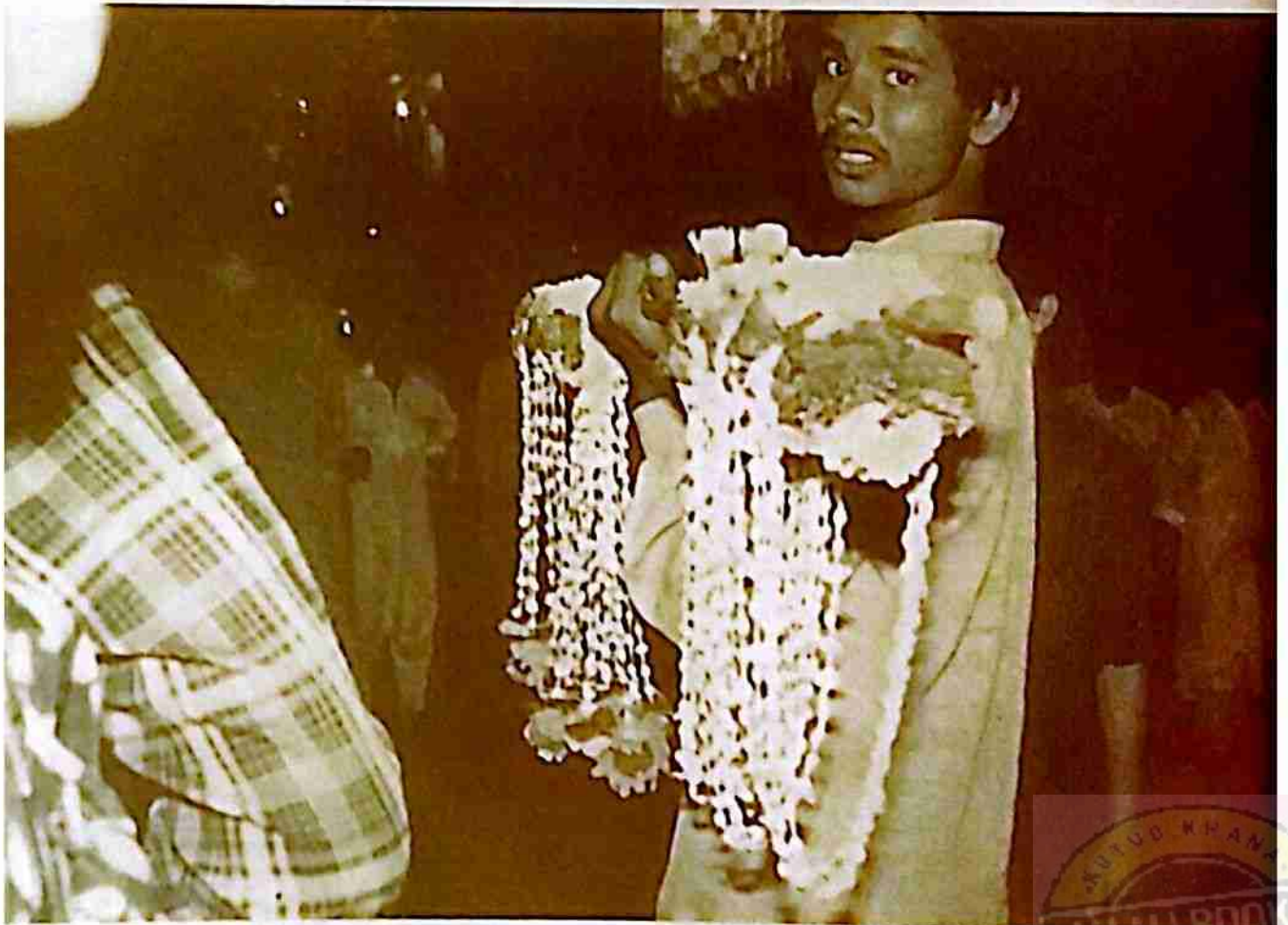
پھولوں کے ہار بیچنا بھی کوٹھے سے متعلقہ ایک روزگار ہے۔

روشن بالکونیوں میں کھڑی رقاصائیں گاہکوں کو اشارے کنائے سے اوپر کوٹھوں پہ بلاتے ہوئے۔

شاہی محلے میں کھانے پینے کی دکانیں ساری رات گاہکوں کے لیے کھلی رہتی ہیں۔

شام کو میرے ساتھی آپس میں باتیں کرنے لگے کہ ایک بار پھر شاہی محلہ جایا جائے۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے بھی ساتھ لے چلیں تاکہ میں تحقیقی نقطہ نظر سے اس علاقے کا جائزہ لے سکوں۔ وہ سب رضامند ہو گئے اور اس طرح ہم چاروں دوبارہ وہاں پہنچے۔

رات کے وقت محلے کا ماحول دن سے بالکل مختلف نظر آتا تھا۔ بھیڑ زیادہ تھی اور گلیوں میں زیادہ تر صرف مرد ہی تھے۔ بڑی چہل پہل کا سماں تھا۔ دکانیں روشن تھیں اور پان پھول بیچنے والے چھوٹے چھوٹے لڑکے ادھر ادھر گھومتے پھر رہے تھے۔ سب لوگوں کی طرح ہم نے بھی پیدل ہی چلنے کی ٹھانی۔ وہ کوئی بیس فٹ چوڑی سڑک تھی جو راہگیروں کے لیے کافی کشادہ تھی۔ کبھی کبھی کوئی کار بھی آنکلتی مگر علاقے سے وہ ٹریفک غائب ہو گیا تھا جو دن کے وقت نظر آیا تھا۔ میں نے اب غور کیا کہ مکانوں کی نچلی منزلیں سڑک سے کوئی تین چار فٹ اونچی تھیں اور ان تک سیڑھیاں چڑھ کر ہی پہنچا جا سکتا تھا۔ بعض سیڑھیاں اوپر کسی چبوترے یا مکانوں کے سامنے بنے گلیارے تک جاتی تھیں۔

راستے میں چہل قدمی کرتے ہوئے ہمیں کمروں میں عورتیں نظر آئیں۔ وہ عمدہ لباس پہنے اس طرح آرام سے بیٹھی تھیں جیسے عام عورتیں اپنے ڈرائنگ روموں میں بیٹھتی ہیں، مگر ان کمروں کے سامنے کی دیواریں غائب تھیں۔ ان کمروں کے دروازے کشادہ تھے جن پر باریک سا پردہ یا چقیں پڑی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر عورتیں کمرے کے وسط میں فرش پر بیٹھی تھیں، کچھ صوفوں پر بھی بیٹھی تھیں۔ بعض کمروں میں عورتوں کی پشت پر طبلچی اور ہارمونیم وغیرہ بجانے والے صف باندھے بیٹھے تھے۔ زیادہ تر عورتوں نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ ایک 'دکان' میں عورتوں نے عربی قسم کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ لمبی لمبی قبائیں پہنے اور سروں پر سنہری ٹوپیاں لگائے ہوئے تھیں جن سے موتیوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی دیسی فلم کے سیٹ پر سے آئی ہیں۔

اوپر بالا خانوں میں عورتیں بھڑک دار کپڑے پہنے اور گہرا میک اپ کیے جھروکوں میں بھی نظر آئیں۔ ان کی دکانیں دوسری منزلوں پر تھیں۔ وہ جھانک کر مسکراتیں، کسی راہ گیر کی توجہ کھینچنے کے لیے ہاتھ سے اشارے کرتیں اور پھر اپنے کمروں میں غائب ہو جاتیں۔

عمارتوں کی دونوں منزلوں پر یہ کمرے بجی سجائی دکانوں کی طرح خریداروں کے منتظر تھے۔ گاہک اپنے لیے مال کا غور سے جائزہ لے رہے تھے۔ مجھے اس علاقے کے لیے استعمال ہونے والا نام یاد آیا۔ ''بازارِ حسن'' اور ''ہیرا منڈی''! — یہ واقعی ایک منڈی تھی۔ مال سامنے پڑا تھا اور گاہک گھوم پھر کر فیصلہ کر رہے تھے کہ کیا خریدیں۔

بھیڑ میں کچھ بچے پانچ اور دس روپے کے نوٹوں کی گڈیاں لیے پھر رہے تھے کہ گاہکوں کے

بڑے نوٹ بھنا دیں اور گاہکوں کو رقاصاؤں پر نقدی نچھاور کرنے میں آسانی ہو جیسا کہ ہمارے یہاں تعریف کے اظہار کا پرانا طریقہ ہے۔

یہ دکانیں جہاں ناچنے والیاں بیٹھی تھیں دراصل ''کوٹھے'' تھے۔ یہ منظر ہماری ان گنت فلموں میں دکھائے جاتے رہے ہیں۔ فلموں میں گاہک اسی طرح سیڑھیاں چڑھ کر ''کوٹھے'' پر جاتے ہیں۔

ہم بسنت کے تہوار کے لیے لاہور آئے تھے اور میرا لباس بھی کچھ نمایاں لگ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کئی راہگیر مجھے اسی محلے کی عورت سمجھ رہے ہیں جو گھومنے پھرنے کے لیے کوٹھے سے اتر آئی ہے۔ گاہک سر سے پیر تک میرا جائزہ لے رہے تھے لیکن نہ کسی نے مجھے ہاتھ لگایا اور نہ تنگ کیا۔ میرے تینوں ساتھی یوں بھی مجھے اپنے محفوظ حلقے میں لیے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میری گھبراہٹ کا شائبہ بھی دور ہو گیا۔ میں بالکل پرسکون ہو گئی بلکہ مجھے ایسی آزادی کا احساس ہوا جس کی وضاحت کرنا بہت مشکل ہے۔

ہم نے ایک کمرہ منتخب کیا جہاں دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ میری توجہ ان کے گھنگروؤں نے کھینچی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ صرف گانے والی نہیں، ناچنے والی بھی ہیں۔ رقص سے مجھے خود دلچسپی رہی تھی اور رقص دیکھنے کا یہ اچھا موقع تھا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو دونوں عورتوں نے کھڑے ہو کر بہت اخلاق سے ہمارا استقبال کیا۔ ایک کم سن لڑکے نے فوراً دروازہ بند کر دیا (میرے دوست نے مجھے بتایا کہ یہاں ایک وقت میں ایک ہی ''پارٹی'' کی مہمانداری کی جاتی ہے تاکہ تماش بینوں میں لڑائی جھگڑے کے امکانات نہ رہیں)۔

کمرے کے فرش پر قالین تھا جس پر ایک چاندنی بچھی تھی اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ایک معمر عورت اور دس بارہ سالہ لڑکے کے علاوہ ایک طبلچی، ایک ڈھولکی والا اور ایک ہارمونیم بجانے والا بھی بیٹھے تھے۔

میرے متعلق یہ کہہ کر کہ ''یہ امریکا سے آئی ہیں اور ناچ دیکھنا چاہتی ہیں''، عکسی مفتی نے سب کی تسلی کر دی۔ ہم لوگ بیٹھ گئے تو ہمیں چائے پیش کی گئی جس سے ہم نے انکار کر دیا۔

ان میں سے ایک نے پوچھا: ''کی سنو گے؟ (کیا سنو گے؟)''

''پنجابی میں کچھ بھی سنا دو۔'' میرے ایک ساتھی نے جواب دیا۔

عورتوں نے ہارمونیم اور طبلے کی سنگت پر گانا اور ناچنا شروع کر دیا۔

ان کی آوازیں بھدی تھیں اور وہ کسی پنجابی فلم کا گانا بڑے بھونڈے انداز میں گا رہی تھیں۔ موسیقی کی آواز بہت اونچی تھی اور عورتوں کے گھنگرو بھی بہت شور کر رہے تھے۔ وہ مخصوص فلمی انداز

میں کچھ فحش سے اشارے کرتے ہوئے ناچ رہی تھیں۔ دونوں عورتیں ایک وقت میں ایک آدمی پر متوجہ ہوتیں۔ دونوں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رجھانے والے اشارے کرتیں جو صاف مصنوعی نظر آرہے تھے۔ جب وہ شخص اپنی ''ویل'' (نچھاور کی جانے والی رقم) دے دیتا تب وہ دوسرے کی طرف متوجہ ہوتیں۔ انہوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ جب وہ میری طرف رُخ کرتی تھیں تو میرے ساتھی میری طرف سے ''ویل'' دے دیتے تھے۔ بڑی پیشہ ورانہ مہارت سے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرنے کے لیے انہوں نے یہ ترکیب بار بار استعمال کی۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ ان کے فن کا ایک حصہ ہے۔ باہر سڑک پر دوسرے گاہک بھی تھے اور ان کا وقت قیمتی تھا۔ انہوں نے بڑی مشاقی سے بہت تھوڑے وقت میں ہماری جیبیں خالی کر کے ہمیں فارغ کر دیا۔

اس داؤ پیچ میں ہم نے غلطی یہ کی تھی کہ نوٹ بھنانے کے لیے لڑکے کو دے دیا تھا۔ اس طرح انہیں معلوم ہو گیا کہ ہم کتنی رقم خرچ کریں گے (نوٹ پانچ سو روپے کا تھا)۔ یوں بھی ہم مستقل گاہک نہ تھے جو بعد میں دوسری خدمات بھی حاصل کرتے۔ اس لیے جب ہم پانچ سو سے کچھ زیادہ رقم دے چکے تو انہوں نے ہم سے کہا کہ دوسرے کمرے میں کچھ اور مہمان آگئے ہیں اس لیے اب انہیں ہمیں رخصت کرنا پڑے گا۔ جب میں نے ان سے کہا کہ میں ان سے بات چیت کرنا چاہتی ہوں تو انہوں نے مجھے اپنے نام بتائے اور کہا کہ اگر میں دن کے وقت ان سے ملوں تو وہ میرے سوالوں کے جواب دے دیں گی لیکن یہ ان کے ''دفتری اوقات'' ہیں۔ حکومت انہیں رات کے گیارہ بجے سے ایک بجے تک کام کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ یہ عورتیں اس وقت کو ''آفس کا ٹائم'' اور کوٹھے کو ''آفس'' کہتی ہیں۔ وہ ایسے لوگوں پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھیں جو گاہک نہیں صرف سیاح ہوں۔

اس لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ان عورتوں کی زندگی کے بارے میں ضرور تحقیق کروں گی جو ایک طرف معاشرے کے لیے بالکل ناقابلِ قبول ہیں اور دوسری طرف اسی معاشرے کا ایک اٹوٹ انگ بھی ہیں۔ میرے لیے یہ ایک متضاد کیفیت تھی، حیرت انگیز اور دلچسپ!!

میں نے تحقیق کی ایک تجویز تیار کی جس کے تحت شاہی محلے کے باسیوں اور علاقے کی بود و باش کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔ شاہی محلہ... جو ہمارے معاشرے کے لیے کسی دیومالائی داستان کی طرح پُراسرار ہے۔ جو معاشرے کے ہاتھوں عورتوں کے ''اشیاء'' میں بدلنے کی ایک بھرپور مثال ہے۔ جس میں عورتیں صرف مردوں کی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ بنا دی گئی ہیں۔ میں بہرحال اس کا معروضی مطالعہ کرنے کی خواہاں تھی اور قبل از وقت کسی تعصب یا اخلاقیات کو اپنی تحقیق کی راہ میں حائل نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس علاقے میں خاص دلچسپی کی میرے لیے دو وجوہات تھیں۔ایک تو یہ کہ میں اس علاقے کے تہذیبی پہلو کا مطالعہ کرنا چاہتی تھی تا کہ موسیقی کی روایت اور فنون لطیفہ سے اس علاقے کے رشتے کو سمجھ سکوں اور دوسرے یہ کہ عورت کے مقام کو گہرائی میں سمجھنے کے لیے اُس کے اِس پیشے کو اور اس سے منسلک کلنک کو سمجھ سکوں۔اس نقطۂ نظر کے ساتھ میں نے یہ تجویز اپنے ادارے کو پیش کر دی۔

لیکن پہلا قدم اٹھانے سے قبل، مجھے نوکر شاہی کی دیو قامت دیوار سے ٹکرانا پڑا۔اس کے تو وجود کا بھی مجھے علم نہ تھا۔

باب ۳
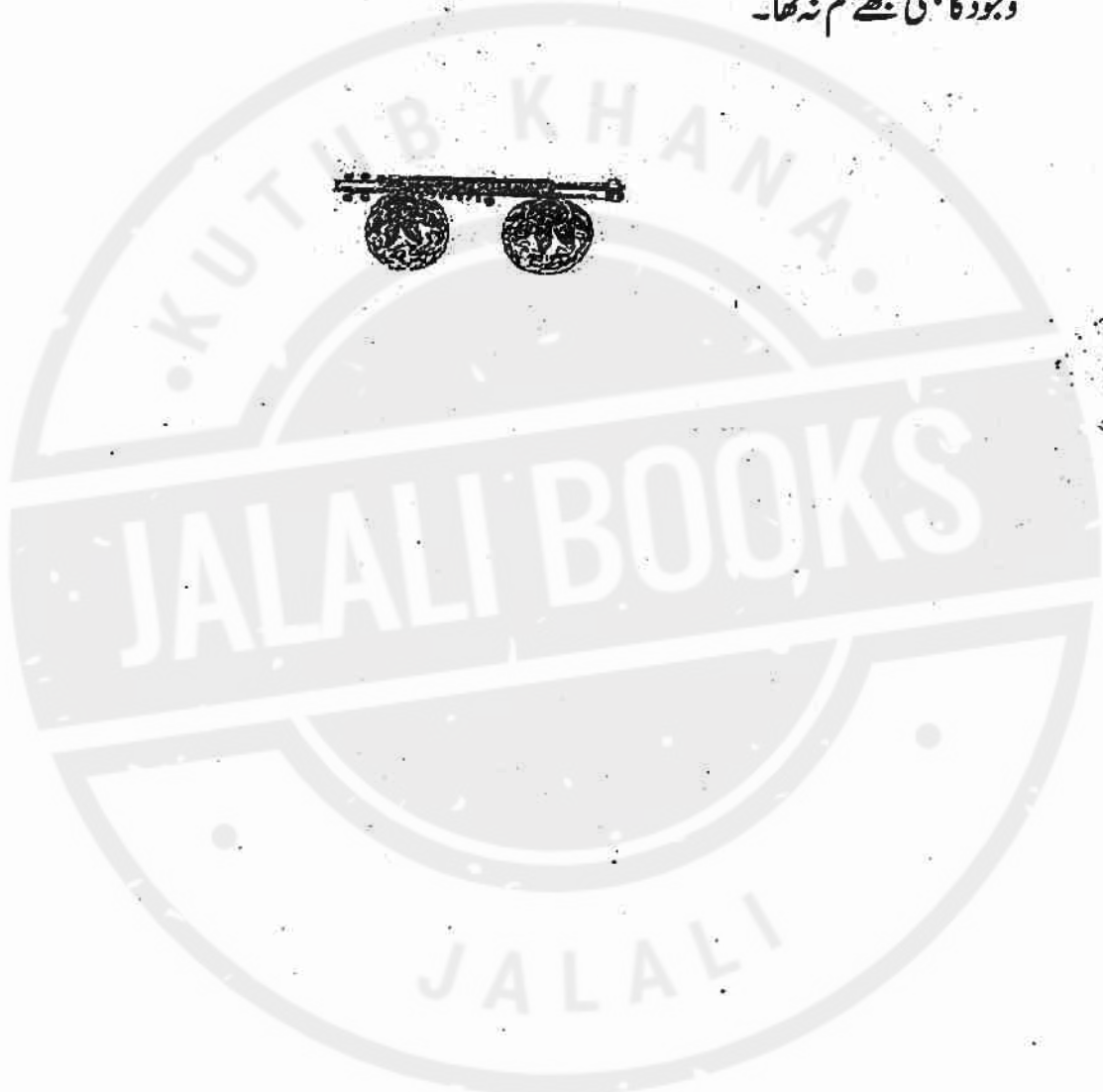
پی ایچ ڈی لڑکی اُس بازار میں

اس تحقیق میں مجھے جس مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور میرے راستے میں جو رکاوٹیں کھڑی کی گئیں ان میں ایک ایسا دن بھی شامل ہے جو ناقابلِ فراموش ہے۔ وزارتِ ثقافت کے سیکریٹری مجھے حکومتِ پاکستان کی ملازمت سے برخاست کرنے والے تھے اور انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا کہ میں اپنی صفائی میں کچھ کہوں۔ افسرانِ بالا تک یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ میں لاہور کے بدنامِ زمانہ شاہی محلے میں تحقیق کر رہی ہوں اور اب وہ غصے سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ مجھے یقین نہیں آ سکتا تھا کہ تحقیق جیسی بے ضرر چیز کا موضوع افسر شاہی کو ہلا کر رکھ دے گا لیکن صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک سرکاری ملازم خاتون کا اس ممنوعہ محلے میں گزر بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے جبکہ اس کا ارادہ تو اس پر تحقیق کر کے کچھ لکھنے کا بھی تھا۔ اُنہیں یقیناً اس بات کے سیاسی ردِّعمل کا خدشہ تھا۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میری تحقیق افسرانِ بالا کے لیے خطرہ پیدا کر سکتی ہے۔

لوک ورثہ کی دی ہوئی گاڑی سے باہر نکل کر میں نے ان بلند و بالا عمارتوں پر نظر ڈالی جو اب میرے سامنے تھیں۔ یہ اسلام آباد کا ''سیکریٹریٹ'' تھا۔ شہر کے پرسکون علاقے میں حکومتِ پاکستان کے اعلیٰ ترین افسران کا محفوظ ٹھکانا، جہاں تک عام پاکستانی کی کبھی نظر بھی نہیں پہنچتی۔ میں ایک سال سے کچھ زیادہ عرصے سے وزارتِ ثقافت سے وابستہ ادارے لوک ورثہ میں کام کر رہی تھی۔ میں اسلام آباد میں ہی رہتی تھی مگر اس علاقے میں آنے کا میرا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ فائلوں کا بڑا سا

پلندہ اٹھائے، اور اپنی دستاویزات سے بھرا تھیلا کاندھے پر لٹکائے میں ایک عمارت میں داخل ہوئی۔ میں نے ایک گارڈ سے پوچھا کہ میں صحیح جگہ ہی آئی ہوں یا نہیں؟ اس نے میرے پلندوں کو بڑے تجسس سے دیکھتے ہوئے اطلاع دی کہ جگہ تو صحیح ہے لیکن لفٹ کام نہیں کر رہی اس لیے مجھے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا ہوگا۔ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی گھنی مونچھوں تلے زیرِ لب مسکرایا۔ میں اپنے بوجھ تلے لدی پھندی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ مجھے کچھ جھنجھلاہٹ تو ضرور محسوس ہو رہی تھی لیکن پھر بھی یہ یقین تھا کہ میں سیکریٹری کو ساری بات سمجھا دوں گی۔

میں لوک ورثہ میں تحقیقی کام کے لیے ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھی۔ پاکستانی کلچر سے تعلق رکھنے والی چیزیں جیسے موسیقی کے ساز، لوک موسیقی، لوک کہانیاں وغیرہ ان سب پر دستاویزات مرتب کر کے محفوظ کرنے کا کام اس ادارے کو سونپا گیا ہے۔ میں نے اپنے سیکشن کی سالانہ سرگرمیوں کے منصوبے میں چند مہینے پہلے دو تحقیقی تجاویز رکھی تھیں۔ پاکستان میں موسیقی، اداکاری اور رقص جیسے فنونِ لطیفہ کی ایک قدیم روایت موجود ہے۔ میں ان فنون کے فروغ میں عورتوں کے کردار پر تحقیق کرنا چاہتی تھی کیونکہ یہ میرا دلپسند موضوع تھا۔

پہلی تجویز کا تعلق ان نیم خانہ بدوش ٹولوں سے تھا جو گاؤں گاؤں جا کر لوگوں کو تماشا دکھاتے ہیں۔ یہ لوک تھیٹر میں عورتوں کے کردار پر ایک تحقیق کا منصوبہ تھا۔ لوک ورثہ جن موسیقاروں اور گائیکوں کی ریکارڈنگ کرنے اور فلمیں بنانے کے لیے کوشاں رہتا تھا، میں ان کے پس منظر کے بارے میں بھی تحقیق کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے دوسری تجویز لاہور کے شاہی محلے کے بارے میں تھی جہاں سے ان موسیقاروں اور گلوکاروں کا تعلق تھا۔

جنوبی ایشیا میں زمانہ حال تک بازارِ حسن کا تصور دوسرے ممالک سے مختلف رہا ہے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ موسیقی، گلوکاری اور رقص کے فن طوائفوں کے پیشے سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ یہ ہمارے کلچر کی ایک مضبوط روایت رہی ہے۔ گزشتہ صدیوں میں طوائفیں صرف جنسی خدمات کے لیے نہیں بلکہ فنون میں مہارت کی وجہ سے شہرت پاتی تھیں۔ اس لیے کئی نامور فنکار خواتین ان ہی علاقوں سے آئیں۔

ان دونوں تجویزوں پر میرے ساتھ کام کرنے والوں اور لوک ورثہ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر نے اچھی طرح غور و خوض کیا۔ ڈائریکٹر صاحب کو یہ بھی یاد آیا کہ چند مہینے پہلے وہ ہی مجھے شاہی محلے میں لے گئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے تحقیق کے طریقہ کار کے بارے میں چند سوالات کیے۔ تحقیق کا نمونہ دیکھا اور یہ معلوم کیا کہ اس میں کتنا عرصہ لگے گا۔ اس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ تحقیق

لوک ورثے کے علمی سرمائے میں قابلِ قدر اضافہ کرے گی۔ انہوں نے میری ہمت افزائی کی اور کہا کہ میں یہ تحقیقی تجاویز باقاعدہ پیش کروں۔

تجاویز پیش کرنے کے چند ہفتے بعد ہی میرے سپروائزر نے مجھے اطلاع دی کہ وزارتِ ثقافت نے ہمارے ادارے کی تمام تجاویز منظور کر لی ہیں لیکن میری شاہی محلے کی تجویز کو مسترد کر دیا گیا ہے۔ مجھے پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ وزارت ثقافت لوک ورثہ کے پروگراموں میں دخل اندازی نہیں کرتی اور ادارے کے ڈائریکٹر پروگرام بنانے اور اس پر عمل درآمد کرنے کے کُل اختیارات رکھتے ہیں۔ میرے اس سوال کا باضابطہ رسمی جواب دینے پر بھی کوئی آمادہ نہ تھا کہ میری تجویز کو کس بنیاد پر مسترد کیا گیا ہے۔ چائے کے وقفے میں البتہ اس کی نامنظوری پر چند مزاحیہ فقرے میرے کانوں میں پڑے۔

میرے دفتر کے کئی ساتھی جو سب مرد تھے، چائے اور کھانے کے وقفوں میں اونچے اونچے درختوں اور ہریالی کے جھنڈ میں گھرے ایک کھوکھے پر چلے جاتے تھے۔ یہاں گزرنے والا وقت اکثر تخلیقی لحاظ سے بہت بارآور ہوتا تھا۔ ہلکے پھلکے ماحول اور قہقہوں کی گونج میں نئے پروجیکٹ جنم لیتے اور ان پر بحث مباحثہ ہوتا۔ دستاویزات کی صورت میں محفوظ کرنے کے لیے ویڈیو تیار کرنے کے منصوبے بنائے جاتے تھے۔ یہاں ساتھ کام کرنے کے لیے موزوں ساتھی بھی منتخب ہو جاتے۔ اس طرح کے بے تکلفانہ ماحول میں مجھے اپنی تجویز کے مسترد ہونے کی خبر ملی کیونکہ یہ معاملہ نازک تھا۔ افسر شاہی بوکھلا گئی تھی۔ میں نے معصومیت سے پوچھا "کیوں؟"—اس محلے سے جب کوئی فنکارہ یہاں آتی ہے تو اس کی تعریف میں تو زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔"

ان دنوں لوک ورثہ ایک ویڈیو سیریز "عصرِ حاضر کے نامور موسیقار" کے نام سے تیار کر رہا تھا۔ اس پر کام کرنے والی ٹیم کا حصہ بن کر میں بے حد خوش تھی۔ اس میں فنکاروں کے تفصیلی انٹرویو کیے جا رہے تھے جن سے ان کے فن، تربیت، انداز، خاندانی پس منظر اور دوسری کئی باتوں کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم ہو رہی تھیں۔ ان کے ذریعے مجھے معلوم ہوا تھا کہ زیادہ تر موسیقاروں کا کسی نہ کسی طرح شاہی محلے سے بھی رشتہ ہے۔ میں اس علاقے میں تحقیق کر کے اور وہاں رہنے والوں سے ان کے ربط و ضبط کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اس مطالعے کو مکمل بنانا چاہتی تھی۔

لوک ورثہ میں یہ روایت ہے کہ ہر موسیقار یا گلوکار کی ریکارڈنگ کے بعد اس کے اعزاز میں ایک پرتکلف تقریب منائی جاتی ہے۔ اس موقع پر فنکار اکثر کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ انہیں ہار پہنائے اور پھول پیش کیے جاتے ہیں اور پاکستانی موسیقی کے لیے ان کی خدمات کی تعریف کی جاتی ہے۔ لوک ورثہ میں ملازمت حاصل کرنے سے پہلے ہی سے میں اس طرح کی تقریبات میں آتی

رہی تھی۔ یہ فنکار زیادہ تر جس شاہی محلے سے آئے تھے اب اُس کا نام سن کر افسر شاہی گھبرا رہی تھی۔ میں نے اپنے دوستوں اور ساتھ کام کرنے والوں سے اس ریاکارانہ رویے پر بحث کی۔ جس جگہ فنکار جنم لیتے ہیں اس کے وجود کو ہی تسلیم کرنے سے انکار کیوں؟ یہ تو سچ تھا کہ عام لوگ اس جگہ کو موسیقی سے زیادہ پیشہ کرنے والی عورتوں کی آماجگاہ کے طور پر پہچانتے تھے مگر میرا اصرار تھا کہ لوک ورثہ جیسا ثقافتی ادارہ یہ حقیقت سامنے کیوں نہیں لانا چاہتا کہ یہی جگہ موسیقی اور فن کا منبع بھی ہے۔ آخر لوک ورثہ پاکستان کا فنکارانہ ورثہ محفوظ کرنے اور ہماری اپنی صدیوں پرانی موسیقی کے فروغ کے لیے کام کر رہا ہے۔ کیا انہیں یہ خوف تھا کہ میں اس محلے سے "ریاست" کا رشتہ بے نقاب کر دوں گی۔ میں نے اس منافقت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور تہیہ کر لیا کہ یہ تحقیق میں اپنے طور پر کروں گی۔ اگر لوک ورثہ اسے منظور کر کے اس کے لیے رقم فراہم نہیں کرتا تو یوں ہی سہی۔

وزارت ثقافت نے لوک تھیٹر پر تحقیق کرنے کی تجویز منظور کر لی تھی اس لیے میں نے لاہور میں اس پر کام کرنا شروع کر دیا۔ میں نے لوک ورثہ کے ڈائریکٹر کو بتا دیا کہ اس دوران میں اپنی دوسری مجوزہ تحقیق کے لیے بھی مواد جمع کرتی رہوں گی اور معلوماتی ذرائع کی نشاندہی کر کے محفوظ کر لوں گی۔ یہ تحقیق میں مستقبل میں قطعی ذاتی طور پر کروں گی۔

لیکن جب میں نے لاہور میں لوک تھیٹر پر تحقیق کا آغاز کیا تو مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ تھیٹر میں کام کرنے والی کئی عورتوں کا تعلق بھی شاہی محلے سے ہے۔ اس لیے اُن میں سے چند ایک سے ملنے کے لیے میں وہاں گئی۔ ایک دن لاہور سے اسلام آباد لوٹنے پر میں نے دیکھا کہ ایک مقبول انگریزی اخبار "پاکستان آبزرور" کے رپورٹر دفتر میں بیٹھے ہیں۔ انہوں نے شاہی محلے میں میری مجوزہ تحقیق کی خبر سن لی تھی اور اب وہ اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں مجھ سے سوالات کیے تو میں نے انہیں بخوشی جوابات دیے۔ مجھے بالکل علم نہ تھا کہ رواج کے مطابق سرکاری ملازمین کو صحافیوں سے ہرگز کھل کر بات نہیں کرنی چاہیے۔ انہیں ایسی باتیں کہنی چاہئیں جن کا کوئی سر پیر ہی نہ ہو اور جن کی وجہ سے انہیں بعد میں نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ میں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ دراصل مجھے صحافیوں سے براہ راست گفتگو ہی نہیں کرنی تھی بلکہ اپنے کسی افسر سے رابطہ کرانا چاہیے تھا۔ بہرحال، صحافیوں کا اشتیاق دیکھ کر میں نے انہیں فوراً بتا دیا کہ یہ لوک ورثہ کا پروجیکٹ نہیں ہے۔ یہ میری ذاتی تحقیق ہوگی۔ وہ اس بات پر فوراً راضی ہو گئے اور انہوں نے ایک پیشہ ور محقق کی حیثیت سے میرا انٹرویو لے لیا۔

دوسرے دن گھر میں میرے والد ایک اخبار پر غور سے نظریں جمائے ہوئے میرے پاس

Interlude

Dr Fouzia - Making waves at Lok Virsa

Ph.D. girl in red light area

(اسلام آباد سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامے پاکستان آبزرور سے کچھ تراشے (۱۳ فروری ۱۹۸۹)

شاہی محلے کے مرکزی بازار کا ایک منظر

ایک عام عمارت جو سات سے زیادہ خاندانوں کی رہائش کے کام آتی ہے جبکہ نیچے سڑک کی سطح پر دکانیں ہیں۔

سر راہ ہوٹل میں کھلے آسمان تلے کھانا پکنے کا ایک منظر

ایک پھل فروش
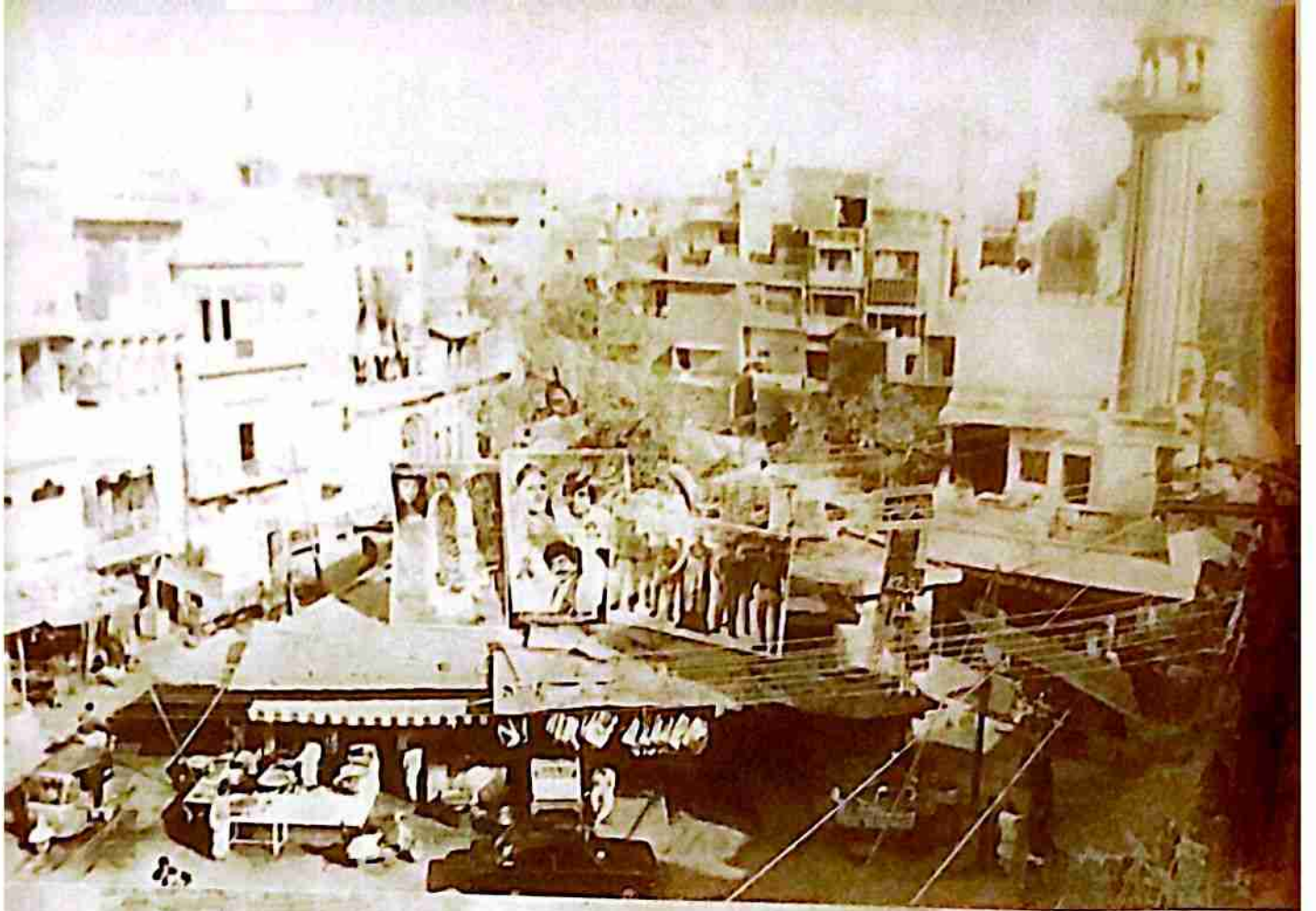
شاہی محلے کے گلی کوچے
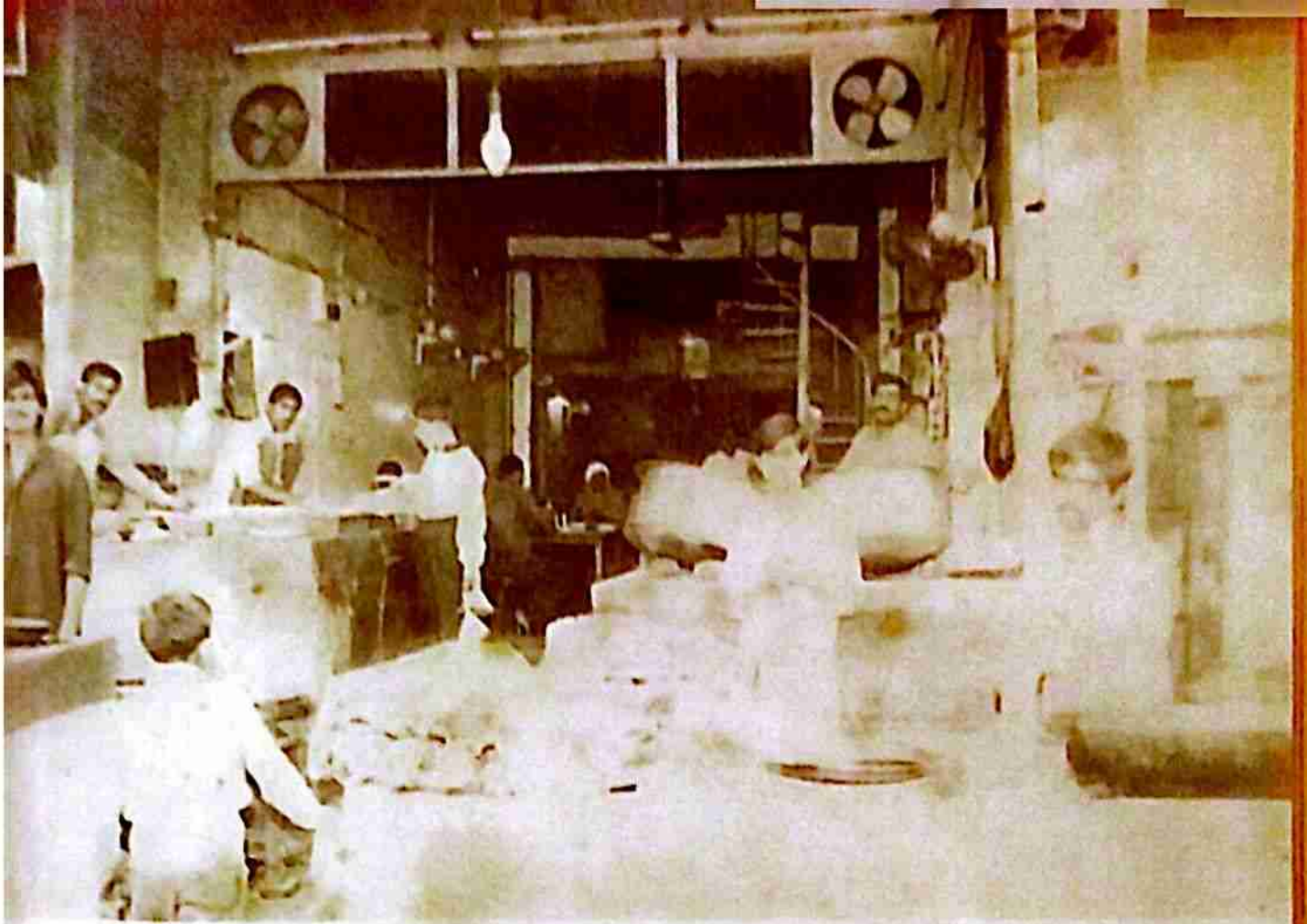
بکرے کے گوشت کے قورمے کے لیے مخصوص دکان

اپنے گھر اور اپنی پارکنگ

آئے۔ ان کے چہرے پر شدید تعجب کے تاثرات تھے۔

''کیا یہ تم ہو؟... میری بیٹی...؟'' انہوں نے کہا۔

میں نے اخبار پر نظر ڈالی تو صفحہ اول پر اپنی بڑی سی تصویر دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ نیچے لکھا تھا۔ ''پی ایچ ڈی لڑکی... ہیرامنڈی میں''۔ اس قسم کا رویہ دیکھ کر مجھے سخت دھچکا لگا۔ میرے والد اس تصویر کو بار بار دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیلی جارہی تھیں۔ میں شرمندگی سے ہنسی اور کہا: ''لگتا تو ایسا ہی ہے۔''

انہوں نے اخبار کھولا تو اندرونی صفحات پر مختلف پوز میں میری کئی دوسری تصویریں جھانک رہی تھیں۔ میری کہی ہوئی باتوں کی سرخیاں لگائی گئی تھیں۔ مضمون اخبار کے پورے صفحے پر پھیلا ہوا تھا۔ اسے نہ پڑھنا کسی قاری کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میری امی یہ سب کچھ دیکھ کر بے ہوش ہوجائیں یہ اطلاع میں ان کو خود دینے کے ارادے سے اندر دوڑی۔ میں نے اپنے والدین کو جب یہ بتایا کہ صحافی میرے دفتر میں آئے تھے تو وہ کچھ مطمئن ہوگئے۔ وہ روشن خیال تھے اور مجھ سے کچھ غیر روایتی حرکتیں کرنے کی توقع رکھتے تھے۔

اس روز شام کو میں نے اپنے والدین سے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی اور انہیں لوک ورثہ کی منافقت کے بارے میں بتایا۔ اس بات پر تو وہ بالکل متفق ہوگئے کہ لوگ واقعی شاہی محلے کے بارے میں صرف افواہوں اور داستان طرازی کی حد تک جانتے ہیں لہٰذا یہاں سنجیدہ تحقیق کرنی ضروری ہے لیکن ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر میں یہ تحقیق کروں گی کیسے؟ یہ افواہیں خود ان کے شعور میں جاگزیں تھیں کہ اس محلے میں قدم رکھنے والی عورت کو اغوا کرکے زبردستی طوائف بنا دیا جاتا ہے۔ وہ اس علاقے سے وابستہ مجرمانہ کارروائیاں کرنے والے گروہوں کے بارے میں بھی متفکر تھے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ میری تحقیق کے خلاف سب سے شدید ردعمل معاشرے کے ان بدنام افراد کی طرف سے نہیں بلکہ نہایت ''شریف'' اور ''معزز'' طبقے یعنی ہماری افسر شاہی کی جانب سے ہونے والا تھا۔

لوک تھیٹر پر تحقیقی کام جاری رکھنے کے لیے دوبارہ لاہور جانے سے پہلے میرے علم میں آیا کہ اخبار کے اس مضمون نے افسرانِ بالا کے ایوانوں میں ہنگامہ برپا کردیا ہے۔ میرے رنج کی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ لوک ورثہ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر صاحب نے تمام الزام میرے سر دھر دیا ہے۔ اس وقت ادارے کے دفتر میں دوسرے کئی سیاسی داؤپیچ گردش کررہے تھے۔ میں کچھ عرصہ قبل ہی امریکہ میں آٹھ برس رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپس آئی تھی۔ مجھے اپنے اقدام کے سیاسی شاخسانوں کا ذرا بھی اندازہ نہ تھا۔ یہ میری پہلی باقاعدہ ملازمت تھی اور پاکستان کی افسر شاہی

سے میں پہلی بار دوچار ہو رہی تھی۔ میں تو اس خیال میں تھی کہ شاہی محلے پر تحقیق میں ذاتی حیثیت سے کر رہی ہوں اور اس سلسلے میں مجھے کسی نے منع بھی نہیں کیا ہے۔

مجھے اصل صورت حال کا ادراک نہیں تھا۔ صرف یہ دھن سر میں سمائی ہوئی تھی کہ میری تحقیق اپنی نوعیت کا اولین مطالعہ ہوگی۔ ان خیالوں کے ساتھ میں لوک تھیٹر پر کام جاری رکھنے کے لیے لاہور چلی آئی۔ اس بار دو ہفتوں کے اس دورے میں مجھے تھیٹر کے کئی فنکاروں سے ملنا تھا اور پنجاب کے بعض دور دراز کے گاؤں میں بھی جانا تھا جہاں امتدادِ زمانہ کے ہاتھ سے بچے کھچے چند گروپ اپنا فن پیش کرنے کے لیے اب بھی جاتے تھے۔

دیہات میں عام طور پر یہ کھیل رات کے نو بجے سے شروع کیے جاتے ہیں جو صبح تک جاری رہتے ہیں۔ انہیں میلوں اور منڈیوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ انہیں دیکھنے جوق در جوق آتے ہیں۔ اس دورے میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ خواتین فنکاروں کی کمی کے باعث شاہی محلے کی عورتوں سے اداکاری کروائی جانے لگی ہے۔ کیونکہ اب ان پروگراموں کی کشش لوگوں کے لیے کم ہوتی نظر آ رہی تھی اس لیے اُن کے منتظمین کھیل کے وقفوں کے دوران رقص پیش کرنے کے لیے بازارِ حسن کی عورتوں کو بلانے لگے ہیں۔

اسلام آباد واپسی پر یہ خبر میری منتظر تھی کہ شاہی محلہ میں تحقیق کے باعث انتظامیہ نے مجھ پر سرکاری زبان میں ''سخت بداطواری'' کی فرد جرم عائد کر دی ہے۔ میرے خلاف ایک جھوٹا کوائف نامہ تیار کر لیا گیا ہے تا کہ مجھے ملازمت سے اس جرم پر علیحدہ کیا جا سکے کہ میں نے ادارے کی رقم ایک ایسے پروجیکٹ پر خرچ کی ہے جسے ادارے نے منظور ہی نہیں کیا تھا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کیونکہ لاہور کے دونوں دوروں کی منظوری کے کاغذات میری فائل میں موجود تھے۔ شاید وزارت ثقافت کے متعدد افراد نے اخبار والا مضمون پڑھ کر سیکریٹری کلچر کو اس فاش غلطی کے لیے موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔ بعد میں اپنی تحقیق کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ کئی اعلیٰ سرکاری افسران اور سیاست دانوں کا اس محلے کے کاروبار سے مضبوط واسطہ تھا لیکن اس وقت مجھے اس کی سن گن بھی نہ تھی۔ سیکریٹری کلچر خواجہ شاہد حسین نے عکسی مفتی (ایگزیکٹو ڈائریکٹر، لوک ورثہ) کی خبر لی اور انہوں نے افسر شاہی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے لیے فوراً میرا سر پیش کر دیا تھا۔ مجھے وہاں کام کرتے ہوئے صرف ڈیڑھ برس ہی گزرا تھا اور وہاں میرے نہ ہونے سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔

کسی سرکاری ملازم کو برطرف کرنا بہرحال آسان کام نہیں ہوتا، اس کے لیے ''مناسب طریقہ کار'' اختیار کرنا پڑتا ہے۔ مجھ سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے میری فائل میں دو جعلی خطوط بھی

شامل کر دیے گئے تھے۔ سرکاری طریقہ کار کے مطابق ملازمت کی توثیق سے پہلے چھ مہینے تک آزمائشی طور پر کام کرنا ہوتا ہے۔ ان جعلی کاغذات کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ میرا ''پروبیشن'' کا زمانہ دو مرتبہ بڑھایا گیا ہے اور چھ ماہ کی جگہ اٹھارہ ماہ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ڈائریکٹر یہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ میری ملازمت ابھی کچی تھی لہٰذا مجھے برطرف کرنے کے لیے انکوائری کی ضرورت نہیں تھی۔

اس چالبازی نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دل میں کہا ''تم کس خواب و خیال میں تھیں؟ اصلی دنیا تو ایسی ہوتی ہے۔'' لیکن ذہن کے کسی گوشے میں میری خوش فہمیاں برقرار تھیں۔ یہ امید قائم تھی کہ کم از کم حکومت کے کسی محکمے میں ایسی گھٹیا چالبازیوں سے کام نہیں لیا جاتا ہوگا۔ میں نے یہ گمان کیا کہ اگر میں افسرانِ بالا کو صحیح معلومات فراہم کر دوں تو ساری غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ انہیں علم ہو جائے گا کہ میں منظور شدہ تجویز پر کام کرنے کی آڑ میں کوئی دوسری تحقیق نہیں کر رہی تھی بلکہ میں نے لوک تھیٹر پر کام کیا ہے۔ مجھے اس وقت بھی یقین نہیں آ سکتا تھا کہ معاملہ غلط فہمی کا نہیں، صرف جھوٹ اور جعلسازی کو کامیاب بنانے کا ہے۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ ''شاہی محلے'' کے نام نے ہی ایک افراتفری پیدا کر دی تھی اور اوپر سے نیچے تک سب کو اپنی ملازمتوں کے لالے پڑ گئے تھے۔

لوک ورثہ کے ڈائریکٹر ان جعلی کاغذات کی مدد سے مجھے یہ آسانی پروانہ برطرفی تھما سکتے تھے مگر وہ سرکاری معاملات میں گھاک تھے اور اپنے آپ کو پوری طرح بچاتے ہوئے کارروائی کر رہے تھے۔ انہوں نے سیکریٹری کلچر سے میری ملاقات کا انتظام کیا۔ مقصد صرف رسمی ''کارروائی ڈالنا'' تھا کیونکہ فیصلہ پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ الزام وہی تھا کہ میں نے ادارے کی رقم ایسے پروجیکٹ پر خرچ کی جسے مسترد کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ پانچ ہزار روپے کی رقم جو تھیٹر کی تحقیقات کے لیے لاہور آنے جانے کے اخراجات پر خرچ ہوئی تھی، مجھے بتائے بغیر میری تنخواہ سے کاٹ بھی لی گئی تھی۔

اب میں سیکریٹری کلچر سے ملنے جا رہی تھی اور یہ تمام باتیں میرے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ ان کے سامنے ہر بات کی وضاحت کر دوں گی۔ ثبوت کے لیے میں اپنے ساتھ پنجاب لوک تھیٹر سے وابستہ افراد کے انٹرویو، تصویریں، کیسٹ، اپنے نوٹس، اولین تجزیے کا مسودہ، الغرض سب کچھ لائی تھی۔

تین منزل تک سیڑھیاں چڑھنے کے بعد بالآخر سیکریٹری صاحب کا کمرہ نظر آیا۔ دروازہ کھلنے پر میں نے اپنے آپ کو سیکریٹری کے کمرے سے ملحقہ ایک چھوٹے سے کمرے میں پایا جہاں کلرک اور سیکریٹری کے ذاتی اسسٹنٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں مجھ سے بیٹھ کر انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ یہ انتظار اتنا طویل تھا کہ ملاقات کی امید ہی ختم ہونے لگی۔ کمرے کی دیواروں پر صرف ایک کیلنڈر

اور ایک گھڑیال تھا، کچھ سرکاری یادداشتیں نوٹس بورڈ پر لگی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھتے دیکھتے میرا جی متلانے لگا۔ ملاقات کے لیے اتنا طویل انتظار کروانا بھی افسر شاہی کا ایک طریقہ ہے تاکہ ملنے والوں کو ان کی اوقات یاد دلائی جائے۔

ایک گھنٹے کے بعد بالآخر مجھے اندر بلایا گیا۔ دفتر کا یہ کمرہ خوب کشادہ تھا جس سے افسر کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ وسیع و عریض کمرے کے آخری سرے پر ایک بہت بڑی میز کے پیچھے، ایک پرتکلف کرسی پر سیکریٹری صاحب جلوہ افروز تھے۔ اتنی بڑی میز رکھنے کا مقصد بھی یہ ہوگا کہ ملاقاتیوں سے فاصلہ قائم رکھا جائے۔ میں کمرے میں دوسرے دو اشخاص کی موجودگی پر حیران ہوئی۔ اُن کے پاس بھی فائلیں تھیں اور سیکریٹری ان میں سے ایک کے ساتھ کسی رقم کی منظوری پر گفتگو کرنے میں منہمک تھے جبکہ مجھ پر طائرانہ نظر ڈال کر سیکریٹری صاحب نے تُرشی سے کہا: ”بیٹھ جاؤ بی بی“۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ اگر کمرے میں دوسرے لوگ موجود ہیں تو میں پروا نہ کروں گی اور بلا جھجک ساری حقیقت بیان کر دوں گی۔ میں نے اپنے تمام ثبوت، تصاویر، کیسٹ، ویڈیو ٹیپ وغیرہ میز پر رکھ دیے۔ آخر انہوں نے میری طرف رُخ کیا۔ ”کیا بات ہے؟“

میں نے فوراً کہا کہ میں پیشے کے لحاظ سے سرکاری / غیر سرکاری محقق ہوں اور میرا ٹھوس کام انہیں میرے موقف کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر بتا سکے گا۔ میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ میں لاہور لوک تھیٹر پر تحقیق کرنے کے لیے گئی تھی اور اس سلسلے میں تمام دستخط شدہ اجازت نامے میری فائل میں موجود ہیں۔ سیکریٹری کو اس تحقیق کے بارے میں کسی نے نہیں بتایا تھا جس کی وجہ سے وہ کچھ الجھن میں پڑ گئے۔ لیکن چونکہ اس ملاقات کا مقصد محض خانہ پُری تھا اس لیے وہ میری بات سننا ہی نہیں چاہتے تھے۔

انہیں میرے لائے ہوئے شواہد پر تعجب تو ضرور ہوا مگر انہوں نے اس معاملے میں کسی قسم کی دلچسپی قطعی ظاہر نہیں کی۔ وہ خشک، تحکمانہ لہجے میں میری بات کاٹتے رہے اور پھر اچانک مجھ سے رخصت ہو جانے کے لیے کہا۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا میں تصویریں، ویڈیو ٹیپ وغیرہ ان کے معائنے کے لیے چھوڑ جاؤں تو انہوں نے فوراً کہا: ”نہیں نہیں، ان کو اپنے ساتھ لے جایئے۔“

واپس سیڑھیاں اترتے وقت مجھے علم ہو چکا تھا کہ ان کو اس بات کی قطعی پروا نہیں تھی کہ حقیقت کیا تھی۔ میں پروبیشن پر تھی یا نہیں، حکومت نے لوک تھیٹر پر تحقیق کی تجویز منظور کی تھی یا نہیں کی تھی، میرے سپروائزر میرے کام سے واقف تھے یا نہیں تھے، ان سب باتوں سے ذرہ برابر فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ میں جو بھی کہتی، ان کے لیے قطعی بے کار تھا۔ سیکریٹری اور لوک ورثہ کے ایگزیکٹو

ڈائریکٹر مجھے برطرف کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ شاہی محلے کے ذکر سے ہی ہر جگہ اسی طرح کا خوف پیدا ہوتا تھا۔ افسر شاہی اس موضوع کے آس پاس بھی پھٹکنا نہیں چاہتی تھی جو ان کے سیاسی آقاؤں کو ناخوش کر دے۔

سیکریٹری کلچر سے ملاقات کے کچھ عرصے بعد ہی مجھے علم ہوا کہ میری برطرفی کے کاغذات تیار کیے جا چکے ہیں۔ اس وقت میں نے وہ کام کیا جس کے بارے میں کبھی سوچا تھا کہ یہ راہ میں کبھی اختیار نہ کروں گی۔ میں نے اپنی ہر جنگ جیت یا ہار سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے ہی بل بوتے پر لڑی تھی۔ لیکن میری برطرفی کے لیے جس جعلسازی سے کام لیا گیا تھا اس کے باعث میں نے بلا جھجک چند ''معتبرین'' سے رابطہ کیا۔ افسر شاہی میں کسی سے کچھ کہنا تو بالکل بے سود ہوتا، میں نے سرکاری ملازمت سے باہر ثقافتی لحاظ سے سربرآوردہ شخصیتوں سے بات چیت کی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں لوک ورثہ میں کام جاری رکھنا چاہتی ہوں مگر میں ''شاہی محلے'' پر تحقیق بھی کروں گی جو میں صرف اور صرف ذاتی حیثیت سے کروں گی۔ وہ میری بات سمجھ گئے اور میری مدد کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ انہیں سیکریٹری ثقافت سے فون کر کے صرف اتنا کہنا پڑا کہ اگر میری نوکری چلی گئی تو وہ ان سے، ان کے خاندانوں سے اور ان کے جاننے والوں سے پھر کسی مدد کی توقع نہ رکھیں۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے گویا سارے معاملے کو الٹ کر رکھ دیا۔ میرے خلاف تمام شور و غل اور سازشیں یک لخت موقوف ہو گئیں۔ بس سمجھئے کہ بالکل خاموشی چھا گئی۔ میں دفتر جاتی رہی اور اپنے فیلڈ ورک کے لیے سرکاری منظوری بھی حاصل کرتی رہی۔ اس کے اگلے برس میرا مقالہ ''لوک تھیٹر میں خواتین کا کردار'' کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ سودا لوک ورثہ کو بہت سستا پڑا کیونکہ اس ادارے نے تحقیقی اخراجات پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ میری تنخواہ سے کاٹے ہوئے پانچ ہزار روپے تک نہیں لوٹائے تھے۔

میں شاہی محلے کے کوائف جمع کرتی رہی۔ دفتر میں کام کرنے والے میرے دوسرے ساتھی میری ہر طرح مدد کرتے تھے۔ لیکن عکسی مفتی مجھ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ وہ ادارے کی اندرونی سیاست میں پھانس کر مجھے مستقل ہراساں کرتا رہا۔ آخر دو برس بعد وہ دوبارہ مجھے ایک جعلی معاملے میں ملوث کرنے میں کامیاب ہو گیا اور مجھے دو برس کی جبری رخصت پر بھیج دیا گیا۔ اس وقت تک لوک ورثہ کے لیے میری خوش گمانیاں ختم ہو چکی تھیں اور میں نے بھی ان احکامات کو بدلوانے کی کوشش نہیں کی۔ دو برس بعد یہ معاملہ دوبارہ نظرثانی کے لیے پیش ہوا اور میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔ یہ سارا معاملہ بالآخر بے بنیاد قرار دیا گیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں دوبارہ دفتر جانا شروع

کردوں۔ یہ خبر سنتے ہی میں نے باضابطہ استعفیٰ پیش کر دیا۔

جبری رخصت کے وہ دو برس میری زندگی کے سب سے زیادہ بارآور سال تھے۔ میں نے دوسری خواتین کے ساتھ مل کر "بیداری" کے نام سے ایک تنظیم بنائی جو عورتوں پر تشدد جیسے مسائل پر کام کرتی ہے۔ ہم نے پاکستان مین ایسا پہلا مرکز قائم کیا جہاں خواتین کے انفرادی مصائب اور ان پر ٹوٹنے والی آفتوں کا سامنا کیا جا سکتا تھا۔ اس دوران میں نے پاکستان میں سرگرم عمل بین الاقوامی ترقیاتی تنظیموں کے لیے خواتین کے مسائل پر مشاورت کو اپنا ذریعۂ روزگار بنایا اور ہاں ہاں!... میں شاہی محلے بھی جاتی رہی اور میں نے وہاں اپنی تحقیق جاری رکھی۔

باب ۴

شاہی محلّے میں پہلی بار

شاہی محلّے پر تحقیق کی تجویز پر اٹھنے والا ہنگامہ جب گویا کسی جادو منتر سے غائب ہوگیا تو میں نے باقاعدہ تحقیقی کام شروع کرنے کی نیّت سے لاہور کا قصد کیا۔ دوسرے پرانے شہروں کی طرح لاہور کی بھی صورت بدل چکی ہے۔ پرانے شہر کے چاروں طرف وسیع و عریض نئی آبادیاں پھیل گئی ہیں۔ لیکن درمیان میں قدیم شہر کسی پھل کے بیج کی طرح قائم ہے۔ لاہور کی تاریخ ۱۰۰۰ عیسوی سے باقاعدہ لکھی ہوئی دستیاب ہے۔ جہاں آج شہر لاہور ہے وہاں ۱۵۰ عیسوی میں کسی شہر کے تاریخی حوالے ہمیں جا بجا ملتے ہیں۔ پرانا لاہور دریائے راوی کے کنارے آباد تھا مگر اب دریا نے اپنا راستہ تھوڑا سا بدل لیا ہے۔ شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۵۲) نے شہر کی مضبوط فصیل بھی تعمیر کی تھی جس کے ساتھ، اس زمانے کے رواج کے مطابق ایک خندق کھدی ہوئی تھی۔ اس فصیل میں تیرہ دروازے تھے جنھیں شہریوں کی حفاظت کے لیے مغرب کے وقت بند کر دیا جاتا تھا۔

انیسویں صدی میں انگریزوں نے ان شاندار دروازوں کو مسمار کر دیا تھا۔ فصیل کی دیوار توڑ ڈالی تھی اور خندقوں کو بھر دیا تھا۔ لیکن لاہور کے باسیوں کے حافظے میں شہر کا قدیمی نقشہ محفوظ ہے۔ یہ اجتماعی یاد ہر نسل دوسری نسل کو منتقل کرتی رہتی ہے۔ آج بھی لوگ پرانے شہر کے دروازوں کا ذکر عام بات چیت میں کرتے ہیں۔ فصیل کے اندرونی علاقے کو اب پُرانا لاہور کہا جاتا ہے۔ یہاں رہنے والے اپنا پتا آج بھی اسی طرح بتاتے ہیں۔ ''فلاں دروازے کے پاس والا بازار یا محلّہ''۔ اس سے

زیادہ تفصیل کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کیونکہ محلوں میں رہنے والے سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور پوچھنے پر ہر کسی کا پتا بتایا جاسکتا ہے۔

میں نے لاہور میں اپنے کچھ رشتہ داروں کے گھر ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا جو نئے شہر میں مال پر رہتے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی میں فوراً شاہی محلے جانا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہمیشہ مجھے کوئی اور وہاں لے گیا تھا۔ پہلے میں عکسی مفتی اور پھر تھیٹر کے آرٹسٹوں کے ساتھ اس محلے میں گئی تھی اس لیے یہاں کے راستے مجھے ٹھیک سے یاد نہیں تھے۔ وہ تنگ، بل کھاتی گلیاں مجھے بھول بھلیوں جیسی لگی تھیں۔ اس مرتبہ میں وہاں اپنی گاڑی خود چلا کے جا رہی تھی۔ میں نے اپنی چچی سے وہاں کا پتا پوچھا تو انہوں نے مجھے خالص لاہوری طریقے سے پتا بتایا:

''شاہی قلعے کے ساتھ ٹکسالی گیٹ کے سامنے۔ شاہی قلعہ تو لاہور کی سب سے مشہور جگہ ہے؛ وہاں تک تو پہنچ ہی جاؤ گی۔ پھر ٹکسالی گیٹ میں جا کر کسی سے پتا پوچھ لینا۔'' انہوں نے کہا۔

میں ٹھہری اسلام آباد اور میناپولس (Minneapolis) کے سیدھے راستوں کی عادی جہاں ہر پتا قرینے اور قاعدے سے مل سکتا ہے۔ پہلے تو کچھ چکرائی لیکن پھر نہایت اعتماد سے نکل کھڑی ہوئی۔ دل میں بہت خوشی تھی کہ اتنی شدید مخالفت کے باوجود آخر کار آج میرے کام کا آغاز ہو رہا ہے۔

لاہور کا یہ محلہ، شاہی محلہ اور ہیرا منڈی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ''شاہی'' تو اس لیے کیونکہ یہ شاہی قلعے کے بالکل ساتھ ہے۔ دوسرے نام ''ہیرا منڈی'' کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک نائب ''ہیرا'' کے نام پر پڑا ہے۔ دوسری یہ کہ یہاں ہیروں کی منڈی ہے اور ہیروں سے مراد عورتیں ہیں۔ شروع میں اس علاقے میں بازاروں کا جال سا بچھا تھا۔ شاہی محلہ اور ہیرا منڈی ان میں سے دو محلے تھے لیکن ان کے نام اس طرح زبان زدعام ہو گئے کہ اب پورا علاقہ ہی ان ناموں سے جانا جاتا ہے۔ اس علاقے میں دوسرے بارہ بازار یہ ہیں:

۱۔ کوچہ شہباز خان	۲۔ مین بازار	۳۔ لرگے منڈی
۴۔ حیدری اسٹریٹ	۵۔ فورٹ روڈ	۶۔ نیواں چترام روڈ
۷۔ اُچا چترام روڈ	۸۔ کوچہ سبز پیر	۹۔ بازار شیخوپوریاں
۱۰۔ بازار تھانہ ٹبی	۱۱۔ گاڈی محلہ	۱۲۔ ٹبی گلی

ٹکسالی گیٹ کے سامنے لاہور کے مخصوص ٹریفک کی بھیڑ لگی تھی۔ کاروں کے ساتھ ساتھ چلنے والی بیل گاڑیاں، تانگے، گدھا گاڑیاں، سائیکلیں، ویگنیں اور موٹر سائیکلیں راستے پر رواں تھیں۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے میں نے دھول کے ایک بادل کے پیچھے اس منظر کو دیکھا۔ یہاں سے راستہ دو

حصوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ میں پرانے شہر کے ساتھ اندر جانے والے راستے پر چل پڑی۔ تھوڑی ہی دیر میں راستہ تنگ سے تنگ تر ہونے لگا۔ دونوں طرف اونچی عمارتیں تھیں جن کی بالائی منزلوں پر جھروکے تھے۔ ان عمارتوں کا بالائی حصہ رہائشی لگ رہا تھا جبکہ نیچے والے حصے میں جوتوں وغیرہ کی دکانوں نے ایک بازار سا بنا رکھا تھا۔ سڑک پر گاڑیاں، موٹر سائیکلیں اور پیدل چلنے والے بھرے پڑے تھے۔ بھیڑ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اور گاڑی چلانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

میں اس بات پر خوش تھی کہ یہاں میں بس یا ٹیکسی کی جگہ اپنی ہی گاڑی میں آئی ہوں۔ اس گاڑی میں ہی میں نے لوک تھیٹر کی ساری تحقیق کی تھی۔ میری یہ وفادار ساتھی مجھے گانے ناچنے والے خانہ بدوشوں کے تعاقب میں رات کے وقت بھی پنجاب کے دور دراز علاقوں میں لے گئی تھی۔ اپنی اس سفید ٹویوٹا کرولا کو میں نے ''رانی'' کا نام دیا تھا۔ یہ میری مہمات کی پیاری ساتھی تھی۔ میرے وجود کے لیے لازمی! اس کے اندر بیٹھ کر میں پُراعتماد اور محفوظ محسوس کرتی تھی۔

ایک چوراہے پر، جہاں کسی سینما ہال پر ایکٹریسوں اور ایکٹروں کے بڑے بڑے رنگین بورڈ لگے تھے، میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے ایک راہگیر سے پوچھا:

''کیا یہ شاہی محلّہ ہے؟''

''آپ کو کہاں جانا ہے؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

پرانے شہر میں قاعدہ ہے آپ جب بھی کوئی سوال پوچھیں یا پتا دریافت کریں، لوگ آپ سے پہلے اپنی تفتیش ضرور کرتے ہیں۔ اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ دوسرے آپ کے بارے میں ساری معلومات ضرور حاصل کر لیں اور پوری طرح باخبر رہیں کہ آس پاس ہو کیا رہا ہے۔

میں نے کچھ بے صبری سے کہا: ''مجھے شاہدہ پروین کے گھر جانا ہے۔''

اس نے میرا اور میری کار کا جائزہ لیا، پھر بولا: ''آپ آئی کہاں سے ہیں؟''

اتنی دیر میں پیچھے ٹریفک نے ہارن بجا بجا کر اس قدر شور برپا کر دیا تھا کہ میرے لیے اس راہگیر کی بات سننا خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا اور دوبارہ اصرار سے پوچھا:

''یہ شاہی محلّہ نہیں؟''

اس پر راہگیر نے مجھے سیدھے آگے جانے کا اشارہ کیا۔

اس محلے میں اس وقت تک میں صرف شاہدہ پروین کو ہی جانتی تھی۔ وہ کلاسیکی سنگیت کی ماہر تھیں اور مہذب طبقوں میں ان کا نام بہت احترام سے لیا جاتا تھا۔ ان سے میری ملاقات لوک ورثہ کے دفتر میں ہوئی تھی جہاں وہ ایک کنسرٹ اور ویڈیو ریکارڈنگ کے لیے آئی تھیں۔ میں نے ان

سے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی تھی کہ وہ کہاں رہتی ہیں اور انہوں نے موسیقی کی تربیت کہاں سے حاصل کی ہے۔ اس وقت وہ اس محلے کے بارے میں گفتگو کرنے سے ہچکچائی تھیں مگر میں نے انہیں بتایا تھا کہ کسی دن میں تحقیق کرنے ان کے گھر آؤں گی۔ اس پر وہ بخوشی راضی ہوگئی تھیں۔

میں نے ناک کی سیدھ میں آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ چوراہے کے بعد پہلے والے بازار جیسا ایک اور بازار... ریستوران، ویڈیو کی دکانیں، دودھ کی دکانیں... پان فروشوں کی آمد و رفت۔ میں نے دیکھا کہ دوطرفہ اونچی عمارتوں کے جھروکے زیادہ واضح ہورہے تھے۔ مجھے بے شمار بھارتی اور پاکستانی فلموں کے منظر یاد آئے جن میں ''بازارِ حسن'' کو پیش کیا جاتا ہے۔ میں نے ایک مخصوص بات یہ دیکھی کہ اوپر ٹریفک اور راہگیروں کو بچاتے ہوئے راستے کے آر پار الگنیاں بندھی ہوئی تھیں جن پر کئی رنگوں کے تولیے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے کئی دکانیں بھی دیکھیں جن کے بڑے بڑے دروازے کسی گیراج جیسے تھے۔ یہ دروازے بند تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے یہ کسی کے استعمال میں نہیں ہیں۔ مگر جب میں پہلی بار یہاں آئی تھی تو مجھے احساس ہوا تھا کہ رات کے وقت یہ سونی، سنسان دکانیں رقص و سرود کی آماجگاہوں میں بدل جاتی ہیں۔ یہاں ''رات کی رانیاں'' رونق افروز ہوتی ہیں جن کے باعث یہ محلہ اس قدر مشہور ہے۔

آخر میں اس چوراہے پر پہنچی جس کا نام ''نوگزا چوک'' ہے۔ یہ روایت مشہور ہے کہ یہاں کسی بزرگ کی نوگز لمبی قبر تھی۔ کیا لوگ اب بھی یقین کرتے ہیں کہ ہمارے پُرکھے ہم سے زیادہ دراز قد ہوتے تھے؟ اس قبر کو نہ جانے کب ڈھایا گیا۔ اب یہاں کسی مزار کا نام و نشان نہیں لیکن چوک اب بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ اب میرے سامنے سازوں کی دکانیں تھیں جن میں ساز سجے ہوئے تھے۔ دائیں ہاتھ پر تین بڑے ریستوران تھے جن کے باورچی خانے سڑک تک پھیلے ہوئے تھے۔ کچا مال، مرغیاں اور گوشت ریستورانوں کے سامنے لٹکا ہوا تھا۔ یہاں بڑے بڑے چولہوں اور میزوں پر پڑی دیگوں کے باعث یہ چوک ایک خاص طرح کا نظر آرہا تھا۔

میں نے دو مرتبہ شاہدہ کے گھر کا پتا پوچھا۔ پہلی بار کسی نے کہا کہ اگلے چوک پر پوچھوں۔ وہاں تک پہنچ کر ایک موٹے بڑے میاں نے، جو صرف دھوتی پہنے ہوئے تھے، مجھ سے گاڑی پارک کرکے پیدل ایک تنگ گلی میں اپنے پیچھے پیچھے آنے کے لیے کہا۔ یہ حیدری اسٹریٹ تھی۔ شاہدہ کا گھر اسی میں کچھ آگے چل کر پڑتا تھا۔

گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر داخل ہونے پر مجھے ایک دس گیارہ برس کا لڑکا نظر آیا۔ اس کے پاؤں ننگے اور بال بکھرے ہوئے۔ یہ تصدیق کرنے کے بعد کہ یہی شاہدہ کا گھر ہے میں نے کہا

کہ میں ان سے ملنے آئی ہوں۔ اس پر مجھے اندر بلا لیا گیا۔ گھر کے اندر ایک تنگ راہداری ایک کنویں نما آنگن کی طرف جا رہی تھی جو کئی منزلہ عمارت کے وسط میں تھا۔ آنگن کے پار کئی چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ لیکن وہ بچہ مجھے بائیں ہاتھ کے کمرے میں لے گیا جہاں خوب روشنی آ رہی تھی۔ کمرہ تقریباً پندرہ فٹ لمبا چوڑا تھا۔ اندر ایک صوفہ سیٹ رکھا تھا، فرش پر چاندنی بچھی تھی، ایک طرف طبلہ اور ہارمونیم رکھے تھے۔ سامنے کی طرف ایک بڑا دروازہ تھا جس کے پیچھے سے جو آوازیں آ رہی تھیں ان سے معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ دروازہ باہر سڑک پر کھلتا ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ یہی وہ جگہ ہے جسے ''کوٹھا'' کہا جاتا ہے۔

شاہدہ نے بڑی محبت سے میرا خیر مقدم کیا اور میری خاطر داری کی۔ وہ سمجھی کہ میں اُسے کسی کنسرٹ میں مدعو کرنے کے لیے آئی ہوں اس لیے میں نے فوراً اپنی تحقیق کے بارے میں گفتگو کرنا شروع کر دی۔ میں نے اُسے اس تحقیق کے مقاصد اچھی طرح سمجھائے۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ وہ کسی بات سے خوفزدہ ہو جائے۔ اس لیے میں نے فوراً یہ وضاحت کر دی کہ میں یہاں طوائف کے پیشے کی مذمت کرنے کے لیے معلومات حاصل کرنے نہیں آئی ہوں۔ میرا مقصد اصلاح وغیرہ نہیں ہے، نہ میں منصف کی نشست پر براجمان ہو کر اخلاقیات پر فیصلے صادر کرنا چاہتی ہوں۔ میں صرف اس محلے میں رہنے والوں کی بود و باش، باہمی تعلقات، گاہکوں سے نمٹنے اور موسیقی کو فروغ دینے کے طریقۂ کار کو سمجھنا چاہتی ہوں۔

میری خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ معلومات مجھے شاہدہ ہی سے مل جائیں لیکن یہ زیادہ ہی بڑی خوش قسمتی ہوتی۔ میں نے اپنی بہترین تحقیقی صلاحیتیں استعمال کرنے کی کوشش کی مگر اس کے باوجود وہ مسلسل انکار کرتی رہی کہ طوائف کے پیشے سے اس کا دور کا بھی کوئی واسطہ ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ جاننا نہیں چاہتی، صرف تمدن کی اس زیریں پرت کو سمجھنا چاہتی ہوں جو اس محلے میں موجود ہے۔ شاہدہ نے کہا کہ اس کی والدہ نے یہ پیشہ چھوڑ کر صرف موسیقی کو اپنا لیا تھا اور اب وہ بھی اس راہ پر گامزن ہے اور صرف ایک گلوکارہ ہے۔ اس محلے میں وہ ابھی تک اس لیے رہتی ہے کیونکہ یہ اُن کی خاندانی جائیداد ہے اور وہ اسے بیچنا نہیں چاہتی۔ میں نے اس سے کہا کہ اس صورت میں میں چاہتی ہوں کہ آس پاس کے دوسرے لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے اُس کے گھر آتی رہوں۔ اس بات پر وہ بخوشی راضی ہو گئی۔ وہ خود مجھے کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی لیکن اس نے دوسرے ایسے لوگوں سے میرا تعارف کرانا شروع کر دیا جو اس موضوع پر زیادہ کھل کر بات چیت کر سکتے تھے۔

اس کے بعد کچھ دن تک میں اکثر اُس کے گھر جاتی رہی۔ وہ ہر بار چند نئے لوگوں سے میرا تعارف کراتی تھی۔ ایک دن میں نے غسل خانے میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ شاہدہ نے ایک چھوٹی لڑکی کو میرے ساتھ کر دیا جو مجھے باہر لے گئی۔ کمرے کے باہر ایک تاریک سا صحن تھا جس سے پیشاب کی بو آ رہی تھی۔ ایک بچہ وہاں کھڑا پیشاب کر بھی رہا تھا۔ وہ لڑکی مجھے ایک لکڑی کے زینے سے اوپر لے گئی۔ ایسا نظر آ رہا تھا کہ عام طور پر اوپر جانے کے لیے یہ سیڑھیاں استعمال نہیں کی جاتیں۔ سیڑھیوں کے اوپر ایک دروازہ تھا جو ایک کمرے میں کھلتا تھا۔ اس کمرے کے اندر پہنچ کر میں نے منظر ہی دوسرا دیکھا۔ اچھے خاصے کشادہ کمرے کی دیواروں اور چھت پر بڑے بڑے آئینے جڑے ہوئے تھے۔ شاہی محلوں جیسا ایک خوبصورت بستر لگا ہوا تھا۔ کمرے میں ٹیلی وژن، وی سی آر اور فریج بھی موجود تھا۔ اس خوبصورت خواب گاہ سے ملحق غسل خانے میں ٹائیل لگے تھے۔ جدید طرز کا گہرا سرخ کموڈ تھا۔ لیکن ہر طرف مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے اور ہر چیز پر دھول جمی تھی۔ اس خواب گاہ سے یقیناً کچھ دلچسپ داستانیں وابستہ ہوں گی لیکن شاہدہ نے یہ راز مجھے کبھی نہ بتایا۔

ایک رات میں شاہدہ کے گھر کوئی دس بجے جا پہنچی۔ میرا ارادہ تھا کہ رات کے وقت محلے کی سرگرمیوں کا جائزہ لوں۔ میں شاہدہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی کہ دو نوجوان لڑکیاں وہاں آئیں۔ وہ خوب سجی بنی تھیں۔ شاہدہ نے وضاحت پیش کی کہ وہ شام کے وقت مکان کے ایک کمرے کو کوٹھے کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دے دیتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ کمرے کا کرایہ لیتی ہے؟ اس پر شاہدہ اپنی مشکلات کے بارے میں بتانے لگی کہ گانے سے اس کی آمدنی نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے مجبوراً اسے اس کمائی سے کچھ رقم لینی پڑتی ہے تا کہ کم از کم گزارہ تو ہو سکے۔ شاہدہ نے تو مجھے آمدنی کی حصہ داری کے طریقے کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ناچ گانے سے ہونے والی آمدنی رقاصاؤں، سنگت دینے والوں اور جگہ فراہم کرنے والوں کے درمیان تقسیم کرنے کے صاف صاف اصول ہیں۔ شاہدہ چونکہ اس پیشے کے متعلق کوئی بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے میں نے بھی مزید نہیں کریدا۔

اس سے اگلے دن شاہدہ نے میرا تعارف شاکرہ سے کروایا۔ بھاری بدن کی یہ عورت کوئی چالیس کے پیٹے میں تھی۔ شاکرہ مجھے اپنے گھر لے گئی جہاں اس نے مجھے اپنے خاندان کی پاکیزگی کی داستانیں سنانا شروع کر دیں۔ اس نے مجھ سے معذرت چاہی کہ وہ مجھے اپنی بیٹیوں سے نہیں ملا سکتی کیونکہ وہ اس وقت قرآن شریف پڑھ رہی ہیں اور شاکرہ انہیں درمیان سے اٹھانا نہیں چاہتی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ وہ مزاروں پر اپنی برادری کے کسی بھی فرد سے زیادہ نذر نیاز کرتی ہے۔ پچھلے ہفتے

ہی اس نے داتا دربار پر دو دیگیں چڑھائی ہیں۔ اس نے زور دے کر کہا کہ اس کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اس کے خاندان کی لڑکیاں اور عورتیں جو شیعہ ہونے کے ناتے ہر سال محرم میں پورے چالیس دن سوگ مناتی ہیں، اس بدنام پیشے کے پاس بھی نہ پھٹکیں۔

اس ملاقات سے یوں تو میرا تحقیقی مقصد حاصل نہیں ہوا اور ہمارے درمیان اعتماد کی فضا بھی پیدا نہیں ہوئی لیکن مجھے ایک اور بات کا علم ہوا اور وہ یہ کہ اس پیشے سے تعلق رکھنے کو صرف شاہدہ جیسی مشہور گائیکہ ہی نہیں، دوسری عورتیں بھی چھپاتی ہیں۔ علاوہ ازیں، یہ بھی قابلِ توجہ امر تھا کہ سماج نے ان کے پیشے کو ان کے وجود پر ایک داغ بنایا ہے اور اسے چھپانے کی خواہش میں یہ عورتیں مذہب کا سہارا لیتے ہوئے خود کو بہت مذہبی بنا کر پیش کرتی ہیں۔

پہلے طوائفوں کے باضابطہ رسم و رواج کے بارے میں معلومات زیادہ عام تھیں کہ یہ کاروبار بھی بعض روایتی طریقوں سے ہوتا ہے۔ (مثلاً نتھ اتارنا ایک باقاعدہ رسم ہے اور ایسے ہی دوسرے رواج بھی ہیں۔) موسیقی اور رقص اس پیشے کا اہم حصہ تھا اور معاشرے کے شرفاء ان کی سرپرستی کرتے تھے۔ آزادی کے بعد پاکستان میں اس پیشے کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ طوائفوں سے اچانک کہا گیا کہ اب وہ قانوناً صرف تفریح فراہم کرنے کے لیے ناچنے گانے کا کام کرسکتی ہیں۔ حالانکہ ہر شخص جانتا تھا کہ ان کا دوسرا پیشہ بھی جاری ہے لیکن یہ عورتیں اس حقیقت کو چھپانے پر مجبور ہوگئیں۔ ماضی میں چکلہ میں پیشہ کرنے والی عام عورتوں اور فنونِ رقص و موسیقی کی ماہر طوائفوں میں بڑا فرق سمجھا جاتا تھا۔ طوائفیں بھی بڑی احتیاط سے مناسب افراد سے ہی جنسی تعلقات قائم کرتی تھیں اور اکثر بحیثیت داشتہ یہ تعلقات طویل عرصے کے ہوتے تھے۔ معاشروں میں ان تعلقات کو بھی ایک خاص مقام دیا جاتا تھا۔ لیکن اب جنسی خدمات فراہم کرنے والی سب عورتوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔

میرے علم میں برصغیر کی اس تہذیبی روایت سے مماثل صرف ایک مثال جاپان کی ''گیشا'' عورتوں میں نظر آسکتی ہے۔ جاپانی ''گیشا'' عورتیں مصوری، موسیقی اور گلوکاری کی تربیت حاصل کرتی تھیں اور مرد اِن سے کم یا طویل مدت کے تعلقات قائم کرسکتے تھے۔ کیونکہ پیشے کے ساتھ تہذیبی روایتیں وابستہ تھیں اس لیے یہ عورتیں اپنے خریداروں کے انتخاب میں بھی احتیاط برتتی تھیں۔ طویل مدت کے گاہکوں کو ''دانتا'' کہا جاتا تھا۔ جنوبی ایشیا میں بھی ''پابند'' طوائفیں اسی اصول پر کاربند رہتی تھیں۔ یہ حال ہی میں ہوا ہے کہ اس پیشے سے تعلق رکھنے والی ہر درجے کی عورت کو ایک ہی نام سے پکارا جانے لگا ہے۔ پہلے ہماری زبانوں میں طوائفوں کی الگ الگ حیثیت کے مطابق علیحدہ نام ہوتے تھے۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

طوائف، خانگی، کنجری، کسبی، رنڈی، بائی جی

شروع میں میرا خیال تھا کہ اس محلے میں اپنے اولین رابطے کی وساطت سے دو ہفتے کی مدت میں اتنے لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی کہ اس کے بعد تحقیق کے لیے ضروری معلومات آسانی سے ملنے لگیں گی لیکن دو ہفتے سے کہیں زیادہ وقت گزر چکا تھا اور مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوا تھا۔ محلے کے باسیوں کے دل و دماغ میں کسی بھی قسم کی معلومات فراہم کرنے کے خلاف مزاحمت کی ایک دیوار تھی جو گرتی یا ٹوٹتی ہی نہ تھی۔

تحقیق کے آغاز میں، میں لوک ورثہ کے دفتر میں اس محلے میں رہنے والے چند دوسرے فنکاروں سے بھی ملی تھی۔ میں نے ان سے بھی گفتگو کا سلسلہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن نتیجہ وہی نکلا۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے بارے میں بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھیں کیونکہ بقیہ سماج میں یہ ایک ممنوع موضوع تھا۔ میں ''باہر والی'' تھی اور ان خاندانوں کی عمر رسیدہ عورتیں مجھ پر بھروسا نہیں کرتی تھیں۔ وہ مجھے جوان عورتوں سے بات کرنے کا موقع تک نہیں دیتی تھیں۔ انہیں احساس تھا کہ ذرا سی غلطی سے انہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ کاروبار غیر قانونی تھا اور کسی اجنبی کے سامنے اس میں ملوث ہونے کے اقرار سے پیشے سے وابستہ تمام افراد مصیبت میں گرفتار ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ میرے خیال میں، اس پیشے سے وابستہ بڑی بوڑھیاں اس بات سے بھی خوفزدہ تھیں کہ نوجوان طوائفیں مجھ سے بات چیت کر کے ''خراب'' ہو جائیں گی۔ اس سے ان کو بہت خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ یہ فطری بات تھی کیونکہ، جیسا مجھے آگے چل کر معلوم ہوا کہ اُن کی زندگی کا انحصار ہی اس پر تھا کہ نوجوان طوائفیں نمودار ہوتی رہیں اور اُن کے قابو میں رہیں۔

پوری کامیابی نہ ملنے کے باوجود میں خوش تھی۔ میرے تحقیقی منصوبے نے جو ہنگامہ برپا کیا تھا، اس کے باوجود میں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا اور میرا مصمم عزم تھا کہ جب تک میرے سوالوں کا جواب نہیں مل جاتا، میں کوشش جاری رکھوں گی۔

شاہدہ پروین اور سنگیت اور رقص سے تعلق رکھنے والی چند دوسری عورتوں سے گفتگو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے کوائف اکٹھا کرنے کے لیے ایک دوسری حکمتِ عملی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

باب ۵
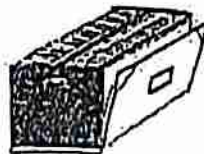
سازندے

کسی عمرانی محقق کے لیے گروہ سے بامعنی رابطہ قائم کرنا اس کی تحقیق کا انتہائی اہم قدم ہوتا ہے۔ میں نے یہ رابطہ طوائفوں کے ذریعے قائم کرنا چاہا جس کا جواب خاطر خواہ نہ نکلا تھا۔ لہٰذا میں نے ایک دوسری حکمتِ عملی اپنانے کا فیصلہ کیا۔ اس بار میں ان سازندوں سے رابطہ کر رہی تھی جو اِن طوائفوں سے بہت قریب تھے اور اس ماحول کا ایک اہم جز و تھے۔

اس محلے کے تمام موسیقار اور سازندے مرد ہیں۔ ان کا اوّلین کام یہ ہے کہ کوٹھوں پر مجروں کے لیے سنگت فراہم کریں۔ زیادہ تر یہ طبلہ اور ہارمونیم وغیرہ بجاتے ہیں لیکن ان میں سے چند گیتوں اور غزلوں کی دھنیں بھی تیار کرتے ہیں اور فنِ موسیقی سکھانے کا اہم کردار بھی ادا کرتے ہیں۔ طوائف کے پیشے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس کے باوجود یہ لوگ طوائفوں کے ساتھ بالکل مل کر کام کرتے ہیں۔

ان سازندوں اور موسیقاروں کی اکثریت کا تعلق میراثی برادری سے ہے۔ وہ سازندے جو ذات کے میراثی نہیں ہیں، وہ بھی محلے میں گھل مل جانے کے لیے خود کو میراثی ہی ظاہر کرتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں میراثیوں کو بڑے بڑے جاگیرداروں کی سرپرستی حاصل رہتی تھی۔ میراثی ان کے خاندانوں کا شجرہ یاد رکھتے تھے اور شادی بیاہ، عقیقہ اور ختنہ وغیرہ کی تقریبات میں گاتے بجاتے اور انعامات پاتے تھے۔

میں نے لوک ورثہ سے چند موسیقاروں کے حوالے لیے اور اس طرح استاد صادق تک جا پہنچی۔ لوک ناٹک میں عورتوں کے کردار پر تحقیق کرتے ہوئے میری ان سے ایک مختصر ملاقات پہلے ہی ہو چکی تھی۔ ان کے پتے کی تو مجھے ضرورت بھی نہ پڑی۔ محلے میں ہر شخص دوسرے شخص کو جانتا ہے۔ استاد صادق کا نام ہی کافی تھا۔

شاہی محلے میں، میں نے ایک دکاندار سے پوچھا کہ استاد صادق کی بیٹھک تک کیسے پہنچا جائے۔ اس نے اپنی دکان سے ایک بچہ میرے ساتھ کر دیا۔ بازار سے نکلتی ہوئی ایک چھوٹی گلی میں استاد صادق کا گھر تھا۔ میں نے دستک دی تو دروازہ ایک نوجوان نے کھولا۔ وہ کوئی انیس بیس برس کا ہوگا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور مسلے ہوئے شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ مجھ جیسی بن بلائی مہمان کو دیکھ کر وہ بھونچکا سا رہ گیا اور بلند آواز سے پکارتا ہوا اندر بھاگا۔

''استاد! استاد... ! دروازے پر کوئی عورت آپ کا پوچھ رہی ہے۔''

ادھ کھلے دراوزے سے مجھے استاد صادق دوسرے کمرے میں بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ وہ صرف شلوار پہنے بیٹھے تھے۔ کمرے میں دروازے کے پیچھے ٹنگی قمیض اتار کر انہوں نے جلدی سے پہنی اور دروازے پر آئے۔ سانولا رنگ، درمیانہ قد، باریک مونچھیں، آنکھوں میں سرمہ اور تیل سے چمکتے بال۔ یہ تھے استاد صادق!

میں نے اپنے آنے کا مقصد بتایا اور اندر داخل ہوئی۔ ایک بڑی عمارت میں یہ دو کمروں کا چھوٹا سا حصہ تھا۔ ایک چھوٹے چوبی دروازے کے ذریعے میں ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔ چھوٹے سے کمرے میں ایک طرف ٹین کے صندوقچے اور بستر تہہ کیے ہوئے ایک دوسرے پر رکھے تھے۔ ایک کونے میں پانی کے نل کے پاس برتنوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ وہیں ایک چھوٹا سا تیل کا چولہا بھی رکھا تھا۔ گویا یہ اس گھر کا باورچی خانہ بھی تھا۔ تھوڑی سی جگہ کا اتنا اچھا یا اتنی کفایت شعاری سے استعمال کرنے پر میں کافی متاثر ہوئی۔ اندر والے کمرے میں فرش پر چٹائیاں اور چادریں بچھی تھیں۔ دیواروں پر فلم ایکٹرسوں، گلوکاراؤں وغیرہ کی بڑی بڑی، اخباروں سے کاٹی ہوئی رنگین تصویریں لگی تھیں۔ ایک گوشے میں دیوار پر ایک بڑی سی کیل ٹھونک کر ایک آئینہ لٹکا دیا گیا تھا جس کے ساتھ لٹکے چھوٹے سے تھیلے میں استاد کا کنگھا وغیرہ ہوگا۔ ایسی ہی ایک دوسری کیل سے ان کے کپڑے لٹک رہے تھے۔ یہ دو کیلیں استاد کا ڈریسنگ روم تھیں! کمرے کے ایک کونے میں، تہہ کیے ہوئے بستروں کے ساتھ فرش پر ایک ہارمونیم رکھا ہوا تھا۔

فرش پر بیٹھ کر میں نے اپنا مفصل تعارف کروایا۔ استاد صادق نے بڑی گرمجوشی سے میرا

خیر مقدم کیا۔ ''لوک ورثہ'' سے تمام موسیقار اور سازندے واقف ہیں اور اس کا بڑا احترام کرتے ہیں۔

کمرے میں تین اور لوگ بھی موجود تھے۔ ان میں سے دو استاد صادق کے شاگرد تھے اور تیسرا شخص، ریاض ان کا شریکِ کار تھا جو ان دنوں اُن کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرا تعارف ان سب سے کرایا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ استاد صادق میری موجودگی میں نہایت بے تکلفی سے گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے منہ سے اندرونِ شہر کی ٹھیٹ پنجابی سن کر مجھے بہت لطف آ رہا تھا۔ ویسے ان کی گفتگو بھاری بھرکم گالیوں سے مرصع تھی۔ یہ نہایت رنگین اور فلسفیانہ گالیاں تھیں جو میں نے پہلے کبھی نہ سنی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر میری فہم و قیاس سے بالاتر تھیں۔ دل تو بے اختیار چاہ رہا تھا کہ نوٹ بک نکال کر فی الفور انہیں لکھنا شروع کر دوں کیونکہ یہ میرے تحقیقی خزانے میں گراں قدر اضافہ ہوتا لیکن مجبوراً من مارے بیٹھی رہی اور مہذب گفتگو کی کوشش کرتی رہی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں اگر ایک گالیاں دے رہا ہو تو اس کا لازمی مطلب یہ نہیں کہ وہ غصے میں ہے؛ گالیاں گفتگو میں چاشنی پیدا کرنے کے لیے بھی دی جا سکتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ محلے کے نظام سے واقفیت حاصل کرنے کی میری یہ حکمتِ عملی آگے چل کر بہت بار آور ثابت ہوئی۔ ابتدا میں مجھے سازندوں اور موسیقاروں کی اپنی زندگی اور محلے میں ان کے شب و روز کے بارے میں معلومات ملیں اور اس کے بعد طوائفوں، نائیکاؤں اور وہاں کے مکمل نظام کے بارے میں اہم معلومات مل سکیں۔ تحقیق کے دوران میں استاد صادق اور چند دوسرے سازندوں اور موسیقاروں کے گھر باقاعدگی سے جاتی رہی۔

ایک دن استاد صادق نے خاص میرے لیے تقریباً پندرہ سازندوں کو بلا لیا تاکہ میں ان کا انٹرویو کر سکوں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا مگر میں ان سازندوں سے ان کی اپنی رہائش گاہوں میں ملنا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان میں سے کافی سازندوں کا محلے میں کوئی ذاتی ٹھکانہ نہیں تھا۔ جن کے اپنے مکان تھے انہوں نے خوش دلی سے کہا کہ میں جب چاہوں ان کے گھر آ سکتی ہوں۔

میں ان کے کام اور خاندانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ یہ موسیقار اور سازندے اس محلے میں اپنی ''زندگی بنانے'' کے لیے رہتے تھے کیونکہ ٹیلی وژن اور ریڈیو کے کارکن نئی آوازوں اور نئی موسیقی کے لیے یہاں کے اکثر چکر لگاتے رہتے تھے۔ ایک سازندے نے مجھے اس کی جزئیات کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا:

''میں طبلے پر سنگت دیتا ہوں۔ گیت یا غزل کی دھن استاد جی بناتے ہیں۔ استاد کو بول کوئی
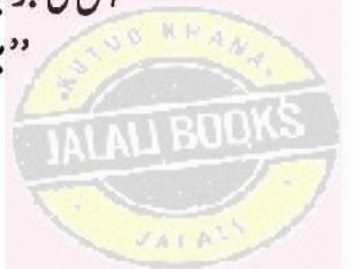
شاعر لکھ کر دیتا ہے۔ سنگت کے لیے دوسرے سازندوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس طرح میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ جب یہ تمام دوسرے لوگ کچھ کریں تو میں طبلے پر سنگت دیتا ہوں۔"

میں نے اس سے پوچھا کہ "آیا اس کا کوئی مستقل ذریعہ آمدنی ہے؟"

اس پر اس نے بتایا "ہاں جی! جب ریڈیو یا ٹیلی وژن والے بلا لیتے ہیں تو آمدنی بھی ہو جاتی ہے۔ ویسے ہم فنکار تو اس بات کے عادی ہوتے ہیں۔ جب قسمت ساتھ دے تو آمدنی ہو جاتی ہے ورنہ روکھی سوکھی پر گزارہ کرتے ہیں۔"

یہ نوجوان سازندہ سیالکوٹ سے لاہور آیا تھا۔ سیالکوٹ میں بھی یہ ایسے ہی ایک محلے میں رہتا تھا۔ اس کے دوست بھی سازندے تھے جنہوں نے اسے لاہور میں قسمت آزمانے کا مشورہ دیا تھا۔

"کیا یہ درست مشورہ تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی!" سازندے نے کہا۔ "بھائی صادق کی مہربانی سے گزارا ہو جاتا ہے۔ کل ہی ایک جگہ کنسرٹ میں طبلہ بجایا تھا۔ ہزار روپے مل گئے۔"

میں نے پوچھا "تمہیں یہ پتا کیسے چلتا ہے کہ کوئی کنسرٹ ہونے والا ہے، یا کہیں اور تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے؟"

استاد صادق نے مجھے سمجھایا:

"اسی لیے محلے میں ہونا ضروری ہے۔ یہاں لوگ آ کر کسی بھی محلے والے کو بتا دیتے ہیں کہ بھئی ایک پروگرام کروانا ہے۔ وہ دوسروں کو بتا دیتا ہے یا اپنا گروپ خود تیار کر لیتا ہے۔"

"اور اسے کمیشن مل جاتا ہے۔" ریاض نے وضاحت کی۔

"دوسروں کو کیوں بتاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔ "یہ تو آمدنی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ اکیلے ہی اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتا؟"

صادق نے ہنس کر کہا "اکیلا آدمی شو نہیں کر سکتا۔ مجھ سے کسی نے کہا کہ گانے کا پروگرام رکھا گیا ہے۔ ایک گانے والی چاہیے اور دو سازندے کافی ہوں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ سازندے کم سے کم تین ہونے ضروری ہیں۔ ایک پیٹی (ہارمونیم) کے لیے، ایک طبلے کے لیے اور ایک نال بجانے کے لیے... پھر میں نے چندا سے کہا کہ وہ آ جائے۔ عبدل کو طبلہ اور ریاض کو نال بجانے کے لیے بلا لیا۔ ہارمونیم پر میں خود تھا۔ تین چار چیزیں میں نے بھی گائیں۔ اس طرح فوراً گروپ تیار کرنے سے کام ہوتا ہے۔"

میں نے بات بدلتے ہوئے استاد صادق سے پوچھا، "اس محلے میں داخل ہوتے ہی مجھے

گلیوں میں رنگ برنگے تولیے لہراتے نظر آئے تھے جو مجھے کافی پراسرار لگے تھے۔کیا ان کا کوئی خاص مطلب ہے؟''

اس پر استاد بہت ہنسے۔انہوں نے کہا:

''بھئی یہاں گلی گلی حمام ہیں۔ یہ بڑی گنجان آبادی ہے۔جگہ کی بڑی تنگی ہے۔لوگوں کے گھروں میں غسلخانے وغیرہ تو ہیں نہیں۔بس حماموں میں جاکر نہادھو لیتے ہیں۔اس سے حجاموں کو بھی روزی روٹی مل جاتی ہے۔ یہ تولیے ان ہی حماموں کے ہیں۔سوکھنے کے لیے دھوپ میں لٹکا دیتے ہیں۔''

استاد صادق اس محلے میں ۸۰ء کے عشرے میں آئے تھے۔ان کی اپنی باقاعدہ تربیت نہیں ہوئی تھی۔ جو کچھ انہوں نے سیکھا وہ دوسرے استادوں کی صحبت میں سیکھا۔صادق موسیقاروں کی گفتگو اور ان کی موسیقی غور سے سنتے تھے۔اس طرح انہیں راگوں کی پہچان ہوئی۔صادق استادوں کی خدمت کرتے رہتے تھے۔یہی ان کا مدرسہ تھا اور یہی ان کا اسکول...

صادق نے بتایا کہ کبھی کبھی رات گئے، جب موسیقار تھک جاتے تھے اور سونے کے لیے اپنی چارپائیوں پر لیٹ جاتے تھے تو وہ صادق سے گانے کی فرمائش کرتے تھے۔صادق اس وقت دس برس کے بچے تھے۔کبھی ان کے گانے پر خوش ہوکر بڑے استاد انہیں ایک روپیہ انعام میں دیتے تھے۔لیکن استاد جمیل نے صادق کی صلاحیت کو پہچان لیا تھا۔

استاد صادق ذات کے میراثی تھے لیکن ان کے والد نے یہ پیشہ نہیں اپنایا تھا۔وہ پھلوں کے ایک باغ میں باغبانی کرتے تھے۔صادق کے ایک بھائی نے پہلوانی اختیار کی، وہ کشتیاں لڑا کرتے تھے۔میراثیوں کے لیے یہ بھی ایک غیر روایتی پیشہ تھا۔ پنجاب میں واقع صادق کے چھوٹے سے گاؤں میں، میراثیوں کے اس خاندان میں صرف صادق کو موسیقی کا شوق تھا۔گاؤں کے گروپ سے علیٰحدہ ہونے کے بعد صادق نے استاد جمیل شاہ سے موسیقی کی باقاعدہ تربیت حاصل کی۔انہوں نے کئی لوک ناٹک گروپوں کے ساتھ کام کیا اور اس طرح آخر کار وہ شاہی محلے میں منتقل ہوگئے جوان کی نظر میں ان کے فن کا مرکز تھا۔موسیقی کے شعبے میں کام کرنے والے لوگوں کا اس محلے سے کوئی نہ کوئی رابطہ ہمیشہ رہتا تھا۔

صادق نے اپنے بیوی بچوں کو رینالہ میں رکھا تھا۔ جب صادق شاہی محلے میں آئے، اس وقت اس عمارت کی مالکہ کو اپنی بیٹی لیلیٰ کے لیے ایک اچھے استاد کی تلاش تھی۔ وہ صادق کو دو کمرے کرائے پر دینے کے لیے راضی ہوگئی۔مگر اس کی شرط یہ تھی کہ استاد صادق لیلیٰ کی تربیت بھی کریں۔

استاد صادق بخوشی راضی ہوگئے اور محلے میں آگئے۔ یہاں ان کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ لیلیٰ کے مجروں کے لیے ہر قسم کے ساز کی مناسب سنگت کا اہتمام کریں۔ اس طرح استاد صادق اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لیلیٰ کے مجروں میں موسیقی کی سنگت دینے لگے۔

استاد صادق سے مجھے بیش بہا معلومات حاصل ہوئیں۔ ایک طرح سے اس شہرِ ممنوع میں وہ میرے بھی استاد تھے۔ انہوں نے مجھے یہاں کے بارے میں بتایا۔ چندا اور لیلیٰ سے شناسائی بھی ان کے ذریعے ہی ہوئی۔

ایک روز جب میں ان کی بیٹھک میں تھی، ایک دراز قد، خوبرو، چھریرے بدن کی جواں سال عورت ان کی بیٹھک میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ وہ یہاں آنے والی عورتوں سے کافی مختلف تھی۔ پہلے تو مجھے مغالطہ ہوا کہ وہ کوئی اونچے درجے کی داشتہ ہے۔ وہ چہرے مہرے سے سمجھدار لگ رہی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ آرام دہ زندگی گزارتی ہے۔ اس کے دراز سیاہ بال اس کے شانوں پر پڑے تھے اور خوبصورت لگ رہے تھے۔ اس کی چال میں آہنگ تھا۔ دستک دیئے بغیر وہ بیٹھک میں داخل ہوئی اور سیدھی کمرے میں آ کر فرش پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت دلفریب لگ رہی تھی۔

استاد صادق نے کہا ''آ گئے او؟'' اور پھر پُر تکلف تعارف کرایا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ان کی بہترین شاگردہ ہے اور پروگراموں میں سب سے زیادہ بلائی جاتی ہے۔

اس پر ان کے ایک شاگرد کو شرارت سوجھی۔ اس نے استاد کو ستانے کے لیے کہا: ''کجھ گھٹ کرو جی۔ بوت اُچّا پچا دتا اے۔'' (کچھ کم کریں جی۔ کچھ زیادہ ہی اونچا پہنچا دیا ہے آپ نے)

اس پر سب ہنس پڑے۔ وہ لڑکی بہت پیار سے اُس لڑکے پر چیخی۔ اُسکے منہ کھولتے ہی میری نظر اُسکے پان کھائے ہوئے دانتوں پر پڑی۔ ساتھ ہی اس نے گالیوں کی بوچھاڑ کر دی اور لڑکے کی پیٹھ پر زور سے ایک دھپ رسید کیا۔ اس کی آواز اونچی اور بھدی تھی۔ یہ تھی چندا...

اس نے مجھ سے کہا:

''اس حرامی کی بات نہ سننا، مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیسے آئی ہو؟''

اب استاد صادق نے میرا بھی ویسا ہی پُر تکلف تعارف شروع کیا۔ جلد ہی ہم دونوں عورتیں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگیں۔ چندا نے مجھے اپنے گھر والوں کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا: ''آپ سے بات کرنے میں تو بڑا مزا آ رہا ہے۔ روز ایک جیسی باتیں سنتے سنتے میں بور ہوگئی ہوں۔''

اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اگرچہ اس نے کالج میں کبھی نہیں پڑھا تھا لیکن اسے پڑھنے کا شوق ہے اور وہ کبھی کبھی اپنے لیے کتابیں خریدتی ہے۔ اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت بھی

دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ میں چندا سے واقف ہوتی گئی۔ اس کی شخصیت کے کتنے ہی پہلو تھے جنھوں نے مجھے مسحور کر دیا۔ کبھی وہ ایک بچی کی طرح ضدی اور نادان نظر آئی اور کبھی عشق میں دیوانی نظر آئی۔ کبھی وہ ایک ذمہ دار، تحکمانہ مزاج کی سمجھدار عورت لگی اور کبھی تجسس اور اشتیاق سے پُر... میں نے اسے ایک طوائف کے روپ میں بھی دیکھا جو گاہک پٹانے کے ہنر میں پوری طرح طاق نظر آئی۔

استاد صادق نے موسیقی کا سبق شروع کیا۔ وہ لیلیٰ کے ابھی تک نہ پہنچنے پر ناراض تھے۔ موسیقی کے بیچ میں ہی وہ اس کی شکایتیں کرنے لگتے۔

''قیصرہ کو دیکھو! سارا الزام مجھے دیتی ہے کہ میں لیلیٰ پر توجہ نہیں دیتا۔ اس کی بیٹی کبھی وقت پر آئی ہے؟ نہیں جی! اسے پرواہ ہی نہیں۔ جب مہارانی صاحبہ کا دل چاہے گا تب ہی آئیں گی۔ اونہہ!!''

آخرکار لیلیٰ بھی آ پہنچی۔ پستہ قد، نوجوان، کچھ فربہی کی طرف مائل۔ شکل وصورت بہرحال پیاری..... یہ لیلیٰ تھی۔

استاد صادق نے اسے غصے سے گھورا تو وہ دیر تک ہنستی رہی۔ استاد صادق کی ڈانٹ پھٹکار وہ ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے نکال رہی تھی۔ اس پر استاد صادق کو اور بھی غصہ آ رہا تھا۔ لیلیٰ نے لبھانے والے انداز میں کہا: ''استاد جی! اَج بڑے اوکھے ہو رہے او؟ خیر تے ہے؟'' (استاد جی! آج آپ کچھ زیادہ ہی ناراض ہو رہے ہیں؟ خیریت تو ہے؟)

استاد صادق نے میری طرف دیکھ کر کہا: ''یہ ہے میری ذہین شاگرد! لیلیٰ قیصرہ! میرا خیال تھا کہ فنکاروں میں آپ کے لیے اچھا رابطہ بن سکتی ہے۔ لیکن اسے سنبھالنا آپ کے بس میں نہیں ہوگا؟''

میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ موسیقی کا سبق جاری رکھیں۔ میں بیچ میں خاموشی سے اٹھ کر چلی جاؤں گی۔ میں نے لیلیٰ سے کہا کہ میں اسی ہفتے، کسی دن اس کے گھر آؤں گی۔

باب ۶
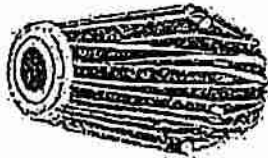
داستانوں کا آغاز

اس کے اگلے ہی دن میں پہلی بار لیلیٰ کے گھر گئی۔ اس عمارت کا ایک دروازہ سامنے کی بڑی سڑک پر کھلتا تھا۔ عمارت میں داخل ہونے کے لیے میں نے وہی راستہ استعمال کیا جو سیدھا لیلیٰ والے حصے کو جاتا تھا۔ یہ پرانا چوبی دروازہ نوگزا چوک کے پاس تھا جہاں ہر طرف دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ لکڑی کے اس پرانے دروازے کو بھی دونوں طرف لانڈری اور دودھ کی دکانوں نے تقریباً چھپا رکھا تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہونے پر نیم تاریک تنگ سیڑھیاں بل کھاتی ہوئی اوپر جا رہی تھیں۔ یہ دوپہر کا وقت تھا لیکن وہاں اتنا اندھیرا تھا کہ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سیڑھیاں ختم ہوئیں تو ایک دروازہ سامنے تھا۔ اس کی ایک درز سے روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ یہ نہ ہوتی تو میں کبھی اس دروازے کو نہ دیکھ پاتی اور اس سے جا ٹکراتی۔ میں نے وقفے وقفے سے تین بار دروازے پر دستک دی تب کہیں جا کر کسی نے جواب دیا۔ یہ کسی نوجوان عورت کی آواز تھی۔

میں شش و پنج میں پڑ گئی۔ اگر کہتی ہوں ''فوزیہ'' تو اندر کوئی بھی کچھ نہ سمجھے گا۔ اس لیے میں نے کہا: ''لیلیٰ کی دوست ہوں۔'' ترکیب کارگر رہی۔ دروازہ کھل گیا اور دوسرے ہی لمحے میں ایسے خاندان کے درمیان تھی جو کئی نسلوں سے طوائفیت کے پیشے سے منسلک تھا۔ ان سے واقفیت نے آگے چل کر میرے لیے بہت سے دروازے کھولے جن سے گزر کر میں اِس پیشے اور یہاں کے لوگوں کے پیچیدہ رشتوں کو سمجھ سکی۔

میرے سامنے کوئی چھ برس کی بچی کھڑی کسی اپنی ہی انجانی دھن میں ہولے ہولے جھوم رہی تھی۔ اس نے مجھ پر تجسس بھری نگاہ ڈالی اور ویسے ہی جھومتی رہی۔ میں نے اس سے کہا: ''میں لیلیٰ کی دوست ہوں اور اس سے ملنے آئی ہوں۔'' بچی نے مجھے صوفے پر بٹھایا اور خود ایک سیاہ کھردرے سوتی پردے کے پیچھے دوڑ گئی جہاں شاید اس گھر کا بقیہ حصہ تھا۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے میں نے دیکھا کہ جانے والے ایک راستے کے پیچھے وہ زینہ جس سے میں یہاں پہنچی تھی، اور کہیں اوپر جا رہا تھا۔ میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔ کمرے میں قالین بچھا تھا اور مغربی طرز کا صوفہ سیٹ بھی پڑا ہوا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ چوبی جھروکے بنے ہوئے تھے جن کے عقب میں سڑک پر کھلنے والی طویل اور تنگ بالکنی تھی۔ جھروکوں پر چقیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا: ''فلموں میں ایسا ہی منظر دکھایا جاتا ہے۔ شام کے وقت بناؤ سنگھار کر کے، گاہکوں کو لبھانے کے لیے یہ عورتیں ان جھروکوں میں ہی کھڑی ہوتی ہوں گی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ ڈرائنگ روم ہی شاید ''کوٹھا'' ہے لیکن یہ جگہ فلموں کے مقابلے میں زیادہ جدید طرز پر سجی ہوئی لگ رہی تھی اور اتنی وسیع اور کشادہ بھی نہیں تھی جیسی فلموں میں دکھائی جاتی ہے۔ پھر میں نے اپنے دماغ کو ڈانٹ پلائی۔ ''بس اب خاموش ہو جاؤ۔ میں محقق ہوں، یہاں تحقیق کرنے آئی ہوں۔ اس جگہ کے بارے میں اپنے روایتی خیالات کی تصدیق کرنے نہیں آئی ہوں۔'' میں نے دل کو سمجھایا: ''کھلی آنکھوں سے ہر شے کا مشاہدہ کرو اور جب تک تسلی بخش کوائف جمع نہیں ہو جاتے، کسی بات کا خواہ مخواہ کوئی مطلب ہرگز اخذ نہ کرو!''۔

یہاں کی دیواریں بھی مجھے بڑی عجیب اور دلچسپ لگ رہی تھیں۔ داخلی دروازے کے عین سامنے دیوار پر ایک بڑا سا آئینہ ترچھا آویزاں تھا۔ دیواروں پر عورتوں کی تصویریں بھی لگی ہوئی تھیں۔ دو تصویریں پرانے زمانے کی لگ رہی تھیں جب رنگین فوٹو گراف نہیں ہوتے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا: جالی کے دوپٹے اور بال بنانے کے پرانے انداز... وہ یقیناً ۱۹۳۰ء کے آس پاس کھینچی ہوئی تصویریں تھیں۔

کچھ دیر بعد کمرے میں ایک پختہ عمر کی عورت داخل ہوئی۔ کھڑا ناک نقشہ، گوری چٹی، ناک میں سونے کی لونگ، معمولی سوتی شلوار قمیض میں ملبوس، ململ کا دوپٹہ جس سے اس نے سر ڈھانپ رکھا تھا اور چہرے مہرے سے تجربہ کاری جھلک رہی تھی۔ اس نے شائستگی سے میرا خیر مقدم کیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کو میرے بارے میں پہلے سے بتا دیا گیا ہے۔ اس بات کی اس نے تصدیق بھی کی۔

''لیلیٰ نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا ہے۔'' اس نے کہا۔

مہمان نوازی کے چند جملوں کے بعد اس نے کہا کہ لیلیٰ کے لیے صبح کے وقت اٹھنا بڑا مشکل

ہوتا ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ دوپہر کا ایک بج رہا ہے۔ یہ صبح کا وقت کہاں ہے!

اس عورت کے ٹھیٹھ پنجابی لہجے سے مجھے بڑا مزا آ رہا تھا۔ میرے کانوں کو اس میں مشرقی پنجاب کے لہجے کا زیر و بم صاف محسوس ہو رہا تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ وہ ساری عمر لاہور ہی میں رہی ہے۔ اس موقع پر میں نے اس کے ماضی کے بارے میں کریدنا مناسب نہیں سمجھا اس لیے موضوع بدل کر میں اس کے بال بچوں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹے کی شادی ہوگئی ہے اور اس کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے بھی ہیں۔ میں نے پوچھا:

''بیٹا آپ ہی کے ساتھ رہتا ہے؟''

''ہاں'' اس نے جواب دیا۔ ''میرا بیٹا میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اسے تو کاروبار کے سلسلے میں اکثر باہر جانا پڑتا ہے مگر میری بہو اور اس کے بچے ہمیشہ یہیں ہوتے ہیں۔''

میں اس عورت سے بالکل عام سی گفتگو کر رہی تھی جو پرانے شہر میں سب ہی پہلی بار ملنے پر ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ اس سے میں نے ابھی تک کوئی تحقیقی سوال نہیں کیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنی کہی باتوں سے مطمئن ہے اور اب میرے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتی ہے۔

اپنے بارے میں بنیادی باتیں میں پہلے ہی اُسے بتا چکی تھی کہ میں اسلام آباد میں رہتی ہوں، لوک ورثہ میں کام کرتی ہوں اور اس علاقے پر تحقیق کر کے یہاں کے بارے میں لکھنا چاہتی ہوں۔ میں یہ بتا چکی تھی کہ لاہور ہی میں اپنے چچا کے گھر ٹھہری ہوں۔ مجھ پر سر سے پیر تک ناقدانہ نظر ڈال کر اس نے پوچھا: ''تسی بھاء صادق نوں کیویں جاندے او؟'' (آپ بھائی صادق کو کیسے جانتی ہیں؟)

''ہمارے کچھ ساجھے دوست ہیں۔'' میں نے اعتماد کے ساتھ کہا۔

میں نے میراثی خاندانوں کے کچھ مشہور موسیقاروں اور گلوکاروں کے حوالے دیئے تو وہ مسکرا کر سر ہلانے لگی جیسے مطمئن ہوگئی ہو۔ پھر اس نے پنجابی میں کہا:

''تم ہماری مہمان ہو اور میری بیٹی جیسی ہو۔ بتاؤ، تمہاری کیا خدمت کر سکتے ہیں ہم؟''

یہ سن کر میں تو کھل ہی اٹھی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ ان کے اندرونی نظام کی سُن گُن لینا بڑا ہی مشکل کام ہوگا۔ اس وقت میں بالکل نہیں جانتی تھی کہ ان محترمہ کی یہ ملنساری صرف دکھاوا ہے اور مجھ جیسی تحقیق کرنے والیوں کو تو وہ چٹکیوں میں اُڑا سکتی ہے۔ وہ کسی کو بھی اصل معلومات حاصل کر کے اپنے مضامین چمکانے کی اجازت دینے والی نہیں تھی۔

لیلیٰ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے کسا ہوا گہرا نیلا فلیٹ کریپ کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس

کا رنگ اپنی ماں سے ذرا دبتا ہوا تھا۔ ابھرے ہوئے ہونٹ نارنجی لپ اسٹک سے اور بھی نمایاں ہوگئے تھے۔ اس نے ہلکا سا میک اپ کر رکھا تھا۔ اس نے سفید پوڈر اور آئی لائینر لگایا ہوا تھا۔ مجھ سے بغلگیر ہو کر اس نے کہا:

''میں نے امی جی کو بتایا تھا کہ میری دوست مجھ سے ملنے آئے گی۔''

میں پوری کوشش کر رہی تھی کہ اِن دونوں کو میرا رویہ دوستانہ لگے اور وہ کسی سوال سے گھبرا کر بدک نہ جائیں۔ (خوش قسمتی سے دیکھنے میں، مَیں کوئی بارعب، خوفزدہ کرنے والی شخصیت نہیں لگتی ہوں)۔ لیلیٰ کی ماں نے اُسے دیکھ کر کہا: ''ایہہ لاہور دی اے، پیراں وچ کھُسّا ویکھیا؟'' (یہ لاہور کی ہے، پیروں میں کھُسّا نہیں دیکھا؟)

اس کا یہ تبصرہ میرے لیے اہم تھا۔ مجھے اس سے علم ہوا کہ وہ کن چیزوں پر دھیان دے رہی ہے۔

لیلیٰ نے مجھے دیکھ کر کہا ''ہاں! اس دن صادق بھائی کے گھر ہی مجھے خیال آ رہا تھا کہ یہ اسلام آباد کی تو بالکل نہیں لگتی۔''

میں نے پوچھا: ''اسلام آباد کی عورتیں کیسی ہوتی ہیں؟''

لیلیٰ کی ماں نے فوراً کہا: ''گِٹ پِٹ گِٹ پِٹ کردیاں نیں۔'' (گِٹ پِٹ گِٹ پِٹ کرتی یعنی انگریزی بولتی ہیں)

میں ہنس پڑی۔ لیلیٰ نے کہا: ''ہاں! جبکہ تم تو بڑی سوہنی پنجابی بولتی ہو۔'' وہ میرے نزدیک آ گئی اور اپنی ماں سے کہنے لگی ''امی! اس کے بال کتنے پیارے ہیں! اتنے لمبے اور سوہنے!!

میں دل ہی دل میں اطمینان کا سانس لے رہی تھی کہ میری کسی بات نے انہیں ناراض نہیں کیا اور ہولے ہولے وہ مجھ سے بے تکلف ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن بظاہر بڑی خوشگوار ادھر ادھر کی باتوں کے دوران میرے اندر چھپی ہوئی محقق پوری طرح چوکنا تھی اور مشاہدہ کر رہی تھی کہ وہ کیسے الفاظ استعمال کر رہی ہیں۔ چہرے پر تاثرات کیسے ہیں؟ ان کی آنکھوں کی جنبش کس طرح کی ہے؟ لہجہ کیسا ہے؟ میں نے غور کیا کہ ایک چھ برس کی بچی اور ایک بچہ جس کی عمر چار برس کی رہی ہوگی۔ یونہی بلا سبب ادھر ادھر گھوم رہے ہیں جیسے ان کے پاس دوسرا کوئی شغل ہی نہ ہو۔ ان کی دادی کبھی کبھار ان کو کسی کام سے باہر بھیج دیتی تھی۔ اس نے بچی سے بازار سے چائے منگوائی۔ یہ چھوٹا سا کام تھا۔ بچی سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی اور دروازے سے اس نے آواز لگا دی۔

''چار چائے جلدی اوپر لاؤ۔''

دکان والا چائے لے آیا، پھر خالی گلاس واپس بھی لے گیا۔ میں نے لاکھ کہا کہ میں چائے

نہیں پیتی مگر انہوں نے میرے لیے چائے منگوا ہی لی۔ گرما گرم بالائی والی چائے کا گلاس میرے سامنے دھرا رہا۔ میں نے اکثر سوچا ہے کہ اگر میں چائے کی عادت ڈال ہی لیتی تو اچھا رہتا۔ تحقیقی سلسلے میں کسی نئے گروپ سے دوستانہ تعلق پیدا کرنے میں یہ سب سے پہلی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے کہ میں ان کے ساتھ چائے نہیں پی سکتی۔ ہر بار مجھے ہوشیاری سے یہ رکاوٹ پار کرنی پڑتی ہے۔ گاؤں میں جب بھی میں نے چائے پینے سے انکار کیا ہے، انہوں نے یہی مطلب لیا ہے کہ میں ان کے برتن میں چائے نہیں پینا چاہتی۔ گاؤں والوں کی اجتماعی یادداشت میں وہ زمانہ اب بھی موجود ہے جب دوسرے مذہب یا ذات والوں کے برتن الگ ہوتے تھے۔ یہ تاثر مٹانے کے لیے میں ہمیشہ پینے کے لیے پانی مانگ لیتی ہوں۔ اس سے چھوت کا تاثر تو ختم ہو جاتا ہے مگر مجھے کبھی کبھی بڑا گدلا پانی پینا پڑا ہے جس میں جانے کیا کیا اَلا بَلا تیرتی نظر آتی ہے۔ چائے کا پانی کم از کم اُبلا ہوا تو ہوتا ہے۔ مجھے فیلڈ ریسرچ کرنے مگر چائے نہ پینے کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

''دیکھو! تم میری دوست ہو تو میری والی چائے بھی پی لو۔''

''مجھے بس ایک گلاس ٹھنڈا پانی چاہیے۔ بہت گرمی ہے اور مجھے پیاس لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

انہوں نے جھٹ پٹ میرے لیے سیون اپ کی بوتل منگا کر مجھے شرمندہ کر دیا۔ لاہور میں مہمانوں کو سادہ پانی پلانا شاید معیوب سمجھا جاتا ہے۔ خیر! اس خاطر تواضع سے جان بچانے کے لیے میں نے کہا:

''چلو آج میرے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کر لو مگر آئندہ یہ سب نہیں ہوگا۔''

لیلیٰ کی ماں سے میں نے کہا:

''آپ نے تو مجھے بیٹی کہا ہے تو پھر سلوک بھی ویسا ہی کیجیے، مہمان تو نہ بنایئے۔'' لیلیٰ کی ماں اس بات پر خوش ہوئی۔ میں نے موسیقی کا موضوع چھیڑ دیا اور لیلیٰ سے پوچھا کہ اسے کیسی موسیقی پسند ہے؟

لیلیٰ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''انڈین فلمی گانے!'' اس نے کہا۔

لیلیٰ نے نہ اپنے محلے کے کسی بڑے ''استاد'' کا نام لیا اور نہ ہی کسی مشہور پاکستانی گائیک یا گائیکہ یا شاعر کا ذکر کیا۔ اپنی پسند کے جو گیت اس نے گنوائے، اسے ان کے بول یاد تھے اور یہ بھی معلوم تھا کہ گیت کس فلم کا ہے لیکن گیت کے شاعر یا موسیقار کا اس نے کوئی ذکر نہیں کیا۔

میں اس محلے کے فنکاروں سے ماضی میں بات چیت کر چکی تھی۔ یہ میرا تجربہ تھا کہ موسیقی
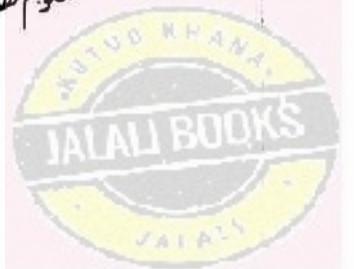
سے تعلق رکھنے والے تمام فنکار کسی گیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کم از کم موسیقار کا نام ضرور بتاتے تھے اور اگر غزل کا ذکر ہو تو شاعر کا تذکرہ کرتے تھے۔ لیلیٰ کی گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ موسیقی اور گائیکی اس کی زندگی میں دراصل کتنی کم اہمیت رکھتی ہیں۔

میں نے لیلیٰ سے پوچھا ''اس محلے سے تو بڑے بڑے فنکار نکلے ہیں۔ ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

لیلیٰ نے کہا ''میں بھی اُن جیسی بننا چاہتی ہوں۔''

''کس جیسی؟ مجھے کوئی مثال تو دو...'' میں نے پوچھا۔

''ریما جیسی!'' لیلیٰ نے کہا۔ ''وہ بڑا اچھا ناچتی ہے۔ کتنی مشہور ہوگئی ہے نا!! لیکن صرف اس سے کام نہیں چلتا۔ آگے بڑھنے کے لیے جان پہچان بھی ہونی ضروری ہے۔''

اس جواب سے لیلیٰ کی دلچسپی کا اصل مرکز سامنے آیا۔ اس کی نظر موسیقی پر نہیں اداکاری پر لگی ہوئی تھی۔

ایک اور دن جب میں لیلیٰ کے گھر آئی اور قیصرہ سے اس محلے کے ''دھندے'' کے بارے میں گفتگو کرنے لگی تو اس نے کہا:

''ہم 'برا کام' نہیں کرتیں۔ میرا باپ بہت بڑا آدمی تھا۔ اسے تو دوسرے 'محلوں' کے لوگ بھی جانتے تھے۔ وہ ہم دونوں سے بڑا پیار کرتا تھا۔''

''دونوں سے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں! لیلیٰ کی ماں نے لاپرواہی سے کہا ''مجھ سے اور میری بہن سے''

''بڑی بہن یا چھوٹی بہن؟'' میں نے پوچھا۔

لیلیٰ کی ماں ہچکچا گئی۔ لگتا تھا کہ اس سلسلے میں وہ مجھے زیادہ معلومات دینا نہیں چاہتی۔ اس نے بے دلی سے جواب دیا ''بڑی'' اور پھر جلدی سے اپنی کہانی پر واپس پلٹ آئی۔

''ہماری بڑی اعلیٰ تربیت کی گئی تھی۔ ہم دونوں خوبصورت تھیں، تمیز سے بولنا چالنا، اٹھنا بیٹھنا... سب کچھ سکھایا گیا تھا۔ لوگ تعریفیں کرتے تھے کہ لڑکیوں کی کتنی اچھی تربیت کی ہے۔ 'برا کام' تو ہم نے کبھی کیا ہی نہیں۔ میرا باپ بھی یہ اونچا لمبا، بڑا خوبصورت تھا۔ یہ بڑی پگڑی باندھتا تھا۔ پٹھان جو تھا! گہرا سبز کرتا پہنتا تھا۔ بڑا حسین آدمی تھا میرا باپ!''

''لگتا ہے آپ اس کو بہت پیاری تھیں۔'' میں نے کہا۔

یہ سن کر قیصرہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی جیسے وہ یادوں میں کھو گئی ہو جو اس کے

سینے میں کہیں گہری دفن تھیں۔ میری بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اُسے اپنی یادوں میں گُم رہنے کا موقع دیا اور کچھ دیر تک خاموش رہی۔ پھر میں نے کہا:

''کیا اپنے بچوں کی تربیت بھی آپ نے اسی طرح کی ہے؟''

قیصرہ کے چہرے پر ایک عجیب نفرت بھرا تاثر ابھر آیا۔

''نہیں!'' اس نے زور سے کہا۔ ''زمانہ بدل گیا ہے جی۔ لوگ جو مانگتے ہیں وہ بھی بدل گیا ہے، لڑکیاں بھی بدل گئی ہیں۔ سب کچھ بدل گیا ہے!''

میرے لیے معلومات حاصل کرنے کا یہ سنہرا موقع تھا۔ میں نے بات آگے بڑھانے کی کوشش کی اور پوچھا:

''کس طرح؟''

قیصرہ نے مجھے شاطر نگاہوں سے دیکھا گویا کہتی ہو کہ اگر مجھ سے کچھ اگلوانے کی کوشش کر رہی ہو تو ابھی سے صبر کرلو۔ میں کچی گولیاں کھیلی ہوئی نہیں ہوں۔ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے اس نے بڑے شیریں لہجے میں پوچھا:

''کچھ پینے کے لیے منگواؤں آپ کے لیے؟''

مجھے محسوس ہوا کہ میں بے صبری دکھا رہی ہوں اور قیصرہ کے اندر ابھی اپنے منہ پر آئی باتیں پی جانے یا مجھ سے کہہ دینے کی کشمکش جاری ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھ سے مہمانوں جیسا سلوک نہ کرے۔ یہ ان کے گھر میرا تیسرا پھیرا تھا۔

اتنی دیر میں لیلیٰ بھی آ گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اصرار سے پوچھنا شروع کر دیا کہ میں کیا پیوں گی۔ آخر میں نے ہار مانتے ہوئے کہا کہ کوک چلے گی۔

وہ ہنسنے لگی۔ ''اچھا! تو تم پینڈو ہو۔'' یہ بات اسے اچھی لگی تھی کہ میں نے کچھ پینے کی فرمائش کر دی تھی۔ اب مجھ سے مذاق کر کے وہ زیادہ نزدیک آنے کا راستہ کھول رہی تھی۔

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

لیلیٰ صوفے پر دراز ہوگئی۔ اس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھ کر شرارت سے گاڑھے پنجابی لہجے میں کہا:

''کوک تو پینڈو پیتے ہیں۔ اونچے لوگ تو سپرائٹ یا سیون اَپ پیتے ہیں۔'' میں اس کی ہنسی میں شامل ہوگئی۔ ''ہاں! میں پینڈو ہوں۔ مجھے تو کوک ہی پسند ہے۔ پتا ہے، گھر پر تو میں دودھ ہی پیتی ہوں۔ یہاں کوک ہی مانگ رہی ہوں۔ تمہیں یہ بتانے کے لیے کہ میں بھی 'ماڈرن' ہوں۔''

ہم دونوں ہنس رہی تھیں لیکن لیلیٰ کی ماں اس ہنسی میں شریک نہیں ہوئی۔ اسے ہماری بے تکلفی پسند نہیں آ رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لیلیٰ مجھ سے دوستی بڑھائے۔ وہ ہمارے درمیان ایک دیوار قائم رکھنا چاہتی تھی تاکہ اس خاندان کے اصل پیشے کے بارے میں مجھے معلومات نہ مل سکیں، اس لیے تیوری پر بل ڈال کر اس نے لیلیٰ سے کہا:

''تم اندر جا کر وہ کام کرو جس کے لیے میں نے کہا ہے۔''

لیلیٰ کا میرے پاس بیٹھنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ لیلیٰ سے چھٹکارا حاصل کر کے تنہائی میں وہ مجھے اس خاندان کی ''پاکبازی'' کے بارے میں کچھ مزید داستانیں سنا کر پوری طرح یقین دلانا چاہتی ہے۔

لیلیٰ نے ہنستے ہنستے ماں سے چوری چوری مجھے آنکھ ماری اور سنجیدہ منہ بنا کر پوچھا: ''کون سا کام امی جی؟''

وہ جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی مگر قیصرہ نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا اور کہا: ''یاد نہیں صبح میں نے کس کام کو کہا تھا؟''

لیلیٰ نے بھولا سا منہ بنا کر کہا۔ ''نہیں امی جی''

قیصرہ نے پاس پڑا ایک کشن اٹھا کر لیلیٰ پر دے مارا۔ لیلیٰ ہنستی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ پردہ اٹھا کر دوسرے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اس نے دوبارہ مجھے آنکھ ماری۔

مجھ سے بات چیت کرنے کے لیے لیلیٰ کے دل میں ایک اشتیاق جاگ گیا تھا۔ وہ مجھ سے ذاتی دوستی کرنا چاہتی تھی جبکہ قیصرہ کی پوری کوشش تھی کہ لیلیٰ کو مجھ سے ایک فاصلے پر رکھے۔ ظاہر ہے کہ اس موڑ پر اس سے بحث کرنا یا یہ ظاہر کرنا کہ میں ان کی حقیقت سے واقف ہوں، میرے کام کے لیے نقصان دہ ہوسکتا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ میرے تعلقات سب سے دوستانہ رہیں تاکہ وہ مجھ پر بھروسا کرنے لگیں۔ اس لیے میں نے قیصرہ سے پوری توجہ کے ساتھ گفتگو شروع کر دی اور اس کے پس منظر اور اس محلے کے باسیوں کے بارے میں معمولی سوالات پوچھنے لگی۔

لیلیٰ کی ماں نے پھر وہی کہانی دہرائی۔ اس نے کہا: ''او جی، محلے والے کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں کرتے، مجھے کیا خبر! میں نے تو برسوں سے گھر سے باہر قدم بھی نہیں رکھا ہے۔ جو کچھ مجھے باہر سے منگوانا ہوتا ہے وہ بچے اور یہ جھلا (پگلا) نوکر لا دیتے ہیں۔ میں تو کہیں آتی جاتی ہی نہیں ہوں۔ میں نے تو جی اپنی بیٹیوں سے بھی کہہ رکھا ہے کہ بُرا کام کبھی نہ کریں۔''

''آپ کا ذریعہ آمدنی کیا ہے؟'' میں نے سادگی سے پوچھا۔

قیصرہ نے بڑے فخر سے کہا ''اس عمارت کا کرایہ جو آتا ہے۔''

پھر وہ دوبارہ اپنے باپ کا ذکر کرنے لگی۔ اس نے کہا کہ یہ بلڈنگ اسے اس کے باپ نے ترکے میں دی ہے۔ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ گوبا نامی ایک ملازم تھا۔ میلے کپڑوں میں یہ ایک پست قد نوجوان تھا جو ذہنی طور پر کچھ معذور معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی گردن ذرا ٹیڑھی تھی اور وہ ہکلاتا بھی تھا۔ اس کی کہی ہوئی بات میرے تو ذرا بھی پلے نہیں پڑی مگر دوسرے لوگ اس کی بات سمجھ سکتے تھے۔ اس گھرانے میں وہ ایک عجیب وغریب کردار تھا۔

لیلیٰ بڑی ہوشیاری سے یہ موقع غنیمت جان کر دوبارہ کمرے میں آ پہنچی۔ گوبے کے ہاتھ سے کوک کی بوتل لپک کر اس نے مجھے پیش کی جسے میں نے مسکرا کر قبول کر لیا۔ میری مسکراہٹ سے لیلیٰ کی ہمت بڑھی۔ ماں کی طرف دیکھے بغیر وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ پھر اس نے انگریزی میں مجھ سے کہا۔

''میں انگریزی بول لیتی ہوں۔ دو برس کالج میں پڑھا ہے میں نے۔ تم مجھ سے انگریزی میں بات چیت کر سکتی ہو۔''

میں نے اس کی تعریف کی۔ نہ جانے وہ مجھے مرعوب کرنا چاہ رہی تھی یا واقعی مجھے بتا رہی تھی کہ ہم انگریزی میں بات چیت کر سکتے ہیں اور اس کی ماں کو علم نہ ہوگا کہ ہم کیا باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے بہرحال اس سے انگریزی میں باتیں نہیں کیں اور صرف اس کی تعلیم کی تعریف کرنے پر اکتفا کیا۔

قیصرہ نے پھر لیلیٰ کو ٹالنے کا بہانہ ڈھونڈا۔ اس نے لیلیٰ سے کہا: ''ذرا گوبے سے ناشتہ تو منگوالو۔''

لاہور کے پرانے شہر میں ناشتہ کسی گھر میں تیار نہیں کیا جاتا۔ یہاں کے سب باسی ناشتہ بازار ہی سے منگواتے ہیں۔ یہاں بے حد لذیذ کھانے ملتے ہیں جو ناشتے میں کھائے جاتے ہیں۔ لیلیٰ اُڑ گئی اور دوپٹے کے آنچل سے کھیلتے ہوئے کہنے لگی:

''مجھے نہیں پتا! کیا منگواؤں، آپ خود منگوالو ناشتہ۔''

بیزار ہو کر قیصرہ شاید پیسے لینے کے لیے اندر چلی گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے گوبا بھی چلا گیا۔

اکیلے ہوئے تو میں نے اور لیلیٰ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں کافی عرصے سے لیلیٰ سے کچھ سوال کرنا چاہ رہی تھی مگر موقع ہی نہ ملتا تھا۔ شاید مجھے اس کے کھلنے کا مزید انتظار کرنا چاہیے تھا۔ لیکن لیلیٰ کئی بار اشارہ دے چکی تھی کہ وہ مجھ سے بات چیت کرنے کے لیے تیار ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی کلائی پر پڑے دس بارہ نشانوں کو دیکھا۔ میں نے پہلے دن سے ان نشانات کو دیکھ لیا تھا اور میں دن رات ان کے بارے میں سوچتی تھی۔ یہ نشان بلیڈ سے کاٹنے پر نہیں پڑے تھے لیکن یہ جس جگہ تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ لڑکی نے خودکشی کی کوئی نیم دلانہ

کوشش کی ہے۔

''یہ کیا ہوا تھا لیلیٰ؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کہا ''بتا دوں گی۔ میں سب کچھ بتا دوں گی۔ لیکن یہاں ہم بات چیت نہیں کر سکتے۔ تم سے کہیں اکیلے میں ملاقات کرنا پڑے گی۔''

''یہاں کیوں نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا: ''اگر ان کو پتا چل گیا کہ میں تمہیں ایسی باتیں بتا رہی ہوں تو یہ پھر مجھ کو تم سے کبھی نہیں ملنے دیں گے۔''

''کیا ہم کہیں اکیلے میں مل سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں! یہ تو مجھے ذرا سی دیر کے لیے بھی اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹنے نہیں دیتے۔ تم نے دیکھا نہیں؟ تمہارے پاس بیٹھنے تک نہیں دیتے۔''

اس نے اپنی ماں کی نقل اتاری ''—'اندر جاؤ! صبح میں نے کام کہا تھا!'— کیسی صبح؟ ابھی ابھی تو میں جاگی ہوں!!''

اتنی دیر میں قیصرہ اندر آ چکی تھی۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگی۔ ''کیا منگاؤں ناشتے میں؟''

میں نے ہنس کر بتایا کہ ''میرے حساب سے تو دوپہر کے کھانے کا وقت بھی گزر چکا اور آج میں نے دوپہر کا کھانا جلدی کھا لیا تھا۔''

قیصرہ نے کہا: ''یہ بہانہ نہیں چلے گا۔ آئندہ کبھی یہاں کھانا کھا کر نہ آنا۔'' اس نے اپنائیت جتاتے ہوئے تاکید کی۔

لیلیٰ نے بات کاٹ کر کہا ''تم نے بتایا تھا کہ تم دودھ پیتی ہو۔ ہمارے بازار کا دودھ تو دنیا میں مشہور ہے۔ پستے بادام والا ہوتا ہے جی!''

قیصرہ نے کہا ''دنیا کی تجھے کیا خبر؟''

لیلیٰ نے طعنے کا فوراً جواب دیا ''مجھے کیوں خبر نہیں؟ کالج جاتی رہی ہوں۔ وہاں سب کچھ پڑھاتے تھے۔''

قیصرہ نے فقرہ کسا ''ہاں ہاں! کالج میں شاہی محلے کے دودھ کے بارے میں ہی تو پڑھاتے ہوں گے!''

لیلیٰ نے اِٹھلا کر جواب دیا ''دنیا کی خبر تو تمہیں ہے؟ دنیا تو جیسے تم نے دیکھی ہے! کالج میں کیا پڑھاتے ہیں یہ تم کیا جانو؟'' اتنا کہہ کر بات ختم کرنے کے لیے وہ فوراً مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''پی لو دودھ فوزیہ۔ بڑا اچھا ہوتا ہے۔''

ماں بیٹی کے درمیان بڑھتا تناؤ دیکھ کر میں نے لیلیٰ کی بات فوراً مان لی۔ اس نے گوبے سے ٹھنڈے دودھ کے دو گلاس منگوا لیے۔ ایک اپنے لیے اور دوسرا میرے لیے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا: ''میں پڑھائی میں اچھی تھی۔ بی۔ اے بھی کر لیتی مگر امی نے کہا کہ کالج کے دو سال ہی بہت ہیں۔ بس میں نے ایف۔ اے تک ہی پڑھا'' کچھ لمحہ توقف کے بعد اس کی آنکھوں میں ایک چمک آئی اور وہ اپنی ماں کے پاس جا کر بولی: ''امی، فوزیہ کہہ رہی ہے کہ ہمیں اپنی کار میں سیر کرانے لے جائے گی۔''

قیصرہ یہ سُن کر کچھ گھبرا گئی۔ جلدی میں اُسے کوئی بہانہ نہیں سوجھ رہا تھا کہ وہ بات کو کیسے ٹالے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے، لیلیٰ نے اصرار کرنا شروع کر دیا: ''آج موسم بھی اتنا اچھا ہے۔ دیکھو ناں! ہم کتنے دنوں سے کہیں گئے بھی نہیں۔''

پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے مجھ سے کہا: ''باہر جائیں تو واپسی پر اتنی مشکل ہوتی ہے۔ رکشا والوں سے کہیں کہ شاہی محلّہ جانا ہے تو وہ ہزار سوال پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔ بری بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ دو کوڑی کی عزت ہو جاتی ہے۔ میں تو کسی آس پاس کے محلے کا پتا بتا دیتی ہوں اور پھر گھر تک پیدل آتی ہوں۔''

لیلیٰ اتنی بے باکی سے مجھ سے یہ بات کہہ رہی تھی کہ قیصرہ بھڑک اٹھی۔ اس نے کہا ''کیا بکتی ہے۔'' پھر خود پر قابو پا کر بولی: ''او جی! میں تو باہر جاتی نہیں ہوں۔ مجھے کیا پتا! ہوتا ہوگا اس کے ساتھ ایسا...''

لیلیٰ پھر پانچ سالہ بچی کا روپ دھار کر ضد کرنے لگی ''چلو ناں! چلو امی۔'' اس کا اصرار دیکھ کر میں نے بھی لیلیٰ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ لیلیٰ اگر میرے ساتھ تنہائی میں بات چیت کرنا چاہتی تھی تو پھر سارا خاندان ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی! بہرحال، لیلیٰ نے سب کو لارنس گارڈن چلنے پر راضی کر لیا۔

سب کی تیاری میں دو گھنٹے لگے۔ یہ بڑا دلچسپ منظر تھا۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے کو دوڑ رہی تھیں اور ایک دوسرے سے پکار پکار کر چیزیں مانگ رہی تھیں۔

میں کمرے میں بیٹھی خاموشی سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہاں کی ایک ایک شے کے بارے میں مجھے ایسا تجسس محسوس ہوتا تھا کہ میں کئی دن صرف مشاہدہ کرتے ہوئے گزار سکتی تھی۔ دیوار پر لگی ہوئی بیتے وقتوں کی یادگار دو بڑی بڑی تصویریں میرے تجسس کو ابھار رہی تھیں۔

پھولائے ہوئے بالوں کے پف، پرانے انداز کے دیدہ زیب لباس... یہ سب گئے وقتوں کی فلمی اداکاراؤں کی تصویریں معلوم ہوتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان آنکھوں میں کئی راز سربستہ ہیں۔ ان کی کہانیاں معلوم کرنے کے لیے میں بہت اشتیاق محسوس کر رہی تھی۔

سب سے پہلے قیصرہ تیار ہو کر میرے ساتھ آ بیٹھی۔ وہ کہنے لگی کہ خاندان میں یہ اپنی قسم کا پہلا واقعہ ہے۔ وہ کبھی کسی کے ساتھ باہر نہیں جاتے۔ اس نے کہا، ''ہمارا تو یہ قاعدہ ہے کہ جو چاہیے ہوتا ہے وہ گھر پر ہی منگوا لیا جاتا ہے۔ ہم تو ہسپتال کے علاوہ کہیں بھی نہیں جاتے۔ ہر چیز کی دکان پڑوس میں ہی ہے۔ درزی تک گھر آ جاتا ہے۔ میں تو اپنے پوتے پوتی کو بھیج کر سب کچھ بازار سے منگوا لیتی ہوں۔ ہم کہیں باہر نہیں جاتے۔''

میں نے اس سے کہا کہ میں بہت خوش ہوں کہ وہ اپنے خاندان کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دے رہی ہیں۔

ہم گھر کی سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آئے تو پورے بازار کی نگاہیں ہم پر مرکوز ہو گئیں۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں ان سب کو کہاں لے جا رہی ہوں۔ قیصرہ نے ایک سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ لیلیٰ نے بے حد چست اُودا شلوار قمیض کا جوڑا پہن رکھا تھا جس کا گریبان کافی کھلا ہوا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ گریبان سے جھانکتے بدن کو ڈھانپے یا نہیں۔ اسی تذبذب میں وہ کبھی دوپٹے کو ٹھیک سے اوڑھتی اور کبھی گردن کے گرد لپیٹتی چلی جا رہی تھی۔ کبھی وہ یوں گہرے گہرے سانس لینے لگتی جس سے بدن کے نشیب و فراز اور بھی نمایاں ہو جائیں۔ جب ہم کار میں بیٹھنے لگے تو لیلیٰ فوراً اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی تاکہ سب لوگ دیکھ لیں کہ وہ کار میں کسی کے ساتھ جا رہی ہے۔ ہم ٹکسالی گیٹ کی طرف جا رہے تھے اور وہ معائنہ کرتی جا رہی تھی کہ وہ کون خوش نصیب لوگ ہیں جن کو یہ منظر دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے کہ وہ اپنی دوست کی سفید ٹویوٹا کار میں سوار کہیں جا رہی ہے۔ جو لوگ یہ منظر دیکھنے سے محروم رہ گئے ان کی بدقسمتی پر لیلیٰ کو افسوس ہو رہا تھا۔ اس کا یہ عالم دیکھ کر مجھے خود محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں اس کو رولز رائس میں لیے جا رہی ہوں۔

ہم نے گاڑی کو لارنس گارڈن میں کھڑا کیا اور ٹھنڈی بوتلیں پینے کے لیے قریبی کھوکھے کا رخ کیا۔ لاہور کے باسیوں کے لیے باغات بڑے پرانے زمانے سے تفریح کا ذریعہ بنے رہے ہیں۔ مغلوں کے بعد انگریزوں کے دور میں بھی ان کی اچھی دیکھ بھال کی جاتی رہی ہے۔ ان کے بعض درخت تو اتنے بلند و بالا ہیں کہ بچے انہیں دیکھ کر ڈر جائیں۔ ان کی قدیم شاخوں میں اتنی بڑی بڑی چمگادڑوں کا بسیرا ہے جن کے پَر کوئی دو دو فٹ کے ہوں گے۔ یہاں جا بجا کھلے مقام ہیں

جہاں سیمنٹ کی نشستیں ہیں۔ ایک چھوٹی سی مصنوعی پہاڑی سبزے اور پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ کئی باغیچے منسلک ہیں۔ خوبصورت پگڈنڈیاں ہیں اور کھلے میدان میں ثقافتی پروگرام وغیرہ کرنے کے لیے ایک تھیٹر بھی ہے۔

سب سے پہلے لیلیٰ نے ٹھنڈی بوتل اور آئس کریم کی فرمائش کی۔ میں نے بڑی خوشی سے اس کی فوراً تکمیل کی۔ آخر یہ ان کا مجھ پر احسان ہی تو تھا کہ ایک ہفتے کی شناسائی میں پورا خاندان میرے ساتھ آنے پر رضامند ہو گیا تھا۔ یہ میری بڑی کامیابی تھی۔ ٹھنڈی بوتلیں ختم کر کے ہم نے کھوکھے کے ایک لڑکے سے آئس کریم منگوائی۔ لیلیٰ نے بڑے شوق سے اپنی ماں سے کہا ''آج موسم بڑا ہی اچھا ہے۔ چلو پہاڑی کے گرد چکر لگاتے ہیں۔''

قیصرہ حیران رہ گئی۔ پھر بولی ''میری صحت کا حال تم جانتی ہو۔ میں نہیں چل سکتی۔''

ماں کو ہوشیاری سے بے بس کرنے کے لیے تاکہ وہ اسے منع کر ہی نہ سکے، جلدی سے لیلیٰ نے کہا ''ہائے یہ تو بڑا بُرا ہوا... تو تم یہاں بیٹھ جاؤ، ہم ابھی چکر لگا کر آتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی ماں کو ایک بنچ پر آرام سے بٹھا دیا اور ہم اس کے بغیر چل دیے۔

قیصرہ نے پکار کر کہا کہ لیلیٰ اپنی بھتیجی کو ساتھ لے لے۔ لیلیٰ نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا گویا کہتی ہو ''یہ تو میری بھی ماں ہے۔ کوئی نہ کوئی ترکیب تو اس نے ضرور سوچنی تھی کہ ہم دونوں اکیلے ساتھ نہ رہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اس سے چھٹکارا مل جائے تو چھ برس کی بچی سے نمٹنا ہمارے لیے ایسی مشکل بات نہ ہوگی۔''

جونہی ہم قیصرہ کی نظروں سے اوجھل ہوئے، لیلیٰ نے اپنی بھتیجی سے کہا کہ وہ تیز تیز چلے اور ہم سے کچھ آگے نکل جائے۔ پھر اس نے سرگوشی میں مجھ سے کہا ''دیکھا؟ ان سے ذرا دیر کے لیے پیچھا چھڑانا بھی کتنا مشکل ہے۔ مجھ پر باز کی طرح ہر وقت نظر رکھتے ہیں۔''

''کن سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے؟'' میں نے وضاحت چاہی۔

''یہ ہی، میری ماں اور بڑا بھائی...'' لیلیٰ نے جواب دیا۔

اس ''بڑے بھائی'' سے ابھی میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔

لیلیٰ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''میں تو آگے پڑھنا چاہتی تھی مگر ان لوگوں نے اجازت ہی نہ دی۔ ان کا خیال ہے کہ اگر لڑکی زیادہ پڑھ لکھ جائے تو اسے قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''پھر تمہیں اسکول بھیجا ہی کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

لیلیٰ نے مجھے سمجھایا کہ ''گاہک پڑھی لکھی عورتوں کو پسند کرتے ہیں۔ تھوڑی بہت انگریزی آتی ہو تو گاہک اچھے ملتے ہیں۔ مگر'' اس نے اضافہ کیا: ''یہ کوئی نہیں چاہتا کہ ہمیں تعلیم کا شوق ہو۔ اسکول وسکول جانے کی خیر ہے لیکن جب بالغ ہو جائیں تو پڑھائی میں سچ مچ دلچسپی نہ لینے لگیں۔''

''بالغ'' میں ان کے کلچر میں اس لفظ کا مطلب سمجھنا چاہتی تھی۔

لیلیٰ نے وضاحت کی: ''یعنی جب ہم کام شروع کر دیں۔ یہی کوئی چودہ پندرہ برس کی عمر سے ہم کام سے لگ جاتی ہیں۔ میرے لیے تو سب کہتے ہیں کہ میں نے بڑی دیر کر دی ہے۔ اتنے برس اسکول جو جاتی رہی۔''

میرا تجسس دو آتشہ ہو گیا۔ اس پیشے کے متعلق معلومات پہلی بار حاصل ہو رہی تھیں۔ پہلی بار یہ پیشہ کرنے والی عورت مجھے خود اس کے قاعدے قرینے بتا رہی تھی۔

لیلیٰ باغ میں آ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ چاروں طرف خوبصورت درختوں اور تفریح کرنے والے لوگوں کی طرف اس کی نظریں بار بار اٹھ جاتی تھیں۔ ان لوگوں میں شامل عورتوں کے لباس پر وہ مسلسل تبصرہ کر رہی تھی۔ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ آج کل کس قسم کے لباس مقبول ہیں۔ باتوں باتوں میں اس نے تسلیم کر لیا کہ نئے فیشن کی معلومات وہ فلموں سے حاصل کرتی ہے۔

میں نے اس کی کلائی پر پڑی خراشوں کے بارے میں اپنا سوال دہرایا۔ اس نے کہا:

''امی اور بھائی آپس میں بڑا لڑتے ہیں۔ بڑا رولا (شور) مچاتے ہیں۔ وہ مجھ سے بھی لڑتے ہیں جی... وہ میری شادی کے لیے کوئی بندہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ جب نہیں ملتا تو مجھ پر خفا ہوتے ہیں کہ میں اپنا کام دل لگا کر نہیں کر رہی۔''

''یعنی'' میں نے پوچھا۔

''شام کو ناچ دیکھنے والے لوگ آتے ہیں ناں'' اس نے کہا ''تو ان کا خیال ہے کہ میں ان کو اچھی طرح نہیں رجھاتی جو کوئی بندہ شادی کے لیے اونچے دام لگائے۔ مجھے یہ زبردستی اچھی نہیں لگتی۔ میرے پیچھے ہی پڑے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں کھانے کو دیتے ہیں، کپڑے دیتے ہیں، وڈیو پلیئر بھی خرید کر دے رکھا ہے، پھر جو تمہارا کام ہے وہ ٹھیک سے کیوں نہیں کرتی؟ دیکھو ذرا!! اپنے خاندان کے لوگ اور ایسے طعنے دیتے ہیں۔ روٹی کپڑا دے کر کیا مجھ پر احسان کر رہے ہیں؟ یہ تو خاندان والے کرتے ہی ہیں۔''

اس گفتگو میں لفظ ''شادی'' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے طوائفوں کی ''نتھ اتروائی'' کی رسم کا علم تھا جس کا مطلب پیشہ ور لڑکی کے کنوار پن کا خاتمہ تھا اور اس بازار میں اس کے اونچے دام

لگتے تھے۔لیکن ''شادی'' کی اصطلاح پورے معاشرے میں جن معنوں میں استعمال ہوتی تھی اس کا یہاں کیا مطلب تھا؟

میں یہ کہتے ہوئے جھجک گئی کہ میرے علم کے مطابق طوائفیں شادی تو نہیں کرتیں۔اس لیے میں نے گھما پھرا کر یہ سوال پوچھا: ''جو آدمی شادی کرنے پر راضی ہو، اس سے کیا توقع ہوتی ہے؟''

لیلیٰ اس سوال پر حیران سی ہوگئی۔اس نے میری طرف دیکھ کر کچھ تعجب سے کہا ''پیسے کی توقع ہوتی ہے، اور کس چیز کی؟''

اب میں نے سوال کو دوسری طرح پوچھا۔''تو کیا یہ شادی... یعنی کیا باقاعدہ شادی ہوتی ہے؟''

''ہاں'' اس نے کہا۔

میری تسلی اس جواب سے بھی نہیں ہوئی۔ میں نے پوچھا: ''شادی کے بعد... کیا تم اس آدمی کے ساتھ اس کے گھر چلی جاتی ہو؟''

مجھے پتا تھا کہ ایسا نہیں ہوتا ہوگا لیکن میں معلوم کرنا چاہ رہی تھی کہ آخر لفظ ''شادی'' کا یہاں مطلب کیا ہے۔لیلیٰ نے آئس کریم کی آخری سُرکیاں بھرتے ہوئے کہا:

''نہیں۔ وہ بندہ کبھی کبھی ہمارے گھر آ کر رہتا ہے۔''

''کبھی کبھی؟''

''ہاں۔ اور جو لڑکی کا نصیبہ خراب ہو تو آدمی اسے چھوڑ دیتا ہے اور لڑکی پھر دھندے سے لگ جاتی ہے۔''

اس گفتگو سے مجھے چند بنیادی باتوں کی معلومات حاصل ہو رہی تھیں جو آگے چل کر مزید معلومات کی تکمیل کر سکیں۔

''تم نے خودکشی کی کوشش کس بات پر کی تھی؟''

''وہی پرانا رولا (مسئلہ)۔۔۔!'' لیلیٰ نے کہا ''تم کو اپنے خاندان کا خیال نہیں ہے۔ ہمارا کیا ہوگا۔تمہارے چھوٹے بھائی بہنوں کا کیا ہوگا۔ ہم تمہارے لیے سب کچھ کرتے ہیں اور تم ہمیں یہ صلہ دے رہی ہو۔ میں کانٹے سے خربوزہ کھا رہی تھی۔ مجھے اس روز اتنا غصہ آیا کہ میں نے اس کانٹے سے اپنی کلائی کاٹ ڈالی۔ بڑا خون نکلا۔انہیں مجھ کو ہسپتال لے جانا پڑا۔''

میرے دل سے ہمدردی پھوٹ نکلی۔ میں نے پوچھا: ''اس پر انہوں نے کیا کیا؟''

''بس کچھ دن تک مجھے نہیں چھیڑا۔لیکن اس کے بعد پھر وہی باتیں شروع کر دیں۔ اگر دھندا اچھا نہیں جا رہا تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ پورے محلے میں سب کا آج کل یہی حال ہے۔''

ہم دونوں کو اندازہ نہیں ہوا کہ وقت کس طرح پر لگا کر اڑ گیا۔ ہم نے پہاڑی کے گرد ایک چکر مکمل کر لیا تھا اور سامنے لیلیٰ کی ماں بنچ پر بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ وہ بڑی بے چین نظر آ رہی تھی اور ہمیں دیکھ کر واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہمارے نزدیک پہنچ کر اس نے ٹٹولتی نظروں سے ہمارے چہروں کا جائزہ لیا جیسے اندازہ لگا رہی ہو کہ ہم نے اِدھر اُدھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرنے کے بجائے کہیں خاندانی رازوں پر گفتگو تو نہیں کی۔

ہم گاڑی میں بیٹھ کر واپس ہوئے۔ لارنس گارڈن تو میں کئی بار گئی ہوں لیکن لیلیٰ کے ساتھ وہاں کی سیر میرے حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی۔

باب ۷

تیل اور پانی

ایک روز میں استاد صادق کی بیٹھک میں اس وقت پہنچی جب اس کا ساتھی ریاض اپنے شاگردوں کے سبق شروع کرنے والا تھا۔ ریاض خود ابھی موسیقی کے استاد کے درجے پر نہیں پہنچا تھا۔ صرف چھوٹے بچے اس سے موسیقی کی تعلیم لیتے تھے جن کی عمریں ۲ رسال سے ۸ رسال تک تھیں۔ ریاض نے مجھے دعوت دی کہ میں بھی موسیقی کی تعلیم کا یہ منظر دیکھوں۔

چار بجے کے بعد شاگردوں کی آمد کا آہستہ آہستہ آغاز ہوا۔ سب سے پہلے آنے والی ایک دوسالہ ننھی سی بچی تھی۔ ریاض نے مجھے بتایا: ''یہ سب سے پہلے آتی ہے اور سب سے آخیر میں جاتی ہے۔'' اس نے کہا ''اگر میرے دوسرے طالب علم اسی جیسے ہو جائیں تو میں تو بڑا مال کمالوں۔''

یہ ننھی بچی ننگے پاؤں، ایک پاجامے پر ہلکا سا سویٹر پہنے تھی۔ بال چھوٹے کٹے ہوئے، ماتھے پر بالوں کی جھالر، ہونٹوں پر مستقل مسکراہٹ... وہ ابھی تتلا کر بات کرتی تھی۔ ریاض کو اس کے چھوٹے چھوٹے توتلے فقرے سن کر بہت لطف آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں دوسرے طالب علم بھی جمع ہو گئے۔ ان میں آٹھ لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا۔

ریاض نے ہارمونیم پر ایک دُھن چھیڑی اور بچوں کی دلچسپی کا گیت گانا شروع کیا۔ گیت ایک پنچھی کے بارے میں تھا۔ کچھ بچے اس کے ساتھ گانے لگے مگر دوسرے تجسس سے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ ریاض نے گانا بند کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ بچے مجھ سے بات چیت کر کے مانوس ہو جائیں

لیکن میں اس طرح سبق میں خلل نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری موجودگی کی وجہ سے ریاض بچوں کو سنجیدگی سے سبق نہیں دے رہا۔ لیکن ریاض نے مجھے بتایا کہ بچوں کے یہ سبق ایک شغل ہی ہیں۔ ریاض کو ان کا کوئی خاص معاوضہ بھی نہیں ملتا۔ اس نے کہا کہ جو خاندان اپنے بچوں کو واقعی موسیقی کی تعلیم دینا چاہتے ہیں وہ نامور موسیقاروں سے رجوع کرتے ہیں۔ وہ اس تعلیم کا عوضانہ (معاوضہ) خاطر خواہ دیتے ہیں اور استاد بہت سنجیدگی سے موسیقی کی تعلیم دیتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ریاض نے اعلان کیا کہ اب رقص کا سبق شروع ہوگا۔ اس نے ہارمونیم پر ایک لہریا بجایا، استاد صادق کے ایک شاگرد نے طبلے پر سنگت دی اور بچوں نے ناچنا شروع کر دیا۔ انہیں دیکھتے ہوئے صاف پتا چل رہا تھا کہ رقص کے بھاؤ انہوں نے فلموں سے سیکھے ہیں۔ ریاض اور طبلہ نواز خاص طور پر مجھے اس ننھی، دو سالہ بچی کا ناچ دکھانا چاہتے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے اسے شاباش دیتے جا رہے تھے۔ ننھی رقاصہ میری موجودگی یا ان دونوں کی ہنسی سے ذرا بھی متاثر نہیں ہو رہی تھی۔ وہ موسیقی کی تال پر پورے انہماک سے ناچ رہی تھی، ہر قدم تال کے مطابق، ہر بھاؤ نیا اور پُر لطف!

شاہی محلے کی سماجی درجہ بندی میں فنِ موسیقی سے وابستہ فنکاروں کا ایک خاص مقام ہے۔ سازندے یہاں اپنے خاندانوں کے ساتھ نہیں رہتے۔ استاد صادق کی طرح انہوں نے اس علاقے میں اپنی اپنی ''بیٹھک'' قائم کر رکھی ہے۔ وہ یہاں اکیلے رہتے ہیں اور پابندی سے اپنے خاندان والوں سے ملنے جاتے رہتے ہیں جو کہیں اور بستے ہیں۔ وہ یہاں بسنے والی طوائفوں یا رقاصاؤں سے ذاتی، سماجی اور پیشہ ورانہ تعلقات صدیوں پرانے اصولوں کی روایت کے تحت قائم کرتے ہیں۔ مجھ سے کئی میراثیوں نے کہا کہ وہ یہاں اس طرح رہتے ہیں جیسے تیل کی بوند پانی پر تیرتی رہے یعنی جس طرح تیل پانی میں نہیں ملتا اسی طرح موسیقی سے منسلک فن کار کسی صورت طوائفوں میں گھل مل نہیں سکتے۔ ''تیل اور پانی'' کی یہ مثال اس محلے کے سازندوں کی تہذیبی روایت کا حصہ ہے اور اس محلے میں آنے والے، نئی نسل کے موسیقاروں کی رہنمائی کے لیے عام طور پر اسے دہرایا جاتا ہے تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ سکیں کہ انہیں طوائفوں سے ہر حال میں ایک مخصوص فاصلہ قائم رکھنا ہے۔

میں نے ابتدا میں استاد صادق کی بیٹھک میں کافی وقت صرف کیا۔ ایک طرح یہ جگہ میرے لیے ''مرکزِ کار'' بن گئی تھی۔ اس کے بعد استاد گامن اور دوسرے سازندوں کی بیٹھکوں میں جانے لگی اور یوں یہ بات میرے علم میں آئی کہ یہاں رہنے والے سازندے اکثر کئی قسم کے ساز بجانے میں مہارت رکھتے ہیں۔

ایک دن استاد گامن کی بیٹھک میں میری ملاقات ایک ایسے نوجوان سے ہوئی جو کسی دور دراز

کے گاؤں سے استاد گامن کے کسی دوست کی تعارفی چٹھی لے کر آیا تھا۔ اس کا مجھ سے تعارف یہ کہہ کر کرایا گیا کہ یہ ملک کا بڑا ہونہار شاعر ہے اور ''دھمال'' لکھتا ہے (اس محلے میں سب ایک دوسرے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور اس پر بے حد خوش بھی ہوتے ہیں)۔

شاعر صاحب نے بیاض نکالی اور ہمیں اپنا کلام سنایا۔ سازندوں کا انتظام کیا گیا۔ جو ساز یہاں استعمال کیے گئے وہ نال، ڈھولک اور چمٹا تھے۔ دھمال کی دھن تیار ہو رہی تھی۔ سازندے ہر مُرکی پر ایک دوسرے کو اور شعر کے مصرعے پر شاعر کو داد دے کر دل بڑھا رہے تھے۔

میں اس پورے منظر سے مسحور ہوگئی۔ استاد گامن ہر سازندے کو ہدایات دیتے جا رہے تھے۔ شاعر اتنا متاثر ہو رہا تھا کہ اس نے برجستہ اور فی البدیہہ دھمال کے لیے دو نئے بند مزید تخلیق کر ڈالے۔ یہ سلسلہ یونہی کافی دیر تک جاری رہا۔ اس دوران استاد گامن نے تین گیتوں کی دھنوں کو حتمی شکل دے دی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ شام کو اپنی ایک شاگرد چندا کو بلوا کر ایک گیت اس سے گوا کر دیکھا جائے۔ دوسرے دو گیت وہ خود گانے والے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ جلد ہی اپنے دھمالوں کا کیسٹ بنانے والے ہیں۔ ان کی زیادہ توجہ اسٹیج شو وغیرہ کرنے پر رہتی تھی۔

کوئی زمانہ تھا جب کہ شاہی محلے کی یہ موسیقار برادری اعلیٰ کلاسیکی موسیقی کے تخلیق کاروں کی حیثیت سے معروف تھی۔ یہ موسیقار، فن موسیقی کی تعلیم بھی دیتے تھے اور اس برادری کی لڑکیاں جسے ''کنجر برادری'' کہا جاتا ہے، نہایت ذوق و شوق کے ساتھ یہ تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ لیکن اب وہ تمام ہنر اور فن رفتہ رفتہ ناپید ہو رہا ہے۔ بازار کی مانگ کے تقاضے بدل چکے ہیں۔ اب تو شاذ و نادر ہی کوئی استاد کلاسیکی موسیقی کی تعلیم دیتا ہے اور جو دیتے ہیں وہ بھی اپنی شاگردوں کو صرف غزل اور گیت ہی سکھاتے ہیں۔ جب فن شناس ہی اٹھ گئے تو فن اس جہدِ بقا میں کیونکر بچ سکتا تھا۔

شاہی محلے میں آنے والے تماش بینوں کی تعداد بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۹۷۰ء سے ایک عشرے کے اندر اندر کسی ایک کوٹھے پر آنے والوں کی روزانہ اوسط تعداد آدھی ہو چکی ہے۔ آنے والے تماش بین ماضی کے مقابلے میں بہت کم آمدنی والے طبقے پر مشتمل ہیں۔ یہ کسی طوائف کو طویل مدت کے لیے داشتہ بنانے کی مالی استطاعت نہیں رکھتے۔ کسی گاہک کی مستقل نوکری سے طوائف کو جو مالی تحفظ میسر آتا تھا اس کے باعث وہ موسیقی پر زیادہ دھیان دے سکتی تھی۔ بدلے ہوئے حالات میں طوائفوں کے پاس نہ موقع ہے اور نہ وقت کہ وہ موسیقی یا رقص کے فن پر توجہ دے سکیں۔

رقص اب بھی گانے کی طرح شاہی محلے کی کسی بھی شام کا ناگزیر حصہ ہے۔ اس لیے اس کی تربیت ضروری تو اب بھی ہے لیکن اب ماہر کلاسیکی رقاصوں کی جگہ ''فلمیں'' وہ مکتب بن گئی ہیں جن

استاد طافو (الطاف حسین) خان: نامور طبلہ نواز اور موسیقار

ہارمونیم پر استاد محمد صادق اور طبلے پر استاد گوگا ایک نوعمر شاگرد کی تربیت کرتے ہوئے

موسیقی کے استاد کے علاوہ ایک ناچنے والی کو رقص سکھانے والے استاد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

استاد صادق کی بیٹھک میں رقص سیکھنے والی کلاس کی سب سے کم عمر شاگرد

: بجنے والے طبلے کی تھاپ کے ساتھ اپنے گھنگھروؤں کی جھنکار ملانا سیکھتی ہے۔
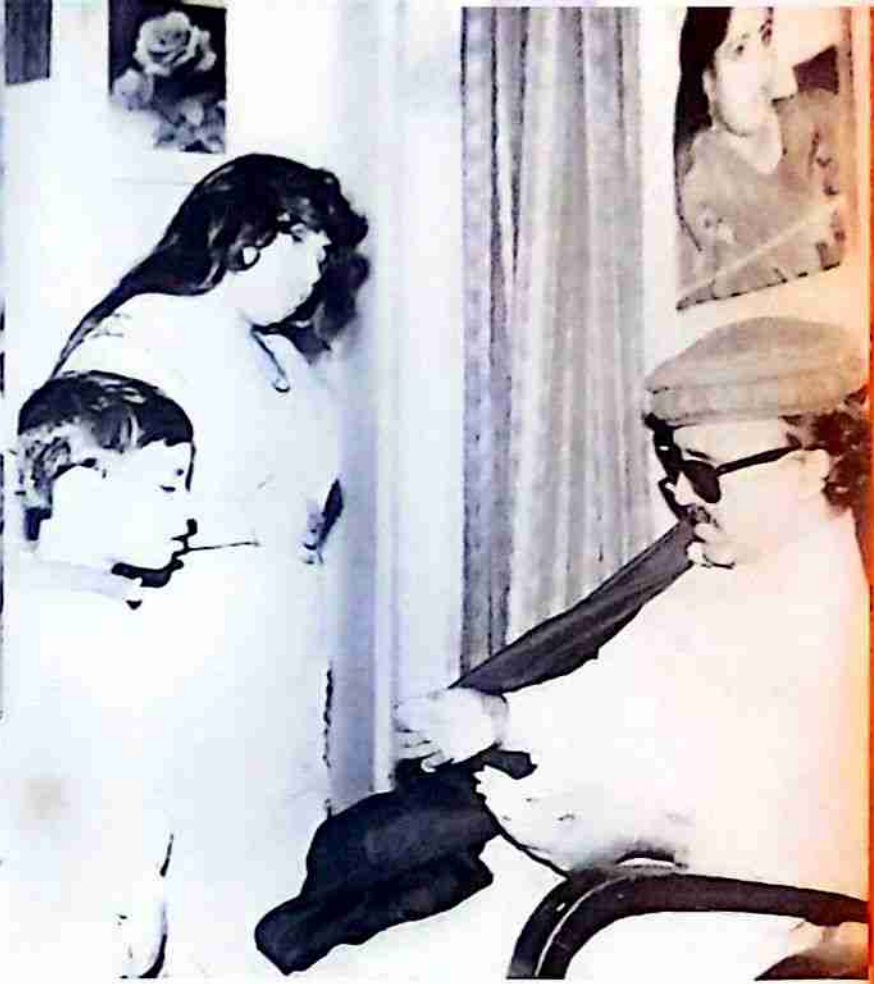
استاد صادق اپنے شاگردوں کے ہمراہ

استاد محمد صادق کا پہلا کیسٹ

ایک میراثی استاد کی بیٹھک میں ابھرتے ہوئے فنکاروں کا گروپ

سے طوائفیں رقص کرنا سیکھتی ہیں۔ یہ رقص اور موسیقی ان کے لیے فلمی دنیا میں داخلے کا راستہ بن جاتا ہے۔ پاکستانی فلموں کی نامور رقاصائیں جیسے عشرت چوہدری، بینا چوہدری، ایمی مینوالا، زمرد اور عالیہ اس محلے سے تعلق رکھتی ہیں۔

ماضی میں فنِ رقص کی ماہر رقاصائیں بادشاہوں، راجاؤں اور نوابوں کے دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھیں اور گراں قدر انعام و اکرام سے نوازی جاتی تھیں۔ وہ صرف موسیقی کی دھن پر نہیں بلکہ کسی گیت یا غزل پر رقص کرتی تھیں۔ ان کا بھاؤ شاعر کے کلام کو اور بھی مؤثر بنا دیتا تھا۔ ماضی کی اس روایت کے باقی ماندہ آثار ہمیں ان پیشہ ور گلوکاراؤں میں آج بھی نظر آ سکتے ہیں جو گاتے ہوئے، بیٹھے بیٹھے ہی، آنکھوں، ہاتھوں اور بعض اوقات پورے جسم کی حرکت کے ساتھ گیت یا غزل کی ادائیگی کرتی ہیں۔

اس محلے کے زوال میں سرکاری دخل اندازی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ پولیس شاہی محلے کے مکینوں اور یہاں کے آنے والوں کو مستقل ہراساں کرتی رہتی ہے جس سے یہاں کا کاروبار بے حد متاثر ہوا ہے۔ اَسّی کے عشرے میں (جب کہ ضیاء دور اپنے عروج پر تھا) ریڈیو پاکستان اور پاکستان ٹیلی وژن کو زبانی احکامات دیے گئے تھے کہ شاہی محلہ سے فنکاروں کو نہ بلایا جائے۔ اس پالیسی نے محلے کے فنکاروں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔

محلے کے قدیم اور با اثر مکینوں سے میری اس سلسلے میں بات چیت ہوئی۔ حاجی الطاف حسین، جو عرفِ عام میں ''طافو'' کے نام سے پکارے جاتے ہیں، اس محلے کے مانے ہوئے استادوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حدود آرڈیننس جیسے قوانین کو اس محلے کے باسیوں کو ہراساں کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہنے کو تو اس کا مقصد عوام کا اخلاق بلند کرنا تھا لیکن شاہی محلے میں اسے بھاری رقمیں وصول کرنے یا طاقت ور افراد کے کہنے پر خاص خاص لوگوں کو پریشان کرنے اور سبق سکھانے کے لیے ہی بروئے کار لایا جاتا ہے۔

اُستاد طافو، اس کا خاندان اور بھائی بند شاہی محلے کی دو حویلیوں میں رہتے ہیں۔ طافو نے برسوں سے اپنے یہاں موسیقی کا معیار قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ خود بھی پاکستانی فلموں کے مقبول ترین طبلہ نوازوں میں سے ہیں مگر ان کی وجۂ شہرت ان کا موسیقار ہونا ہے۔ انہوں نے بارہا میڈم نور جہاں کے ساتھ طبلہ بجایا ہے۔ اس کے باوجود وہ محلے کے موسیقاروں کے مستقبل کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں۔ اُستاد طافو موسیقی کے اساتذہ کی مالی امداد کا باقاعدہ نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ''آرٹسٹ ایسوسی ایشن'' کے ذریعہ انہوں نے کچھ رقم جمع بھی کی ہے۔

اُستاد طافو اس محلے میں ایک معزز استاد بھی ہیں۔ زمانہ بدلنے کے باوجود، ''اُستادی اور شاگردی'' کی روایت محلے میں آج بھی مضبوطی سے قائم ہے۔ یہ روایت دوسروں کی نسبت، کنجر برادری میں کہیں زیادہ راسخ ہے۔ کنجر لڑکی طبلے اور گھنگروؤں کی آواز میں ہی آنکھ کھولتی ہے اور مکتب جانے کی عمر تک پہنچنے کے ساتھ ہی اس کی باقاعدہ تربیت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ ہر رقاصہ کے لیے لازمی ہے کہ یہ تربیت کسی مانے ہوئے استاد سے حاصل کرے۔ عام طور پر اس کام کے لیے میراثی برادری کے کسی مرد استاد کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ موسیقی کے یہ استاد اس رائے کی مسلسل ترویج کرتے ہیں کہ استاد کے بغیر گلوکارہ یا رقاصہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کسی گلوکارہ کے لیے ''بے استادی'' کا لقب بہت حقارت کا ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ اس محلے میں تو اسے ایک گالی کے مترادف مانا جاتا ہے۔

اس محلے میں استاد بننے، یا کسی کو شاگردی میں قبول کرنے کی رسم آج بھی بہت اہتمام سے منائی جاتی ہے۔ استاد کو نیا جوڑا پیش کیا جاتا ہے اور شیرینی تقسیم ہوتی ہے۔ شاگردہ کے خاندان کی مالی حیثیت کے مطابق استاد کو ایک رقم نذر کی جاتی ہے اور معقول ماہانہ مشاہرہ طے کیا جاتا ہے۔ شاگردی کے اصولوں میں ایک یہ بھی ہے کہ شاگردہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے خود استاد کی بیٹھک میں جاتی ہے۔ گو زیادہ امیر گھرانے یہ رسم توڑ بھی دیتے ہیں اور استاد تعلیم دینے ان کے گھر خود آنے لگتا ہے۔

شاگردہ کے لیے استاد رکھنے کا فائدہ صرف موسیقی کی تعلیم تک محدود نہیں ہوتا۔ یہ استاد ہی ہے جو آگے چل کر موسیقی کے کاروبار میں گلوکارہ کا تعارف کراتا ہے۔ اس کے ذریعے شاگردہ اسٹیج شو میں حصہ لیتی ہے جو زیادہ پرانے موسیقار منعقد کرتے رہتے ہیں۔ استاد شاگردہ کو کئی قسم کے چلتے ہوئے گیت سکھاتا ہے جو مقبول ہو سکیں۔ اپنے تجربے کے باعث وہ شاگردہ کو اسٹیج شو میں پرکشش لگنے کے گُر بھی سکھاتا ہے اور اس کی رہنمائی کرتا ہے کہ مخصوص سامعین اور ناظرین کے سامنے کون سے گیت یا غزل مناسب رہیں گے۔ انجام کار ایک اچھا استاد اپنی شاگردہ کو ریڈیو، ٹیلی وژن اور فلمی دنیا تک لے جاتا ہے جہاں اس کے پہلے سے رابطے مستحکم ہوتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مُجروں کی جگہ اب ایسے پروگراموں نے لے لی ہے جنہیں ''ورائٹی شو'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ وارئٹی شو پنجاب کے دیہی علاقوں میں بھی خوب مقبول ہیں۔ گاؤں کا متوسط خوشحال طبقہ بڑی دلچسپی سے یہ ''ورائٹی شو'' دیکھنے جاتا ہے، حالانکہ ماحول وہی مجرے والا ہوتا ہے۔

مجرے اور ورائٹی شو میں ایک واضح فرق یہ بھی ہے کہ مجرے کا انتظام عام طور پر طوائف کے دلال کے ذریعے کیا جاتا ہے جبکہ ''ورائٹی شو'' سازندے خود منعقد کرتے ہیں۔ اس تحقیق کے ذریعے

مجھے معلوم ہوا کہ مجرے اور ورائٹی شو میں فنکاروں اور ناظرین کے باہمی رابطہ کا زاویہ بھی مختلف ہوتا ہے۔ مجرے میں طوائف ایسے افراد کی متلاشی ہوتی ہے جو بعد میں اس کے اپنے گاہک بن سکیں اور اس کی فنکاری کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، ورائٹی شو منعقد کرنے والے اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ دیکھنے والوں کی تفریح مجموعی طور پر تسلی بخش ہو، تاکہ انہیں اسی طرح کے شوز منعقد کرنے کی مزید دعوتیں مل سکیں۔

تاثرات

شعیب ہاشمی (ماہر تعلیم اور پاکستانی ثقافت کی نمایاں شخصیت)

میں جاننا چاہتی تھی کہ اپنے ہاں کے ترقی پسند اور روشن خیال لوگ شاہی محلے کے متعلق کیا سوچ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں میری شعیب ہاشمی کے ساتھ بہت اچھی بات چیت ہوئی اور ہم نے شاہی محلے اور طوائف کے پیشے پہ تبادلۂ خیال کیا۔

شعیب جو اپنی عمر کی پانچویں دہائی میں ہیں، گفتگو کرتے ہوئے اپنے مخاطب کو یوں متاثر کرتے ہیں جیسے سپیرا بین بجا کر سانپ کو مسحور کر دیتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنی تحقیق کے متعلق ان سے بات چیت کی۔ شعیب نے چھوٹتے ہی کہا، "سنا ہے کہ تم پولیس والوں کے ساتھ پنگا لیتی پھر رہی ہو۔ لڑکی! ہمیں ابھی تمہاری ضرورت ہے اور یقیناً تمہارے والدین کو بھی تمنا ہوگی کہ تم زندہ رہو۔ کیا ارادے ہیں؟"

میں ہنس دی۔ شعیب کے ساتھ سنجیدہ گفتگو کرنا مشکل کام ہے۔ میں نے کہا، "آپ جانتے ہیں کہ میں شاہی محلے پر کافی عرصے سے تحقیق کر رہی ہوں اور طوائف کے پیشے پر بھی۔ اب میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے اس کاروبار کے تاریخی پس منظر کے بارے میں بتائیں۔"

انہوں نے کہا، "طوائف کا پیشہ دنیا کا قدیم ترین پیشہ ہے۔ جو ہم یقین سے جانتے ہیں وہ یہ کہ شاہانِ مغلیہ کے دور میں تقریباً تمام بادشاہ موسیقی اور فنونِ لطیفہ کے دلدادہ تھے اور ناچ گانے کے فن کی سرپرستی بھی کرتے تھے اور فنکاروں کی ایک بہت بڑی تعداد کو مالی سہارا بھی دیتے تھے۔ انہی فنکاروں میں کئی لوگ طوائف کے پیشے سے بھی منسلک تھے۔ یہ فنکار شاہی محلات کے آس پاس رہتے تھے، ان کا شمار خدمتگاروں میں ہوتا تھا اور یہ تنخواہیں بھی وصول کرتے تھے۔

فن کو پھلنے پھولنے، نشوونما پانے اور آگے بڑھنے کے لیے سرپرستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وہ جگہیں تھیں جہاں شرفاً اپنے بچوں کو ادب آداب اور اخلاقی تربیت حاصل کرنے کے لیے بھیجا کرتے تھے تاکہ وہ آدابِ محفل سے واقف ہوں اور شاعری، اچھے مشروبات اور خوش شکل عورتوں کی تعریف کر سکیں۔ یہ تمام پہلو اُن کی تعلیم و تربیت کا حصہ ہوتے تھے۔"

"اب حالات بہت بدل چکے ہیں"، میں نے مسکرا کر کہا۔

انہوں نے ہنس کر کہا، "ہاں، اب وہاں کاروباری لوگ ادب آداب سیکھنے نہیں جاتے لیکن کیا ہرج ہے کہ معاشرے کے کچھ افراد اپنا ذہنی تناؤ کچھ کم کرنے کے لیے وہاں چلے جائیں۔ اس طرح سے معاشرے میں امن اور جذباتی ٹھہراؤ قائم رہتا ہے۔ لوگ وہاں اپنی مرضی سے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر نوجوان طبقے کے پاس ایسی جگہ ہو جہاں وہ اپنی (جاری)

اداسی دور کر سکیں تو جانے دو۔"

میں اس سوال کے جواب میں کہ دباؤ کے تحت طوائف کا پیشہ اختیار کرنے کے متعلق اُن کا کیا خیال ہے، انہوں نے زور دار لہجے میں کہا، "ظاہر ہے کہ اس کو روکنا چاہیے لیکن آج کل شاہی محلے میں جو کچھ ہو رہا ہے میرے خیال میں یہ خاندانی ذریعۂ معاش کو جاری رکھنا بھی ہے۔ کیا تم اس بات سے اتفاق نہیں کرو گی کہ یہ لوگ اپنے خاندانی سوشل سسٹم کا حصہ بن گئے ہیں۔"

ان کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے میں نے کہا، "جبر دن بہ دن زیادہ ہوتا نظر آرہا ہے۔ لیکن آپ کے نقطۂ نظر کی طرف واپس آتے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ طوائف کے پیشے کے خلاف ہمیں سخت رویہ نہیں رکھنا چاہیے جب تک کہ لوگوں کو یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور نہ کیا جائے اور اگر وہ دونوں فریق اپنی ہی مرضی سے ایسا کریں تو یہ سب کچھ نظرانداز کر دینا چاہیے۔"

انہوں نے قدرے توقف سے کہا، "سماج میں ذہنی تناؤ کو کم کرنے کے لیے ہم اس طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ یوں بھی ہمارا سماج فنکارانہ سرگرمیوں پہ بہت پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس جگہ کو آزادانہ گانے بجانے والوں کی تربیت حاصل کرنے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔"

میں نے نرمی سے سوال کیا، "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ صرف مرد حضرات ہی اداسی کا شکار ہوتے ہیں۔ خواتین کے متعلق کیاخیال ہے؟ اگر آپ کے خیال میں اس جگہ کو جذبات کی تسکین کا ایک ذریعہ سمجھ کر تسلیم کر لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ ایک بازار مردوں کا نہیں ہونا چاہیے جہاں عورتیں اپنی ذہنی تناؤ کو کم کرنے کے لیے جا سکیں؟"

شعیب نے میری طرف سنجیدگی سے دیکھا اور توقف کے بعد کہا، "یہاں آپ نے مجھے پکڑ لیا۔ یہ تو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ ہاں مردوں کے لیے میں آزاد خیال تھا۔ میں تو اس طبقہ کے خلاف بیہودہ حکومتی اقدامات کا مخالف رہا ہوں جو اس طبقے اور اس کے گاہکوں کے لیے پریشان کن تھے یا ان کے خلاف تھے۔ لیکن اس زاویے سے تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ ہاں میرے خیال میں عورتوں کے لیے بھی تفریح کا سامان (بازار) ہونا چاہیے۔"

میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا، "میں نہیں کہتی کہ عورتوں کے لیے کسی ایسے بازار کی ضرورت ہے لیکن میں آپ کو یہ حقیقت دکھانا چاہتی تھی کہ ہم لوگ کس قدر ایک ہی زاویے سے ان باتوں کو دیکھتے ہیں۔"

باب ۸

مُودا کنجر سے ملاقات

میں بہت دنوں سے استاد صادق سے اصرار کر رہی تھی کہ میری ملاقات محمود کنجر سے کرائی جائے جن کو زیادہ تر لوگ مُودا کنجر یا ماما مودا کے نام سے جانتے تھے۔ یہ اس محلے کی ایک معزز شخصیت تھے اور انہیں یہاں کے باسیوں کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ان سے بات چیت کے ذریعے مجھے اس محلے پر نظر ڈالنے کا اور اسے سمجھنے کا ایک نیا زاویہ مل جائے گا۔ بالآخر محلے کے باسیوں نے مجھے اُن کا ٹیلی فون نمبر بتا دیا اور میں نے اسلام آباد سے انہیں ٹیلی فون کیا۔ دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز آئی۔ جب میں نے اسے اپنا مقصد بتایا تو اُس نے کہا کہ میں دوسرے دن ایک بجے ٹیلی فون کروں اس کے بعد مُودا کنجر گھر پر نہیں ملتے۔ محلے کے دوسرے باسیوں کی طرح ان کی صبح بھی دوپہر کے وقت ہوتی ہے۔ جو ہمارے لیے دوپہر ایک بجے کا وقت تھا وہ اُن کے لیے صبح آٹھ بجے کے مترادف تھا۔

دوسرے دن جب میں نے فون کیا تو مودا کنجر گھر پر موجود تھے۔ اُنہوں نے مجھ سے بڑی مہذب گفتگو کی۔ جب میں نے اُن سے ملاقات کا وقت مقرر کرنے کے لیے کہا تا کہ میں اس کے مطابق آنے کا پروگرام بناؤں تو انہیں بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ میرا لاہور کا سفر اُن کی سہولت کے مطابق ہوگا۔ ہم نے جمعہ کے دن ان کے گھر پر ملاقات کا وقت طے کر لیا۔

اگلی جمعرات کو میں دفتر سے ذرا جلدی اٹھ گئی تا کہ اندھیرا ہونے سے پہلے لاہور پہنچ جاؤں۔

دفتر میں اپنے ایک رفیقِ کار عارف سے میں نے اس ملاقات کا ذکر کیا جس کی خاطر میں لاہور جا رہی تھی۔ میری بات سُن کر عارف کا تو منہ ہی کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے عجیب سی آواز میں پوچھا: ''تم جانتی بھی ہو کہ یہ ہے کون؟''

میں نے اپنے بریف کیس میں اطمینان سے کاغذات رکھتے ہوئے جواب دیا: ''ہاں! وہ اس محلے کے بہت بڑے لیڈر ہیں اور میرا خیال ہے ان کا سیاست سے بھی تعلق رہا ہے۔''

عارف نے سر پیٹ کر چیخ کر کہا: ''ارے وہ دلال ہے! بہت بڑا دلال۔ اس دور کا نامی گرامی...! اس محلے میں وہ سب سے زیادہ طاقت ور آدمی ہے اور چھٹے ہوئے غنڈوں، بدمعاشوں اور منظّم جرائم پیشہ گروہوں سے اس کے رابطے ہیں۔ تم کو کچھ خبر نہیں کہ تم کیا آفت مول لے رہی ہو!''

اب تک میں شاہی محلے جانے پر اعتراضوں کی بھرمار سے بالکل اکتا چکی تھی۔ میں نے کہا: ''اب بس بھی کرو۔ میں صرف اس کا انٹرویو لینے جا رہی ہوں۔''

اتنا کہتے ہوئے میں اپنے ایک دوسرے رفیقِ کار کے لیے نوٹ لکھنے لگی۔ عارف کھڑا مجھے تکے جا رہا تھا۔ اس نے کہا: ''کسی کو اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہو یا نہیں؟''

''کیا کسی باڈی گارڈ کو لے جاؤں؟ جی نہیں! میں اکیلی ہی جا رہی ہوں۔''

خوف اور جھنجھلاہٹ سے عارف چیخ پڑا: ''تمہیں خبر بھی ہے کہ کیا خطرہ مول لے رہی ہو؟ یہ لوگ تمہیں کسی چیز میں ایسے پھنسا سکتے ہیں کہ تمہارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو۔ کیا بالکل پاگل ہو کہ اکیلی جا رہی ہو؟ ایک تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس محلے میں کیسے مٹرگشت کرتی رہتی ہو لیکن اس آدمی سے ملاقات!! فوزیہ... اگر تم کسی سخت مصیبت میں گرفتار نہیں ہوئیں تو بڑی حیرت کی بات ہوگی۔''

میں اپنا نوٹ مکمل کر کے کھڑی ہو چکی تھی۔ میں نے کہا: ''شاہی محلے میں آج تک کسی نے مجھ پر آواز تک نہیں کسی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس نام نہاد اسلام آباد شہر کے بارے میں ایسا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ باڈی گارڈ کی ضرورت مجھے شاہی محلے میں نہیں بلکہ شہروں کے عام علاقوں میں ہوتی ہے۔ جب میں لاہور جانے کے لیے جی ٹی روڈ پر گاڑی چلاتی ہوں تو لوگ تفریحاً میرا تعاقب کرتے ہیں۔ کیوں؟ کیا صرف اس لیے نہیں کہ میں ایک عورت ہوں اور کار میں اکیلی ہوتی ہوں؟ لاہور کے دوسرے محلوں میں کتنے ہی لوگ مجھ پر فقرے کستے ہیں جبکہ شاہی محلے میں، جہاں اتنی بھیڑ ہوتی ہے، آج تک کسی نے مجھے ہاتھ تک لگانے کی کوشش نہیں کی۔''

اتنا کہہ کر میں نے اپنا پرس، بریف کیس اور کار کی چابیاں اٹھائیں اور دفتر سے باہر نکل گئی۔

اس شام لاہور میں، میں نے کافی دیر تک محلے کے ان موسیقاروں سے بات چیت کی جو مودا

کنجر کو جانتے تھے۔ مودا سے انٹرویو کرنے سے قبل میں قومی سیاست میں مودا کے مقام اور رشتوں اور محلے میں اس کی سیاسی حیثیت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

ان میں سے ایک نے کہا: ''مودا تو یہاں کا شیر ہے۔ بلکہ ببر شیر! اس کا نام تو ہر کوئی جانتا ہے۔ جب ہم میں سے کسی کو پولیس تنگ کرتی ہے، پکڑ کر لے جاتی ہے یا اندر کر دیتی ہے تو مدد کے لیے ہم مودے کے پاس ہی جاتے ہیں۔ وہی ہمیں چھڑا کر لاتا ہے۔''

دوسرے نے کہا: ''مُودے نے ہمیں کبھی دغا نہیں دی۔ حکومت خواہ کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو، مودا ہمارے لیے ہمیشہ ڈٹا رہا ہے۔''

کئی لوگوں سے گفتگو کے بعد میں مودے کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ اسے یہاں کے لوگ اپنا نمائندہ سمجھتے تھے۔ اس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ کئی چکلوں کا انتظام سنبھالتا ہے۔ لوگ اس سے ڈرتے تھے مگر ساتھ ہی وہ اسے ایک نڈر انسان اور اپنا لیڈر بھی مانتے تھے۔

دوسرے دن میں ڈھونڈتی ہوئی بالآخر اس کے گھر جا پہنچی۔ بازار سے پرے، ایک تنگ گلی میں، عام چوبی دروازوں والا یہ ایک معمولی سا مکان تھا۔ میں نے دستک دی تو کسی نوجوان نے دروازہ کھولا۔ وہ گھر کا ملازم معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا تو اس نے مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا مگر گھر کے اندر نہیں بُلایا۔ لیکن مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مودا کنجر فوراً ہی دروازے تک خود آ گئے۔ دراز قد، گورا رنگ، کلف دار شلوار قمیض، مودا کی شخصیت دیکھنے میں کافی متاثر کن تھی۔ سفید بالوں اور گھنی سفید مونچھوں نے انہیں رعب دار بھی بنا دیا تھا۔ انہوں نے کہا: ''چلیے ہم تنظیم کی خزانچی، زمرد کے گھر چلتے ہیں۔ ہم وہاں بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں۔''

ہم ان گلیوں سے گزرے جو اب میرے لیے مانوس ہو گئی تھیں۔ ایک مکان کے سامنے وہ رکے اور مجھ سے کہا کہ ہم اس حویلی میں بات چیت کریں گے۔ داخلے کا راستہ بڑی شان و شوکت والا تھا۔ بہت بڑا چوبی دروازہ، جس کے دونوں طرف مرمریں پلاسٹر کے حاشیے تھے اور بالائی حصے پر بھاری بھرکم نقش و نگار بنے تھے۔ دروازہ کھلا اور ایک زینہ طے کر کے ہم دیوان خانے میں داخل ہوئے جو عمارت کی دوسری منزل پر تھا (زینہ اور بھی اوپر جا رہا تھا)۔ ایک گیارہ سالہ بچی ہمیں اندر لے گئی۔ کمرے کی آرائش میں مغربی اور مشرقی طرز کا امتزاج تھا۔ ایک صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا جبکہ فرشی نشست کا بھی انتظام تھا اور دیوار کے سہارے گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔

میں اور محمود ایک بڑے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ایک طرف ہارمونیم رکھا تھا۔ دیواروں پر کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویریں آویزاں تھیں۔ وہ لڑکی ہمارے لیے سیون اپ کی دو بوتلیں لے

آئی۔ اس بچی نے بہت معمولی قسم کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی عجیب مسکراہٹ تھی جیسے اس کو ہماری مدارات میں بہت لطف آرہا ہو۔ اس کی زندگی کے اس دن میں ہماری آمد نے ایک دلچسپ اضافہ کر دیا تھا۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ محمود فوراً باقاعدہ انٹرویو کا آغاز کرنا نہیں چاہتے۔ زمرد کا انتظار کرتے ہوئے ہم رسمی گفتگو کرتے رہے۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ میں ان سے اور زمرد سے ایک ساتھ گفتگو کروں تاکہ مجھے مسئلہ کے دونوں پہلو معلوم ہو جائیں۔ ان کا خیال تھا کہ معاشرے میں اس محلے کے مقام اور یہاں کے باسیوں کے مسائل کے بارے میں زمرد کے اپنے انوکھے اور قابلِ قدر خیالات ہیں۔ اس دوران میں نے بھی ان پر اپنے مقاصد واضح کیے۔ اول تو میں نے انہیں یہ بتایا کہ میں یہاں کسی ''سماج سدھار'' مقصد سے نہیں آئی ہوں اس لیے اس بات کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ کوئی بھی مجھ پر اپنا ''پاکباز'' ہونا ثابت کرے۔ دوم یہ کہ اب تک میں اس علاقے کے مکینوں کے بارے میں کافی معلومات پہلے ہی حاصل کر چکی ہوں اس لیے کسی جھوٹی سچی کہانی پر یقین نہیں کروں گی۔ میں نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ کیا میاں صلو کا سیاسی دفتر اب بھی یہاں کے ''سٹی سینما'' میں ہے؟ ان صاحب کا پورا نام میاں یوسف صلاح الدین تھا۔ یہ اس علاقے کے بااثر سیاسی آدمی سمجھے جاتے تھے اور یہاں ان کی کافی جائیداد تھی۔ میں نے یہ بھی پوچھا کہ ٹبی تھانے کی ''پگڑی'' کیا اب بھی سب سے زیادہ ادا کی جاتی ہے؟

پولیس والے اس محلے کے تھانے کا ایس ایچ او مقرر ہونے کے لیے بہت بھاری رشوت دیتے ہیں، جسے پگڑی کہا جاتا ہے۔ یہاں تعینات ہونے کے بعد، مکینوں کو ہراساں کر کے یہ رقم سود سمیت جلد ہی وصول ہو جاتی تھی۔

دونوں باتوں کا جواب محمود نے ''جی ہاں'' کہہ کر دیا مگر ان سوالوں کا جواب مقصود نہیں تھا۔ مجھے تو ان کو صرف یہ احساس دلانا تھا کہ میں یہاں کی زندگی کے بارے میں کافی کچھ جانتی ہوں۔

پھر زمرد آ پہنچیں۔ وہ چالیس کے پیٹے میں تھیں۔ جسم ذرا بھاری تھا، بہت حسین لباس اور اچھا سنگھار کیے ہوئے تھیں۔ دونوں ہاتھوں میں ہیرے جگمگا رہے تھے جن پر میری نظر بار بار پڑ رہی تھی۔ محمود نے میرا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ میں اسلام آباد سے آئی ہوں اور محلے پر کچھ لکھنا چاہتی ہوں۔

میں نے پہلا سوال محلے کی تاریخ کے بارے میں کیا کہ یہ محلّہ موجودہ صورت میں اس علاقے میں کب سے آباد ہے۔ سوال سن کر محمود سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور بتانا شروع کیا۔ انہوں نے کہا: ''میری عمر سڑسٹھ (۶۷) برس ہے۔ بہت پہلے یہ محلّہ پرانی انارکلی میں ہوتا تھا۔ پھر لوہاری منڈی منتقل

محمود کنجر: شاہی محلے کی ایک بااثر نمائندہ سیاسی شخصیت
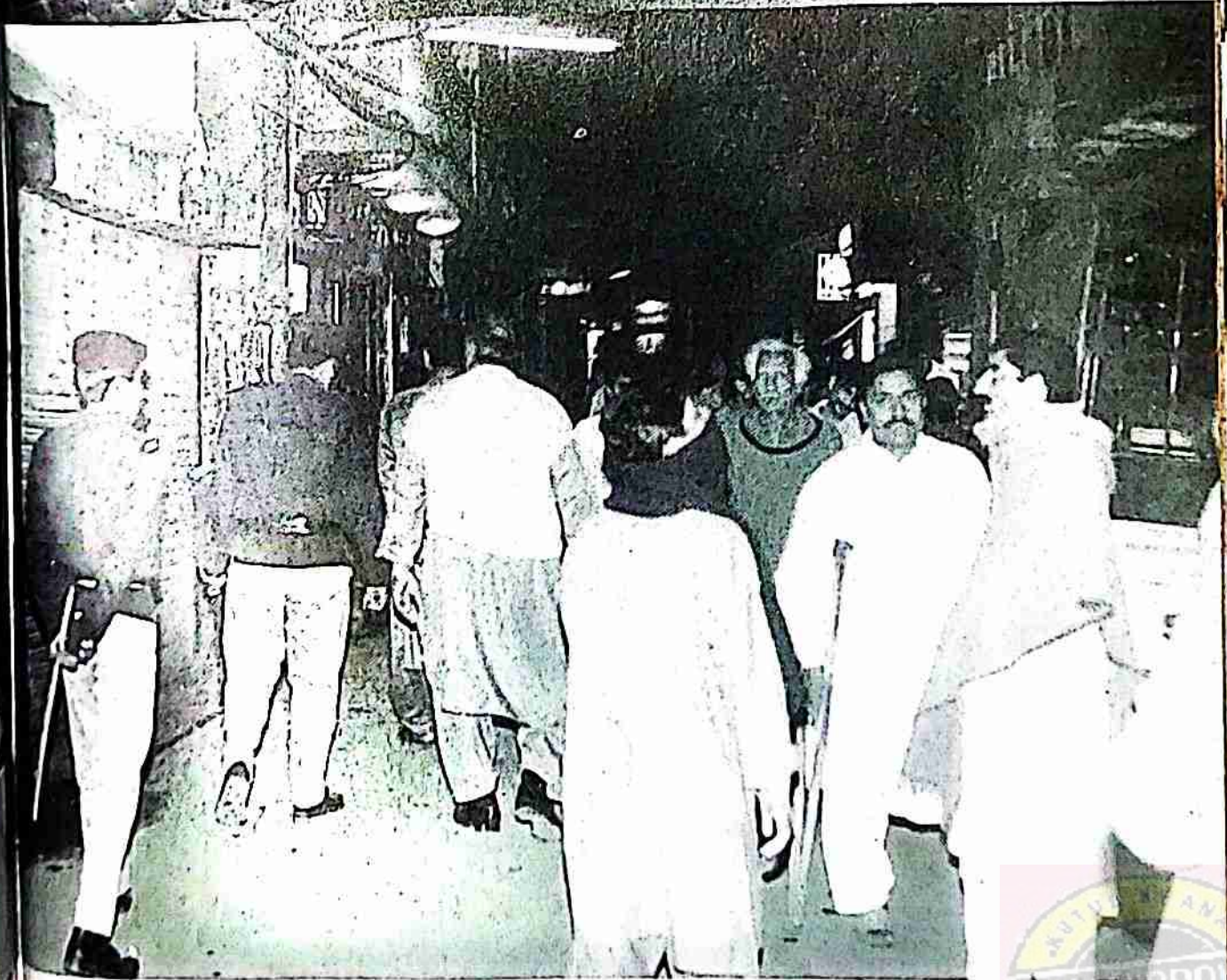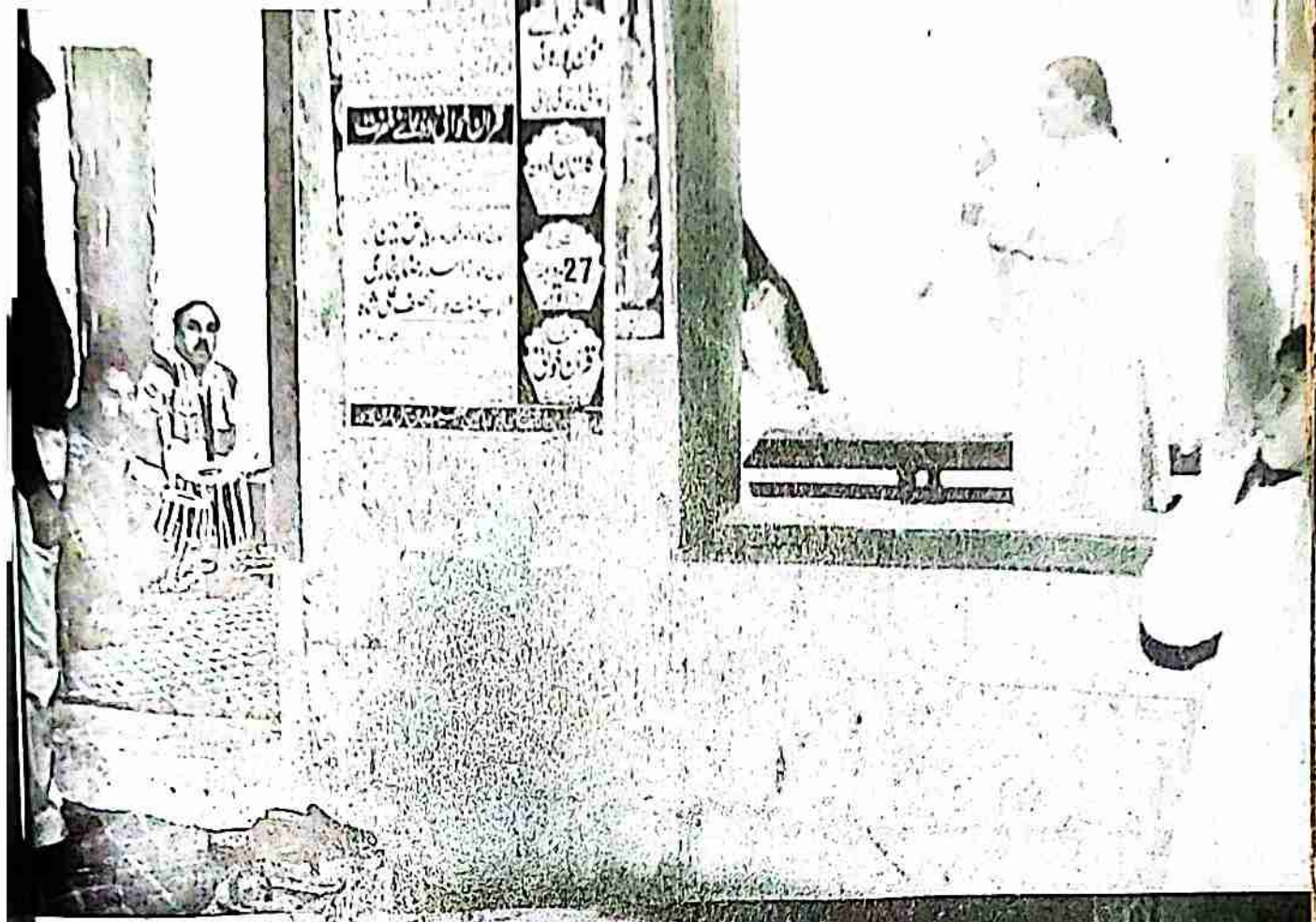
ناچنے والیوں کے اوقاتِ کار پہ کڑا قابو رکھنے کے بہانے پولیس اپنا بے جا اثر و رسوخ دکھاتے ہوئے

دوپٹہ اٹھائے رقاصہ گاہکوں کے لیے نغمہ سرا ہے
جبکہ سازندے اس کی سنگت کر رہے ہیں۔

رقاصہ چاہے رقص میں کتنی ہی محو نظر آئے، محفل میں
موجود اپنے گاہکوں سے وہ باقاعدہ باخبر رہتی ہے۔

گاہک دل لبھانے والی اداؤں کو سراہتے ہوئے پیسے نچھاور کر رہا ہے۔

ہو گیا۔ وہاں اب بھی ''چوک چکلہ'' نامی ایک جگہ ہے۔ وہاں کبھی بڑی مشہور طوائف شمسہ بیگم کا کوٹھا تھا۔ بعد میں وہ نامور گائیکہ بن گئی۔ وہاں سے محلہ لنڈا بازار اور پھر موتی بازار منتقل ہوا۔ اس جگہ کوئی سو برس پہلے یہ محلہ منتقل ہوا ہے۔ جب میں پیدا ہوا تو یہاں گیس کے ہنڈے جلتے تھے۔ بجلی نہیں ہوتی تھی۔ ٹبی تھانے کے پاس برگد کے پیڑ لگے تھے۔ دن کے وقت بھی وہاں کوئی نہیں جاتا تھا۔''

میں نے محمود سے اُن کی تنظیم ''انجمنِ فنکارانِ لاہور'' کے بارے میں سوال کیا تو ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ انہوں نے مجھے پورے ذوق و شوق سے بتانا شروع کیا کہ یہ تنظیم دراصل اس سرکاری دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے بنائی گئی جس کا شکار یہاں کے رہنے والے مدت سے تھے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ محلے کے فنکاروں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ اس کی مجلسِ عاملہ میں ۲۹ افراد شامل ہیں۔ یہ مختلف گھرانوں کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن سب کے سب کنجر برادری سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

زمرد نے اپنے دوپٹے اور چوڑیوں کو درست کرتے ہوئے کہا ''جب یہ نظام ہمیں تحفظ نہیں دے سکتا تو پھر ہمیں اپنی حفاظت خود ہی کرنا پڑتی ہے۔''

محمود نے شکوے بھری بلند آواز میں کہا: ''باہر یہ سماج اور سرکاری کارندے ہمیں بہت بُرا سمجھتے ہیں۔ ہماری کوئی لڑکی کہیں گانا گائے تو عجیب سمجھا جاتا ہے لیکن جب طاہرہ سیّد اور گلشن آراء سیّد گاتی ہیں تو کوئی برا نہیں سمجھتا جبکہ گانا انہوں نے ہم لوگوں سے ہی سیکھا ہے۔''

میں نے شائستگی سے سوال کیا کہ آیا یہ تنظیم شاہی محلے تک ہی محدود ہے یا اس کا دائرہ کار وسیع تر ہے؟

محمود نے مجھ پر فخریہ نظر ڈال کر کہا: ''یہ تنظیم پورے پنجاب کی نمائندگی کرتی ہے۔ سرگودھا، اوکاڑہ، چونکی، راولپنڈی، لائل پور، لالہ موسیٰ... ہمارے لوگ جہاں بھی ہوں، ہم ان سے رابطہ رکھتے ہیں۔ مگر ہم سازندوں کی نمائندگی نہیں کرتے۔''

میں نے تجسس سے پوچھا: ''کیوں؟ کیا آپ انہیں فنکار نہیں سمجھتے؟''

''نہیں، یہ بات نہیں۔'' انہوں نے وضاحت کی: ''وہ دوسری ذاتوں کے ہیں۔ 'اتحادِ موسیقاراں' کے نام سے ان کی اپنی تنظیم ہے۔ ان میں استاد بھی ہوتے ہیں۔ ہماری لڑکیاں فنکار بن کر پیٹ سے تو نہیں پیدا ہوتیں۔ انہیں سیکھنا ہوتا ہے۔ ہماری نظر میں تو استاد کی اتنی عزت ہے کہ اسے باپ کا درجہ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اب تو معاشرے کی نظر میں ان کی بھی کوئی قدر نہیں رہ گئی...''

میں نے سوچا کہ میں بعد میں موسیقاروں سے معلوم کرلوں گی کہ حکومت کے ستم کا مقابلہ یہ الگ الگ رہ کر کیوں کرتے ہیں۔ موضوع بدلتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

''کیا آپ سیاست میں بھی شامل رہے ہیں؟''

''جی ہاں!'' انہوں نے کہا، ''میں ۱۹۷۹ء میں کونسلر بنا تھا۔ ۱۹۸۳ء میں علاقے کو تین وارڈوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یعنی ایک کونسلر پورے محلے کی نمائندگی نہیں کر سکتا تھا۔ اب ٹبی کا علاقہ، شاہی محلہ اور ہیرا منڈی کے تین الگ الگ حلقے ہیں۔ میں نے ہمیشہ اپنے عوام کی خدمت کی ہے۔ ۱۹۷۹ء میں جنرل سوار خاں نے کنونشن کرایا تھا تو سارے کونسلر اپنے اپنے علاقوں کے مسائل پیش کر رہے تھے۔ جب میں کھڑا ہوا تو لوگ اعتراض کرنے لگے کہ یہ تو ہیرا منڈی کا ہے اور اس بازار کو تو بند کر دینا چاہیے۔ اس پر جنرل سوار خان نے کہا کہ اگر آپ لوگوں کو یہی اصرار ہے تو الحمدللہ! لیکن پھر آپ ان لوگوں کو اپنا لیں۔ انہوں نے کہا کہ جو لوگ طوائفوں سے شادی کر کے اپنے گھروں میں بسانا چاہتے ہیں وہ ہاتھ اٹھائیں۔ جب کسی نے بھی ہاتھ نہیں اٹھایا تو جنرل نے کہا'' جب تک آپ ان کی بیٹیوں سے شادی نہیں کریں گے اور ان کے مردوں کو اپنی بیٹیاں دینے کے لیے رضامند نہیں ہوں گے تب تک معاشرہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو ہمیں انتظار کرنا چاہیے کہ معاشرہ سدھر جائے۔ تب ہیرا منڈی کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔''

صوفے پر پہلو بدل کر آرام سے بیٹھتے ہوئے انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہم ایوب خان کے زمانے سے سیاست میں حصہ لے رہے ہیں اور اپنے لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں مگر لوگ ہمیں اچھوت سمجھتے ہیں۔ اس علاقے نے ایسے ایسے لوگ پیدا کیے ہیں کہ اگر آپ سنیں تو حیران رہ جائیں۔ بڑے بڑے سرکاری افسر، وکیل، فوجی افسر...!! ظاہر ہے کہ وہ اس محلے سے اپنا رشتہ دنیا کے سامنے ظاہر نہیں کر سکتے اور نہ ہمارے حقوق کے لیے جدوجہد کر سکتے ہیں۔ کوئی کوئی بندہ اقبال حسین کی طرح جی دار ہوتا ہے۔ وہ نیشنل کالج آف آرٹس میں پڑھاتا ہے مگر اس نے سب پر ظاہر کر رکھا ہے کہ وہ اس محلے کا ہے۔'' وہ کہہ رہے تھے۔

''یہاں ہم چودہ پندرہ بازاروں میں بسے ہوئے ہیں۔ یہاں کی آبادی چار پانچ لاکھ کے قریب ہے جن میں دو لاکھ ووٹر ہیں۔ کیا ہمارے اپنے نمائندے نہیں ہونے چاہئیں؟ چار پانچ سو کمروں میں ناچ گانا ہوتا ہے مگر یہاں بسنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ آخر معاشرہ ہمیں قبول کیوں نہیں کرتا؟ یہاں سے کرکٹ اور ہاکی کے اتنے کھلاڑی نکلے ہیں!'' محمود نے کہا۔

''لیکن جب ووٹ کا سوال آتا ہے تو ہم سے باپ کا نام پوچھا جاتا ہے!'' انہوں نے غصے سے کہا: ''کیا اس طرح کسی کو شرمندہ کرنا اچھی بات ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اگر شناختی کارڈ پر ہم اصل باپوں کا نام لکھنا شروع کر دیں تو قیامت اُٹھ کھڑی ہوگی۔ ہمیں کارڈ پر نانا یا ماموں یا بھائی کا نام لکھنے کی

اجازت ہونی چاہیے۔ مگر ان کی یہی ضد ہے کہ باپ کا نام لکھو اور جو کسی کو باپ کا نام معلوم ہی نہ ہو تب؟ اور جو معلوم ہو، مگر وہ کوئی بڑا سیاست دان ہو، کوئی فوجی جنرل ہو، تب؟؟ پھر ہمارا کیا بنے گا؟"

انہوں نے مزید کہا: "ایوب خان کے زمانے میں آرٹس کونسلیں شروع کی گئیں۔ اب جو فنکار انہوں نے پیدا کیے ہیں اور جو اس محلے نے پیدا کیے ہیں ان کا مقابلہ کر کے دیکھ لیجیے۔ سچ تو یہ ہے کہ کونسلوں میں بھی کئی فنکار اسی محلے کے ہیں۔ کیا موسیقار اور گلوکار، کیا ڈانسر اور استاد... اکثر ہمارے ہی ہیں۔ بڑا المیہ ہے کہ ہم کھل کر انہیں اپنا بھی نہیں کہہ سکتے۔"

اتنے میں وہی بچی ایک ملازم کے ساتھ ہماری خاطر داری کرنے آ پہنچی۔ کھانے پینے کی لذیذ چیزیں اس محلے کا مشہور خاصہ ہیں۔ اس بار مہمانوں کے لیے کھیر آئی تھی۔ زمرد نے جلدی سے میز پوش درست کیا اور کھیر کے پیالے ہمارے سامنے لگا دیے گئے۔ زمرد نے میری طرف دیکھ کر کہا "یہ یہاں کی بڑی مشہور چیز ہے۔"

"اور میری دلپسند بھی!!" میں نے بے ساختہ کہا۔ زمرد اور محمود مسکرا دیئے۔

میں غور کر رہی تھی کہ اس گفتگو میں زمرد نے بالکل حصہ نہیں لیا تھا۔ اب میری خواہش تھی کہ وہ بھی کچھ بولے۔ مجھے معلوم تھا کہ زمرد نے اپنی برادری اور محلے سے باہر شادی کی تھی اس لیے میں نے اس سے اسی بارے میں سوال پوچھا۔

زمرد نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "شادی تو میری پچیس برس تک رہی مگر سچ تو یہ ہے کہ ان کے خاندان والوں نے مجھے ایک دن کے لیے بھی قبول نہیں کیا۔ ان کے خاندان والے اور دوست میرے دشمن ہی رہے۔"

اس کی آواز بھرّا گئی۔ گلا صاف کرتے ہوئے اس نے پانی کا گلاس مانگا۔ اب محمود نے بات آگے بڑھائی۔

"جی ہاں!! زمرد کی ہی مثال لے لیجیے۔ اس نے میاں صاحب سے شادی کی تھی۔ انہوں نے ہر ایک کو مجبور کیا کہ اسے ان کی بیوی کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے لیکن معاشرہ اس محلے کی کسی لڑکی کو قبول نہیں کرتا۔ جوں ہی اُن کی آنکھ بند ہوئی، خاندان والوں نے اس ڈر سے کہ اسے جائیداد میں حصہ نہ مل جائے، اس بیچاری اور اس کی لڑکی کو نکال باہر کیا۔ اگر یہاں کی کوئی لڑکی فلموں میں کامیاب ہو جائے، صرف اس صورت میں معاشرہ اسے کسی حد تک قبول کرتا ہے۔ اس کو عزت تو دیتے ہیں اور اپنے پاس بٹھا بھی لیتے ہیں لیکن اگر وہ یہاں کی ہے تو اس کو بُرا ضرور کہتے ہیں۔"

زمرد نے اداسی سے کہا: "میں نے تو جی یہاں سے اپنا ہر رشتہ ناتا ہی توڑ دیا تھا، میں تو اس

طرح گئی تھی۔"

میں نے پوچھا: "کیا آپ اپنی مرضی سے یہاں واپس آئی ہیں؟"

اس نے جواب دیا: "جب تک میاں صاحب زندہ تھے انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ ان کے خاندان والے ہمیشہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے بڑی غلطی کی ہے اور جس دن اُن کی آنکھ بند ہوئی انہوں نے اسی دن مجھے دھکے دے کر نکال دیا۔ میرے پاس اور کونسا راستہ تھا؟ میں اپنے خاندان میں واپس آ گئی۔"

محمود گھٹنوں پر کہنیاں ٹکا کر آگے جھکے اور کہنے لگے: "اب یہ یہاں ہے اور کہاں جاتی؟ بیٹی ہاسٹل میں رہتی ہے اور یہ یہاں رہتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے دوبارہ دھندا شروع کر دیا ہے۔ یہ بس اپنے خاندان کے ساتھ رہتی ہے۔ مالی حالات سے مجبور ہو کر اس نے ایک آدھ فلم میں ضرور کام کیا ہے۔"

میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مجھے دیواروں پر زمرد کی تصویریں کہیں نظر نہ آئیں۔ شاید اس کے رخصت ہو جانے پر انہیں اتار دیا گیا ہو۔ محمود اب زمرد سے ایک اور موضوع پر کوئی اپنی بات چیت کر رہے تھے کہ اس شام انہیں کیا کرنا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ زمرد جذبات سے مغلوب ہو جائے۔ پھر انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا:

"ہمارے ساتھ کھلے بندوں ہر قسم کی زیادتیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ذرا سوچیے، یہاں ہم صرف چند بازاروں میں کاروبار چلاتے ہیں۔ اس کی اجازت بھی ہر روز صرف چند گھنٹوں کے لیے ملتی ہے۔ رات گیارہ بجے سے ایک بجے تک۔ اور بس!! ہم نے اس بارے میں سیاست دانوں سے بات کرنے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ضیاء الحق کے مارشل لا میں ہمیں تمام وقت بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑیں اور اس کے بعد بھی وہی حالات ہیں۔ لیڈروں کا تو یہ حال ہے کہ ہمارے پاس صرف الیکشن کے وقت آتے ہیں۔ کئی سیاستدان منشیات کا دھندا کرتے ہیں۔ ایک طرف تو یہ حج کرتے رہتے ہیں اور دوسری طرف جب ان سے ہماری عورتوں کو حمل ٹھہر جاتا ہے تو یہ انہیں اسقاط کرانے پر مجبور کرتے ہیں۔ افسر لوگ بھی عجیب قسم کے ہیں۔ وہ ہمیں انسان تو سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اپنے وطن پاکستان میں ہیں یا اسرائیل میں رہ رہے ہیں۔ یہاں کی کسی گائیکہ کو تو یہ لوگ "ملکۂ ترنم" اور "ملکہ غزل" کا خطاب دے ڈالیں گے اور دوسری طرف محلے کی دوسری عورتوں کو کشتیاں کہیں گے!"

محمود مسائل گنواتے رہے:

"گانے بجانے کا وقت صرف رات گیارہ بجے سے ایک بجے تک کیوں مقرر کیا گیا ہے؟

اس سے پہلے شام کے وقت ہمیں پریکٹس تک نہیں کرنے دیتے۔ رمضان کے پورے مہینے ہم کاروبار نہیں کر سکتے۔ اور کوئی کاروبار ہے جو پورے ایک مہینے کے لیے بند کر دیا جائے؟ پھر محرم میں پورے چالیس دن کے لیے ہم پر بندش پڑ جاتی ہے۔ پاکستان بھر میں صرف نو اور دس محرم کی چھٹی ہوتی ہے۔ شیعہ حضرات تک چالیس دن کی چھٹی نہیں کرتے۔ ہمارے حقوق کو تو کچل کر رکھ دیا گیا ہے۔''

زمرد نے ابرو اٹھا کر یاد دلایا: ''اور بسنت میں بھی تو...''

وہ یہ گفتگو بہت غور سے سن رہی تھی۔ محمود بہت دلجمعی سے بات چیت کر رہے تھے۔ ان کا انداز ایک پختہ کار مقرر جیسا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ مجمعے میں ایسے ہی تقریر کرتے ہوں گے۔ محمود نے فوراً کہا: ''اب بسنت کا تو کیا ذکر کرنا، وہ تو سب کے لیے متنازع بنا ہوا ہے مگر ہمارے لیے تو شب برات اور معراج شریف جیسے مذہبی تہوار منانا بھی مشکل بنا دیا گیا ہے۔ ہماری لڑکیاں صبح کے وقت حاضری کے لیے داتا صاحب چلی جاتی ہیں تو پولیس اور نوکر شاہی ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے کہ وہ کسی اور مقصد سے آئی ہیں۔'' انہوں نے بات جاری رکھی۔

''ایوب خان کے دور میں ہمارے ساتھ اتنی زیادتیاں نہیں ہوئی تھیں۔ اس نے ٹبی گلی کا علاقہ تو بند کر دیا تھا جہاں عورتیں صرف دوسرا دھندا کرتی تھیں۔ گانے بجانے سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ میرے خیال میں تو وہ بھی غلطی تھی۔ ٹبی گلی بند کی گئی تو وہ عورتیں شہر بھر میں پھیل گئیں اور اپنا دھندا کرنے لگیں۔ لوگوں نے اس پر شور مچایا تو بعضوں کو اس علاقے میں واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ یہ علاقہ بند تو اب بھی ہے مگر کاروبار چل رہا ہے۔ ایوب خان نے گانے پر کبھی بندش نہیں لگائی تھی۔ وہ ٹھہرا پٹھان اور ہمارے بڑے بڑے گاہک پٹھان ہی ہیں۔ وہ ہر تہوار پر ہمیں موسیقی اور رقص کے پروگرام پیش کرنے کے لیے بلاتے تھے۔ ایوب خان کے بچوں کی شادیوں میں بھی ہم نے ہلا گُلا کیا۔ اس کی دونوں بیٹیوں اور بہو کا عروسی میک اپ بھی ہماری لڑکی ربیکا نے کیا تھا۔ تو کیا یہ کوئی بری بات کی تھی ہم نے؟ اس کا تو بڑا اونچا سماجی رتبہ تھا اسی لیے اُس کو کسی نے برا نہ سمجھا لیکن جب ہماری لڑکیاں دوسری کسی جگہ جاتی ہیں تو سب انگلی اٹھانے لگتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں اس لیے کچلنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اب شریف گھرانوں کی بہو، بیٹیاں خود ٹیلی وژن پر کام کرنے لگی ہیں۔ ہماری لڑکیوں کی جگہ اب ان کی اپنی لڑکیاں گلوکاری کر رہی ہیں۔ ہمارے لیے تو کہتے رہتے ہیں کہ جی ہم اخلاق بگاڑ رہے ہیں لیکن ان کی اپنی بہو بیٹیاں جب گانا گاتی ہیں تو اس سے کیا 'چادر اور چار دیواری' کو فائدہ پہنچتا ہے؟ کیا وہ اپنے کام کے پیسے نہیں لیتیں۔''

''ہم نے ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۸ء تک ہر طرح ضیاء الحق کا ساتھ دیا مگر ہم پر زیادتیاں ہوتی

رہیں۔ ضیاء الحق ٹی وی پر اس طرح بیان دیتا تھا کہ 'ملکۂ ترنم نور جہاں کا گانا سننے سے میرا ایمان نہیں ٹوٹ جائے گا۔' ذرا غور کیجیے! اتنی بڑی فنکارہ کے لیے ایسی ہلکی بات کہنا کہاں کی تہذیب ہے؟ ایسی باتوں سے ہمارے دل کو کتنی تکلیف پہنچتی ہے!! یہ بڑی بڑی فنکارائیں اس محلے سے ضرور تعلق رکھتی ہیں مگر ان کی بھی عزت ہے۔ ہماری لڑکیاں بھی مذہبی ہیں اور ان کا بھی دل ہے۔ بعض لڑکیاں ایسی ہیں جو دھندا نہیں شروع کرتیں اور ان کی باقاعدہ شادیاں ہوتی ہیں۔ ان کی پرورش بھی الگ رکھ کر کی جاتی ہے۔ ہمارے اپنے رسم و رواج ہیں۔ ہم ان لڑکیوں کو اپنے انداز سے تعلیم دیتے ہیں۔ ان کی تربیت کرتے ہیں۔ ہمارے نظام کو سمجھے بغیر ہمیں بُرا بھلا کہنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ ملک میں جمہوریت آ جائے گی تو ہمارے حقوق بھی بحال ہوں گے مگر ہمارے لیے تو کچھ بھی بہتر ثابت نہیں ہوتا۔ اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔''

''دس پندرہ دن کی بات ہے، یہاں ایک تھانیدار نیا نیا ہے، تو اس نے رات کے گیارہ بجے مجھے بلایا۔ اس نے مجھے بلا کر بٹھا لیا اور کہنے لگا کہ کچھ پولیس افسروں کو مجھ پر اعتراض ہے کہ میں رات کو بازاروں میں گھومتا پھرتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ میرا علاقہ ہے اور میں یہاں کے عوام کا لیڈر ہوں تو میں کیوں نہ گھوموں پھروں۔ میں نے ان سے کہا کہ ایسا اعتراض اس سے پہلے تو کسی نے نہیں کیا تھا۔ بات یہ ہے کہ یہاں سے ہم دوبار الیکشن جیتے ہیں اور اس مرتبہ آئی جی پولیس اپنے امیدوار کو جتوانا چاہتے ہیں۔''

میں نے ہمدردی سے یہ باتیں سنیں اور محمود صاحب کو بتایا کہ اس قسم کی زیادتیاں پہلے بھی میرے علم میں آئی ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا: ''اب آپ کی تنظیم کا حکومت سے کیا مطالبہ ہے؟''

کھیر کے بڑے بڑے چمچے نوش کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ''ہم چاہتے ہیں کہ ۱۹۷۰ء والے قوانین پر عمل کیا جائے۔ تب ہمیں کچھ تحفظ حاصل تھا۔ ہم اپنے گھروں میں آزادی سے فن کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔''

پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا:

''پہلے ہائی کورٹ نے حکم نامہ نکالا تھا کہ ہم ساڑھے دس بجے سے ایک بجے تک کاروبار کر سکتے ہیں۔ لیکن اب گیارہ بجے سے پہلے کچھ نہیں کر سکتے۔ پہلے ہمیں یہ سہولت تھی کہ ہم جب اپنی لڑکیوں کو گانے وانے کے لیے کہیں باہر لے جاتے تھے تو پولیس میں اطلاع کر کے جاتے تھے۔ اس طرح ہمیں تحفظ مل جاتا تھا کہ باہر کوئی غلط قسم کا واقعہ نہ ہو۔ یہ سہولت دوبارہ ملنی چاہیے۔ اب تو جی یہ حال ہے کہ سرکاری پابندیاں تو اپنی جگہ، پولیس نے جینا حرام کر دیا ہے۔ سرکاری پابندیوں کو ہم

سے پیسہ بٹورنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہ لوگ ہمیں اس طرح کبھی نہیں دبا سکیں گے۔''

''آجکل لڑکیوں کو شادی بیاہ، سالگرہ وغیرہ کے لیے بھیجنا ممکن ہی نہیں رہا۔ ہر وقت ہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی بہانے سے انہیں پولیس گرفتار نہ کر لے۔ ہمارے بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ پولیس کی چیک پوسٹیں جگہ جگہ لگی ہوئی ہیں۔ کوئی بھی مرد اور عورت ساتھ جا رہے ہوں تو پولیس ان کے رشتے کی پوچھ گچھ شروع کر دیتی ہے۔ لڑکی کہے کہ وہ استاد یا بھائی کے ساتھ جا رہی ہے تو وہ لوگ یقین ہی نہیں کرتے۔ کہتے ہیں 'اوہو! تم لوگوں کے بھائی بھی ہوتے ہیں کیا؟؟' ہم اس سلوک کے خلاف پُر زور احتجاج کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ پابندی سے زکوٰۃ اور عشر دیتے ہیں۔ ہم بڑی خوشی سے کھانا کپڑا وغیرہ خیرات کرتے ہیں، ہر قسم کے چندے دیتے ہیں۔ کسی کی جائیداد ہے تو اس کا ٹیکس ادا کیا جاتا ہے۔ بجلی، پانی کے بل یہاں لوگ کمرشل ریٹ پر دیتے ہیں۔ رقم وصول کرتے وقت تو ہم مسلمان بھی ہو جاتے ہیں اور پاکستانی بھی مگر جب ہمارے حقوق کی بات آتی ہے تو سب لوگ نظر بدل لیتے ہیں۔''

یہ سب کہتے ہوئے محمود صاحب کی آواز کافی بلند ہوگئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ حکام بالا تک پہنچانے کے لیے وہ دل کی بھڑاس پوری طرح نکالنا چاہتے ہیں اور یہ موقع ملنے پر بہت خوش ہیں۔ انہوں نے جوش میں آ کر کہا: ''ہم کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگتے۔ ہم اپنے لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہوگا مگر یہاں ہماری حالت قیدیوں سے بدتر ہے۔ قیدی جیل خانے میں گھوم پھر تو سکتے ہیں لیکن ہماری کوئی لڑکی گلی میں قدم رکھے تو پولیس شک کرنے لگتی ہے اور بہت پریشان کرتی ہے۔ اگر ہم قانون کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں تو ہم پر جھوٹے مقدمے قائم کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ دوسری طرف وہ ہم پر ناجائز ہتھیار رکھنے، منشیات کا دھندا کرنے اور جوا کھیلنے کے من مانے جھوٹے مقدمے بناتے رہتے ہیں۔ مجھے بھی ایک مرتبہ جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ میرے لیے پورا محلہ سڑک پر نکل آیا۔ پولیس والوں کا کہنا تھا کہ علاقے میں سب کچھ میں ہی کرواتا ہوں۔ آخر صوبائی اسمبلی کے ایک ممبر نے بیچ میں پڑ کر مجھے رہا کروایا۔ مگر فائدہ کوئی نہیں ہے۔ یہ سیاست دان ہی ہیں جو ہمیں اندر کروا دیتے ہیں اور پھر رہا کرواتے ہیں تاکہ ہم ان کے احسان مند ہو جائیں۔''

''میں آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں۔ سات اور آٹھ مئی کی درمیانی رات کی بات ہے، رمضان کی بیس اور اکیس تاریخ تھی۔ ہم حضرت علیؓ کی زیارت نکالنے والے تھے۔ اس کے لیے مردوں اور عورتوں کے جلوس کا الگ الگ راستہ طے کرنا ہوتا ہے۔ یہاں پولیس نے بیچ سڑک پر چیک پوسٹیں لگا رکھی ہیں۔ میں نے میٹنگ بلا کر زیارت کے خرچے کے لیے چندہ جمع کیا تھا۔ اس سے اکیسویں

روزے کی افطار بھی ہوئی تھی۔ یقین کریں کہ پولیس نے مجھ پر جوئے کا الزام لگا دیا۔ میں یہاں عوام کا لیڈر ہوں اور خود شیعہ ہوں۔ میں شیعہ تنظیم کا سیکریٹری بھی ہوں۔ وہاں میں چندے کی رقم ہاتھ میں لیے لڑکوں میں تقسیم کر رہا تھا کہ لوگوں میں تبرک بانٹ سکیں کہ پولیس نے چھاپہ مار دیا اور ہمیں پکڑ لیا۔ وہ ہمیں گھسیٹ کر تھانے لے گئے اور مارنا شروع کر دیا۔ سارا جھگڑا اس طرح شروع ہوا۔ یہاں لوگ نکل آئے اور انہوں نے کھلی عدالت کا مطالبہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ باہر کا کوئی آدمی آ کر غیر جانبداری سے فیصلہ کرے کہ یہ الزام سچ ہے یا جھوٹ ہے۔ آپ بتائیں کہ کوئی بندہ جو حضرت علیؑ کی زیارت کا بڑھ چڑھ کر کام کر رہا ہے، وہ رمضان شریف کے مہینے میں جوا کیسے کھیلے گا؟"

"ہم نے قانونی راستہ اختیار کیا۔ اس پر افسر شاہی نے ہمیں دبانے کی اور بھی کوشش کی۔ انہوں نے پورا زور لگا لیا مگر انہیں پتا نہیں تھا کہ ہم دبنے والے نہیں ہیں۔ معاشرہ ہمارے ساتھ اتنا ظلم کیوں کرتا ہے؟ ہم معاشرے کو آرٹ، موسیقی اور شاعری سمیت سب کچھ دیتے ہیں اور ہمیں معاشرہ کیا صلہ دیتا ہے؟"

اس گفتگو کے اختتام پر محمود اور زمرد نے مجھے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ انہوں نے مجھے دعوت دی کہ میں دوبارہ آؤں اور ان لوگوں سے ملتی رہا کروں۔ اس محلے پر میرے کام میں انہوں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ میں نے اس کے اگلے اتوار محمود کے ساتھ دوسرے کوٹھوں پر جانے کا منصوبہ بنا لیا۔

جب میں واپس اسلام آباد پہنچی تو دفتر میں عارف سے ملاقات ہوئی اس نے پوچھا: "واپس آ گئی ہو؟ ملاقات ہوئی؟"

میں نے مسکرا کر جواب دیا: "میں نے اس کے ساتھ کھایا پیا، خوب باتیں کیں اور دوبارہ ملنے کا پروگرام بھی بن گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور میں کیا چاہ سکتی تھی؟"

میں صبح کے وقت ایک دفتری میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے تیز قدموں سے جا رہی تھی۔ عارف دوڑا آیا کہ میرے ساتھ چل سکے۔ میرے جواب نے اس کو حیران و پریشان کر دیا تھا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا:

"تو... تو... پھر کیسا رہا؟"

"کھیر بہت مزیدار تھی!" میں نے جواب دیا اور میٹنگ میں چلی گئی۔

تاثرات

ایک سرکاری افسر

میں جاننا چاہتی تھی کہ کسی سرکاری افسر سے یہ پوچھوں کہ وہ شاہی محلے کے کاروبار کے بارے میں کیا اقدام اٹھا رہے ہیں۔ جس شخص سے میری ملاقات ہوئی وہ اس کاروبار کو بند کرنے کے بھرپور حق میں تھا۔ اپنی بڑی سی میز کے پیچھے اکڑ کے بیٹھے ہوئے افسر نے کہا، "کیا تمہارا خیال ہے کہ ہم ان لوگوں سے پیار سے نمٹ سکتے ہیں؟ یہ لوگ کبھی اپنا پیشہ آسانی سے نہیں چھوڑیں گے۔ اور یہ دلال تو اسمگلر ہوتے ہیں کہ جیسے ہیں ویسے ہی رہیں۔ ہمیں ان سے بڑی سختی سے نمٹنا پڑے گا۔ ہم نے ان کی ترقیات کار پر کڑی پابندی عائد کر دی ہے۔ اور یہاں صرف ناچنے گانے کی اجازت دی ہے اور کچھ نہیں۔" وہ زور سے بولا۔ "دیکھیے یہاں قانونی طور پر تو انکو صرف ناچنے گانے کی اجازت ہے لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ یہ کیا کچھ نہیں کرتے۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ ان کو ہراساں کیا جاتا ہے تو یہ سب ان کی کرتوتوں کی وجہ سے ہے۔"

"آپ یہ بتائیں"، میں نے بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ جو کاروبار پورے لاہور میں پھیل رہا ہے اس وجہ سے کیونکہ محلے میں پولیس تنگ کرتی ہے اور ان سے پیسے بھی وصول کرتی ہے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ لوگ یہ کاروبار لاہور کے دوسرے علاقوں میں زیادہ پرسکون ہو کر کر رہے ہیں۔ اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ پولیس یہ سب سختیاں دکھاوے کے لیے کرتی ہے۔ اندر سے یہ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں۔"

"آپ یہ اچھی طرح سمجھ لیں"، افسر نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ہم ان کے ساتھ سختی سے ہی پیش آئیں گے۔ ان گناہ کے راستوں پہ چلنے والوں سے نمٹنے کا یہی طریقہ ہے۔"

"اچھا! لیکن پولیس اُن کے ایسے گاہکوں سے سختی کیوں نہیں کرتی جو رات ایک بجے کے بعد آتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے سیاستدان اور افسران وغیرہ۔" میں نے پوچھا۔

"کیا مطلب"، افسر صاحب حیرانی سے بولے، "وہاں رات ایک بجے کے بعد کوئی نہیں آتا۔"

"جی میں نے خود دیکھا ہے۔" میں نے وثوق سے کہا۔

"بالکل بکواس!" وہ غصے میں زور سے بولے، "یقیناً وہاں کے رہائشی ہونگے۔ گاہک نہیں۔"

"کیا آپ کا خیال ہے کہ آپ یہ کاروبار بند کرا سکتے ہیں؟" میں نے بالواسطہ سوال کیا۔

"کیوں نہیں ہمیں اپنی پوری کوشش کرنی چاہیے تاکہ معاشرے سے اس ناسور کا خاتمہ کیا جاسکے۔ اور میں یہ نہیں سمجھتا کہ ہم انہیں ہراساں کر رہے ہیں۔" اس نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا، "میں تو چاہتا ہوں کہ ہم اس برائی کو کچل ڈالیں۔ یہ تو معاشرے کا گند ہیں۔ ہمارا معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ ہے اور ہمیں ایسی برائیوں کا خاتمہ کرنا ہوگا۔" انہوں نے نہایت جوش میں میز پر مُکا مارتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی بات کسی حد تک سمجھ رہی ہوں گو میں اس کے حق میں نہیں"، میں نے کہا، "آپ یہ بتائیے کہ یہ دوغلاپن نہیں تو اور کیا ہے کہ پولیس جب چھاپے مارتی ہے تو با اثر افراد کو گرفتار نہیں کرتی۔ اور یہ پولیس اتنا بھتا جو وصول کرتی ہے اور یہ نئی تھانے کی پکڑی لاہور میں سب سے زیادہ اہم کیوں ہے کہ ہر پولیس کا افسر رشوت کے بل بوتے پر یہاں تبادلہ کرواتا ہے اور یقیناً ٹھیک ٹھاک کمائی بھی کرتا ہوگا۔"

"یہ سب سُنی سنائی باتیں ہیں۔" سرکاری افسر غصے سے بولا، "ہم سارے شہر میں پھیلی طوائفوں سے نہیں نمٹ سکتے۔ جہاں وہ ایک ساتھ ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں جیسے کہ (ہیرا)

شاہی محلہ وہاں ہم ان کے خاتمے کی بھرپور کوشش کریں گے۔"

میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا، "کیا آپ لوگوں کو یہ سمجھ نہیں آتا کہ جتنا آپ اُن پہ سختی کریں گے یہ لوگ اتنی ہی تیزی سے سارے شہر میں پھیلتے جائیں گے۔ دوسری جگہ انہیں دھندا کرنے میں آسانی ہے۔ یہ نئی طرز کے کوٹھی خالے بناتے ہیں جہاں دلال زبردستی دوسری عورتوں کو بھی اس دھندے میں پھنساتے ہیں۔ یہاں محلے میں عورتیں کم از کم اپنے خاندانوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ یہ جو نئی طرز کے کوٹھے ہیں ان میں تو عورتوں کو صرف استعمال کیا جاتا ہے اور جب وہ کسی قابل نہ رہیں تو ان کو پھینک دیا جاتا ہے۔ اور آپ لوگ اس نئے رواج کو پروان چڑھا رہے ہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔" وہ بولا، "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان کی زندگی اسقدر مشکل بنا دوں کہ وہ اپنا پیشہ چھوڑ دیں۔"

باب ۹

سالِ نو کے موقع پر

میں شاہی محلے میں تحقیقی کام میں اس طرح غرق ہوگئی تھی کہ اسلام آباد میں اپنے دوستوں سے ملنا تقریباً ترک ہوگیا تھا۔ ہر ہفتہ وار چھٹی کے دن اور اس کے علاوہ جب موقع مل سکے، میں وہیں پہنچی ہوتی تھی۔

جب نیا سال آیا تو میں لاہور میں ہی تھی۔ موسمِ سرما کی تعطیلات کا زمانہ تھا اور میرے ڈھیروں کزن لاہور میں موجود تھے۔ ان ہی دنوں، میری ایک اسلام آباد کی دوست سارہ کا ٹیلی فون آیا کہ وہ بھی لاہور آئی ہوئی ہے اور وہ اور اُس کا امریکی شوہر نئے سال کے موقعے پر میرے ساتھ شاہی محلے جانا چاہتے ہیں۔ سارہ پیدا تو پاکستان میں ہوئی مگر اس کی پرورش بیرونِ ملک ہوئی تھی۔ میری دوسری کزنوں نے ٹیلی فون پر ہماری گفتگو سُنی تو وہ بضد ہوگئیں کہ وہ بھی ضرور ہمارے ساتھ چلیں گی۔

ان کے اصرار پر میں گھبرائی تو ضرور لیکن ان لڑکیوں کا بھی کیا قصور تھا۔ معاشرے نے اس علاقے کے اردگرد ایسا پُر اسرار جال بُن دیا ہے کہ وہاں جانے کا خیال کسی کو بھی بڑا پُرکشش محسوس ہوتا ہے۔ یہ تینوں لڑکیاں، جن میں دو بی اے اور تیسری یعنی فائزہ ایم اے کی طالبہ تھی، میرے پیچھے پڑ گئیں کہ ان کو شاہی محلے لے چلوں۔ وہ تفریح کا کوئی موقع تلاش کررہی تھیں۔ پڑھائی یا رنگ برنگے لباس پہن لینے کے علاوہ ان کی زندگی اکتا دینے والی یکسانیت سے بھری ہوئی تھی۔ شاہی محلّہ میں سیر کرنے کے خیال نے اُن میں بجلی کی رَو دوڑا دی تھی اور وہ ہر قیمت پر اس مُہم میں حصہ لینا چاہتی تھیں۔

سعدیہ نے میری منت کی ''پلیز، پلیز، ہمیں لے چلیے۔ میں نے طوائفوں کے بارے میں

بہت سے افسانے پڑھے ہیں اور میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔''

میں نے کہا: ''مگر بھئی، وہ بالکل عام عورتوں جیسی ہیں۔ بالکل ہم جیسی...''

فائزہ بولی: ''لیکن ہم نے تو نہیں دیکھیں نا! پتا ہے، ایک بار میری ایک دوست کار میں وہاں سے گزری تھی۔''

''ہائیں!'' لڑکیوں نے چونک کر پوچھا: ''اکیلی گئی تھی؟''

''نہیں، بیوقوف!!'' فائزہ نے کہا۔ ''اس کا بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ ان کے ساتھ وہ بھی چلی گئی۔''

سعدیہ نے مسرت سے کہا: ''بڑی خوش قسمت ہے تمہاری دوست! میرا بھائی تو اس کے بدلے مجھے جان سے ہی مار ڈالے!''

میں نے کہا: ''تو پھر آخر تم یہ کیوں چاہتی ہو کہ میں تم لوگوں کو وہاں لے جاؤں؟ کیا اس لیے تاکہ تمہارے گھر والے مجھے کوسیں؟؟''

فائزہ نے کہا ''کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ میری دوست نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں اس نے بڑے انوکھے منظر دیکھے۔ خوب روشنیاں، جھروکوں میں وہ بڑے شاندار لباس پہنے کھڑی ہوتی ہیں، سازندے آس پاس بیٹھے ہوتے ہیں۔''

سعدیہ اور روبی آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سُن رہی تھیں۔

''کیا وہ کسی کوٹھے پر بھی گئی؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے توبہ کیجیے!'' فائزہ چیخ پڑی ''کوٹھے پر جانا تو دور کی بات ہے، وہ لوگ تو مارے ڈر کے کار سے بھی نہیں اترے۔ بس کار میں بیٹھے بیٹھے وہاں سے گزرے اور پھر واپس آ گئے۔ پہلے ان کا ارادہ تھا کہ پھجے پائے والے کی دکان سے پائے کھائیں گے، مگر پھر ہمت نہیں ہوئی۔''

سعدیہ نے تجسس سے پوچھا ''اُن کے والدین کو معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟''

فائزہ رکھائی سے ہنسی ''سعدیہ، تم بھی کتنی احمق ہو! والدین کو ایسی باتوں کا علم نہیں ہو سکتا۔ وہ تو جان ہی لے لیں۔ اُس جگہ کسی کے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں تو لڑکیوں کو اغوا کر کے زبردستی طوائف بنا دیا جاتا ہے۔ تم نے فلموں میں نہیں دیکھا۔''

''اوہو!'' میں نے اس کی بات کاٹی ''اگر فلموں والے کوٹھوں کا خیال ہے تو وہاں نہ جانا۔ فلموں میں جو دکھایا جاتا ہے وہ تمہیں شاہی محلے میں نظر نہیں آئے گا۔ فلموں میں تو یہ فلمساز اپنے خواب و خیال ہی دکھاتے رہتے ہیں۔ یہ مغلیہ دور کی سنی سنائی باتیں پیش کرتے ہیں اور وہ بھی آج

کے ماحول میں۔ تب وہاں بڑی بڑی حویلیاں ہوتی ہوں گی۔ فلموں میں دکھائے جانے والے ایک کوٹھے میں شاہی محلے کے دس کوٹھے سما جائیں۔ ان کے کمرے تو بڑے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ طوائفیں بھی فلمی کرداروں جیسی نہیں ہوتیں۔ وہ پشواز وغیرہ نہیں پہنتیں، نہ ان کے ملبوسات اور زیورات ویسے جگمگ کرتے ہیں۔ یہ عورتیں کافی اجڈ اور شور مچانے والی ہوتی ہیں، ریکھا اور مینا کماری یا پاکستانی فلم اسٹار رانی کی طرح مہذب نہیں ہوتیں۔ ان کے گھنگرو اتنا شور کرتے ہیں کہ گانا سنائی تک نہیں دیتا۔ کافی عورتوں کی آوازیں بہت خراب، بالکل پھٹے ڈھول کی سی ہوتی ہیں۔ کوئی کوئی ہی ہے جو ٹھیک سے گا سکے۔ ان میں جو شکل، صورت سے اچھی ہوتی ہیں ان کو فلم والے لے اڑتے ہیں۔ اس علاقے کے حصے میں بس 'باقی ماندہ' ہی آتی ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ میرے بیان نے ان لڑکیوں کو مایوس کر دیا۔ ان کے منہ اتر گئے۔ میں نے کہا ''معاف کرنا مگر اس محلے کا اب یہی حال ہو گیا ہے۔ گاہکوں میں اچھی موسیقی کا ذوق نہیں ہے۔ انہیں بس واہیات قسم کی شہوانیت سے دلچسپی ہے۔ اس لیے ناچ میں بھی نفیس بھاؤ اور فنکاری کی جگہ مذموم اشارے شامل ہو گئے ہیں۔ ان گیتوں اور رقص کے ذریعہ وہاں محبت کی دھیمی دھیمی آنچ نہیں سلگائی جاتی، بڑے اکھڑ طریقے سے سودے بازی ہوتی ہے۔ یہ سب سن کر وہاں جانے کا تمہارا ارادہ ضرور بدل گیا ہوگا؟''

''نہیں!'' سب نے ایک ساتھ پُرزور انکار کیا۔ وہ سب اکٹھی بولنے لگیں ''ہم جانا چاہتی ہیں۔ پلیز ہمیں لے چلیے! ہمیں ایسا موقع زندگی بھر کبھی نہیں ملے گا۔ پلیز... اتنا ظلم نہ کیجیے۔''

لڑکیاں میری منت سماجت کیے جا رہی تھیں۔ اس اثنا میں سارہ اور اس کا شوہر آ پہنچے۔ لڑکیاں سارہ سے سفارش کی درخواست کرنے لگیں۔ میں نے کہا کہ میں ان کو صرف اس صورت میں لے جاؤں گی اگر وہ اپنے والدین سے اجازت حاصل کر لیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اجازت انہیں کبھی نہ ملتی۔ اس لیے وہ الٹا مجھے شرمسار کرنے لگیں کہ میں یوں تو عورتوں کے حقوق کی علمبردار بنی پھرتی ہوں لیکن ان عاقل و بالغ لڑکیوں کی معمولی سی خودمختاری تک تسلیم نہیں کرتی کہ انہیں شاہی محلہ جانے کے لیے والدین سے اجازت لینے کی قطعی ضرورت نہیں۔ آخر کار مجھے ان کی بات ماننی ہی پڑی۔

یہ ذمہ داری اتنی بڑی تھی کہ میں نے اپنے ایک کزن محسن کو ٹیلی فون کیا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چلے۔ ''ان ڈھیر سارے مہمانوں کو سنبھالنے کے لیے میرے ساتھ سمجھ دار شخص کا ہونا ضروری ہے۔'' میں نے سوچا۔ اس نے اپنے والدین کو ہوا بھی نہ لگنے دی اور سیدھا میری چچی کے گھر پہنچ گیا۔ تقریباً ۳۰ برس کا میرا یہ کزن بہت ذمہ دار تھا۔ میں نے لیلیٰ کو بھی ٹیلی فون کر کے خبردار کر دیا

کہ ہم نازل ہونے والے ہیں۔

یہ قافلہ دو کاروں میں روانہ ہوا۔ میں نے اسی جگہ گاڑی پارک کی جہاں اس سے پہلے کرتی رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح آس پاس کے دکانداروں سے گاڑیوں پر نظر رکھنے کی درخواست کی۔ لڑکیاں اب بالکل سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ انہیں یہاں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ گھبراہٹ میں انہوں نے وہی کیا جو ایسے موقعوں پر پاکستانی لڑکیاں کرتی ہیں یعنی بے مقصد کھی کھی کر کے ہنسنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے چہرے بھی چھپا لیے کیونکہ انہیں اچانک احساس ہوا کہ اگر یہاں کسی جاننے والے نے انہیں دیکھ لیا تو ان کی شامت آ جائے گی۔

میں لیلیٰ کے گھر کی طرف چل دی لیکن مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی بھی نہیں آ رہا، نہ سارہ، نہ محسن اور نہ سارہ کا شوہر۔ میں نے مڑ کر دیکھا کہ تینوں لڑکیاں دوپٹوں میں سر سے پیر تک لپٹی وہیں کار کے پاس کھڑی تھیں جیسے زمین میں گڑ گئی ہوں۔ میں حیران رہ گئی کہ وہ اس جگہ سے اور یہاں دیکھ لیے جانے سے کس قدر خوفزدہ تھیں۔ میں نے انہیں ڈانٹ پلائی ''ذرا نارمل رہنے کی کوشش کرو! اس طرح گٹھڑیاں بن کر چلو گی تو لوگوں کی نظریں اور بھی اٹھیں گی۔'' انہوں نے دوپٹے کچھ ڈھیلے تو کر دیئے مگر چہرے پھر بھی چھپائے رکھے۔ تینوں لڑکیاں آپس میں کھسر پھسر باتیں کر رہی تھیں اور یہاں آنے پر ایک دوسرے کو الزام دے رہی تھیں۔

دوسری طرف سارہ اس قدر امریکی بن چکی تھی کہ وہ ہر راہگیر کو ''ہیلو ہائے!'' کہتی جا رہی تھی۔ لوگ اسے حیرت سے تک رہے تھے۔ میں نے اسے اپنے پاس گھسیٹ کر گلی کے لوگوں سے خواہ مخواہ مخاطب ہونے سے منع کیا۔ میں نے کہا کہ یہاں سڑکوں پر رات کے وقت ان لوگوں نے صرف طوائفوں کو دیکھا ہے اور اب یہ اندازہ لگا رہے ہیں کہ ہم بھی طوائفیں ہیں یا نہیں اس لیے تم ہر ایک سے سلام دعا مت کرو۔ سارہ کا شوہر گورا امریکی تھا۔ وہ وہاں گھومتا ہوا کوئی سیاح ہی نظر آ رہا تھا اور اسے بھی لوگ بار بار دیکھ رہے تھے۔ وہ ان نگاہوں کے جواب میں ادھر ادھر مسکراہٹیں بکھیر رہا تھا اور انہیں دیکھ دیکھ کر سر ہلا رہا تھا۔ ان سب میں صرف محسن سمجھداری سے کام لے رہا تھا۔ میں نے اسے تینوں لڑکیوں کے پیچھے پیچھے چلتے دیکھا۔ ''شکریہ محسن!'' میں نے دل میں کہا۔ ''اس ٹولی کے ساتھ مجھے یقیناً تمہاری مدد کی ضرورت تھی۔''

کچھ دن بعد محسن نے مجھے بتایا کہ اس وقت اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس سے پہلے اس نے کبھی اس محلے میں قدم نہیں رکھا تھا اور اس وقت وہ خود کو کوس رہا تھا۔ ''فوزیہ کی باتوں میں آ کر میں کیا کر بیٹھا ہوں۔ فوزیہ تو ہر ایک کو آفت میں ڈالتی ہی رہتی ہے۔'' وہ سوچ رہا تھا۔ وہ واقعی

محسوس کر رہا تھا کہ یہاں آ کر اس نے اپنا پورا مستقبل داؤ پر لگا دیا ہے۔ یہ سن کر میں خوب ہنسی۔

لیلیٰ کے کوٹھے پر پہنچ کر سب نے اطمینان کی سانس لی۔ ان لڑکیوں نے محسوس کیا کہ لیلیٰ کے گھر کا وہ کمرہ واقعی بالکل عام گھروں کی طرح تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں ایک رقاصہ اور چند سازندے بھی موجود تھے۔ لیلیٰ کو دیکھ کر میری ان دوستوں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ اس کو ایسی نظروں سے تک رہی تھیں گویا وہ عورت نہیں، کوئی بالکل انوکھی مخلوق تھی۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر میں ہنسی ضبط نہ کر سکی۔ میں نے کہا "لیلیٰ! کیوں نہ تم ان لوگوں سے بات چیت کرو، تب تک میں تمہاری امّی سے مل آتی ہوں۔" اس دن قیصرہ کی طبیعت ناساز تھی۔ میں اندر والے کمرے کی طرف چل دی۔ لیلیٰ سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی اور کافی اِترا رہی تھی۔ اس نے فوراً اپنی انگریزی کی نمائش شروع کر دی تھی۔ لڑکیاں اسے اس طرح چھو چھو کر دیکھ رہی تھیں جیسے مریخ سے ابھی ابھی آئی ہو۔

امریکہ میں پلی بڑھی سارہ سازندوں سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں باتیں کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ سازندے جانتے تھے کہ وہ میری دوست ہے اس لیے وہ اس کا مذاق نہیں اڑانا چاہتے تھے لیکن سارہ کی انگریزی نما اردو ان کے بالکل پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ ایک سازندے نے مجھے دیکھ کر آواز دی، "ڈاکٹر صاحبہ! یہ لڑکیاں آپ کو بُلا رہی ہیں۔" میں نے مڑ کر دیکھا تو اس نے چپکے سے کہا "ایہہ ولیتی ککڑی کتھوں لے آوندی اے۔" (آپ یہ ولایتی مرغی کہاں سے پکڑ لائی ہیں)۔ میں نے اس سے کہا "چپ کرو!"

سارہ فرش پر بیٹھی موسیقی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسرے سب لوگوں نے فرشی نشست کے قاعدے کے مطابق جوتے اتار دیئے تھے مگر سارہ کا امریکن شوہر اپنے کاؤبوائے لمبے بوٹ پہنے، ایک فراخ مسکراہٹ چہرے پر سجائے کمرے میں ادھر سے ادھر مٹرگشت کر رہا تھا۔ لڑکیاں لیلیٰ کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ ان کا تجسس دیکھ کر میں ایک بار پھر ہنس پڑی۔ لیکن مجھے یاد آیا، جب میں پہلی بار لیلیٰ کے گھر آئی تھی تو وہ مجھے بالکل اسی طرح تجسس سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے بھی میرے بال اسی طرح چھو کر دیکھے تھے۔

لیلیٰ نے گانا شروع کیا۔ وہ ہمیشہ مُجرے کا ایک ہی گیت سے آغاز کرتی تھی۔ وہ گھونگھٹ نکال کر بیٹھ جاتی تھی اور ایک طویل الاپ کے ساتھ آہستہ آہستہ دونوں ہاتھوں سے گھونگھٹ اٹھا کر حاضرین کو اپنے حسن کا جلوہ دکھاتی تھی۔ وہ گیت جو لیلیٰ گاتی تھی، ایک پرانا ہندوستانی فلمی گانا تھا، "گھر آیا میرا پردیسی..." کوٹھے کے گیتوں میں ساز و آواز کا سنگم ٹی وی کی ریکارڈنگ یا اسٹیج شو

سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ گانے والی کے پاس مائیکروفون نہیں ہوتا اور ساز سنگت دینے کی بجائے آواز پر غالب آنے کی کوشش کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ اوپر سے یہ گانے والیاں، گھنگروؤں کے ذریعے رقص کے قدموں کی نفاست اجاگر کرنے کی جگہ انہیں شور برپا کرنے والی ایک چیز کی طرح استعمال کرتی ہیں۔

میری دوستوں کو گانے سنتے ہوئے بے حد مزا آ رہا تھا۔ میں نے گوبا سے ہزار روپے کا نوٹ بھنوا لیا تھا اور ایک ایک روپے کی گڈیاں حاصل کر لی تھیں۔ میں نے اپنی دوستوں میں یہ گڈیاں تقسیم کر دی تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہاں فنکارہ کو رقم اس طرح دی جاتی ہے کہ اس کے قریب جا کر اس پر ان روپوں کی بارش کی جائے۔ میں نے انہیں دوسرا طریقہ بھی بتایا کہ نوٹ کسی کے سر پر رکھ دیئے جائیں۔ طوائف اس شخص کے سامنے رقص کے بھاؤ دکھاتی ہے اور نوٹ اٹھا لیتی ہے۔ مرد تماش بین کبھی کبھی لطف لینے کے لیے نوٹ اپنے کسی دوست کے گال پر بھی رکھ دیتے ہیں۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ طوائف اس آدمی کو لبھانے کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں طوائف نوٹ اٹھاتے ہوئے رخسار پر چٹکی بھی بھر لیتی ہے۔

مہمانوں کی ٹولی موج میں تھی۔ ہمارے علاوہ کمرے میں دوسرے حاضرین نہیں تھے اور ماحول بڑا ''گھریلو'' قسم کا بن گیا تھا۔ پہلا گیت ختم کر کے لیلیٰ نے لڑکیوں کی فرمائش کے بارے میں دریافت کیا۔ سارہ نے فوراً کسی کلاسیکی گیت کا نام لیا۔ لیلیٰ بے چاری شش و پنج میں پڑ گئی۔ میں لڑکیوں کو یاد دلایا کہ اس محلے سے کلاسیکی موسیقی رخصت ہو چکی ہے۔ یہاں ایک گلوکارہ شاہدہ کے علاوہ اب کلاسیکی سنگیت کوئی نہیں گاتا۔ لیلیٰ نے کہا کہ وہ انہیں پنجابی فلمی گانے اور غزلیں سنا سکتی ہے۔ لڑکیوں نے بڑی سوچ بچار کے بعد ایک مقبول پنجابی فلمی گیت ''سونے دیا کنگنا...'' کی فرمائش کی۔ جسے لیلیٰ نے بخوشی قبول کر لیا اور پورے جوش و خروش کے ساتھ یہ گانا گانے لگی۔ لڑکیوں کو اتنا لطف آیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ دھیمے سُروں میں گنگنانے لگیں۔

اس وقت میری نظر دو بچوں پر پڑی جو خاموشی سے آ کر ایک گوشے میں بیٹھ گئے تھے۔ ان کی عمر سات برس کے قریب ہو گی۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ میں نے پہلے انہیں یہاں نہیں دیکھا تھا۔ ان کے پاس پھول یا نوٹوں کی گڈیاں بھی نہیں تھیں جن کی گاہکوں کو ضرورت پڑ سکتی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید وہ چائے کی دکان سے آئے ہوں۔

اتنے میں لیلیٰ کی ماں کمرے میں آ گئی۔ اس نے میری دوستوں سے سلام دعا کی۔ لڑکیاں اشتیاق کے مارے ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرنے لگیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے

کرنے لگیں۔ وہ سر کی جنبش سے مجھ سے بھی کچھ پوچھنا چاہتی تھیں مگر میں نے انہیں بالکل نظر انداز کر دیا۔ میں شرمندگی سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ نہ جانے ان لڑکیوں نے کیوں سوچ لیا تھا کہ قیصرہ ان کی ان حرکتوں پر توجہ نہیں دے گی۔ اسے واقعی تیز بخار تھا اور وہ ذرا دیر میں واپس چلی گئی۔

فائزہ نے میرے کان میں زور سے کھسر پھسر کی۔ "یہ.... جو ابھی آئی تھی.... یہ نائیکہ ہے نا! نائیکہ!!!"

میں نے فائزہ پر نظر ڈالی۔ نائیکہ! جیسا فلموں میں دکھایا جاتا ہے، ہیرو اور ولن سے وہی سودا کرتی ہے۔ ہیرو معصوم ہیروئن کو اٹھا کر لے جاتا ہے تاکہ نائیکہ اس کا پہلا سودا طے کر کے اسے طوائف نہ بنا دے۔ ہیرو کا خاندان طوائف سے شادی کی خواہش کرنے پر اسے چھوڑ دیتا ہے۔ ہیرو بھی اپنے خاندان کو خیر باد کہتا ہے اور ہیروئن کے ساتھ کسی چھوٹے سے شہر میں روپوشی اختیار کر لیتا ہے۔ اس موقع پر نائیکہ دلالوں اور ملازموں کی فوج لے کر نمودار ہوتی ہے اور لڑکی کو واپس لے جاتی ہے۔ اگر کہانی مزید ڈرامائی ہو تو نائیکہ اس وقت نمودار ہوتی ہے جب ہیروئن پہلی اولاد کو جنم دیتی ہے اور جو لڑکی ہوتی ہے۔ نائیکہ اس نوزائیدہ بچی کو بازارِ حسن میں لے جاتی ہے۔ ہیرو وہاں جا کر لڑائیاں لڑتا ہے اور اپنی "عزت" کو اس بازار سے بچا کر لے آتا ہے۔ پورے برصغیر میں فلم دیکھنے والے عوام کی نظر میں "نائیکہ" طوائف کے پیشے کے شر اور برائی کا مکمل ترین مجسمہ ہوتی ہے۔

میں نے فائزہ کے حیرت سے کھلے منہ کو دیکھا اور، ہنس کر کہا: "ہاں فائزہ! وہ نائیکہ ہے۔"

کچھ دیر بعد ہماری تواضع کھیر اور دودھ کے گلاسوں سے کی گئی۔ لڑکیوں نے بہت شوق سے پستے، بادام والا دودھ لمبے لمبے گلاسوں سے پیا۔ اتنی دیر میں وہاں لیلیٰ کی سب سے بڑی بھتیجی یاسمین بھی آ گئی۔ وہ کم سن تھی اور اس نے میک اپ نہیں کر رکھا تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھ کر وہ خاموشی سے سب کا مشاہدہ کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ہم جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم نے اپنے میزبانوں سے رخصت لی۔ لڑکیوں نے دوبارہ دوپٹوں میں منہ سر لپیٹ کر خود کو مصری حنوط شدہ لاشوں میں تبدیل کرنے کا ڈرامہ کیا اور ہم اپنی کار کی طرف چل پڑے۔

کار کے پاس جا کر مجھے یاد آیا کہ کار کی چابیاں تو میں لیلیٰ کی میز پر ہی بھول آئی ہوں۔ میں نے محسن کو دوڑایا کہ وہ چابیاں لے آئے، مگر وہ مایوس لوٹا۔ اس نے مجھے کہا کہ کار کی چابیاں اس کو لیلیٰ کے کمرے میں نہیں ملیں۔

میں کافی سٹپٹا گئی۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا اور رقص و موسیقی کا سرکاری وقت ختم ہو چکا تھا۔ ان مقررہ اوقات کے بعد ان گلی کوچوں میں پولیس کی کارروائیاں خوب تیز ہو جاتی ہیں۔

میرے ساتھ یہ لڑکیاں تھیں جو گٹھڑی بنی کھڑی تھیں اور راہگیر انہیں تجسس سے مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ انہیں سڑک پر تنہا چھوڑنا بھی مناسب نہ تھا۔ اتفاق سے استاد صادق کی بیٹھک بالکل پاس ہی تھی۔ میں نے ان سب کو استاد صادق کی بیٹھک میں چھوڑا اور محسن کے ساتھ چابی ڈھونڈنے تیز قدم بڑھاتی ہوئی لیلیٰ کے کوٹھے پر جا پہنچی۔ یہاں میں نے اپنا بیگ اور تھیلا بھی چھان مارا، کمرے کے کونے کونے میں ڈھونڈا لیکن کار کی چابیاں کہیں نہ ملیں۔ ناچار میں پھر واپس لوٹی۔ محسن نے کہا کہ وہ تار سے گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرے گا۔

اچانک مجھے ایک شور سنائی دیا جو استاد صادق کی بیٹھک کی طرف سے آ رہا تھا۔ میں تقریباً بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی تو دیکھا کہ ایک پولیس انسپکٹر اور کچھ پولیس والے بیٹھک سے باہر نکل رہے تھے۔ ان کے پیچھے استاد صادق بھی تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا: ''ان کی مہمان ہیں یہ لڑکیاں!''

انسپکٹر نے خشک مزاجی سے مجھ پر نظر ڈالی اور ایک ابرو اٹھا کر بڑی عیاری سے پوچھا: ''اوہو! ڈاکٹر صاحبہ بھی یہاں ہیں۔ کیوں جی؟ یہ آپ کی مہمان ہیں؟''

میں نے فوراً جواب دیا: ''جی ہاں! ہم جانے ہی والے تھے مگر لگتا ہے میری کار کی چابیاں گم ہوگئی ہیں۔ خیر ہم کچھ نہ کچھ انتظام کر کے ابھی یہاں سے چلے جاتے ہیں۔''

اس نے آواز اونچی کر کے کہا: ''اپنی دوستوں کو بتا دیجیے کہ یہاں کا ٹائم ختم ہوگیا ہے۔ اب میں موسیقی کی آواز نہ سنوں!''

''جی ہاں! آپ کی بات بالکل سمجھ رہی ہوں۔'' میں نے بغیر کچھ سمجھے کہا اور بیٹھک کے اندر دوڑ گئی۔ وہاں جو منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا اس نے مجھے بھونچکا کر دیا۔ ایک سازندہ طبلہ بجا رہا تھا اور سارہ کمرے کے بیچ میں کھڑی کتھک ناچ رہی تھی۔

آخرکار کچھ ہوش سنبھال کر میں نے اسے ڈانٹ پلائی: ''بند کرو یہ سب... یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

سارہ نے کندھے اچکا کر کہا ''میں تو انہیں دکھا رہی تھی کہ اسلام آباد میں رقص کی کلاس میں، میں نے کیا سیکھا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ کچھ اور بھی سکھا دیتے۔''

پولیس والے طبلے کی آواز سن کر آئے تھے۔ سارہ کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہاں اس وقت رقص کے بھاؤ دکھا کر وہ ہم سب کے لیے کتنا بڑا خطرہ مول لے رہی ہے۔

میں نے عاجز آ کر کہا: ''دوسری کار بھی موجود ہے۔ تم لوگ چلی کیوں نہیں جاتیں۔ میں اور محسن اس کار سے کسی نہ کسی طرح آ جائیں گے۔''

لڑکیاں اس پر راضی نہ ہوئیں اور مستقل میرے ساتھ چمٹی رہنے پر بضد رہیں۔ میں چاہتی تھی

کہ وہ چلی جائیں تو میں سکون کا سانس لوں کیونکہ یہاں پولیس والے نہایت خونخوار ہوتے ہیں۔
سارہ اور اس کا شوہر دوسری کار میں چلے گئے۔ میں، محسن اور بیٹھک سے چند سازندے کار کے پاس پہنچے تاکہ بغیر چابی کے کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کریں۔لڑکیاں بھی ہمارے ساتھ ہی تھیں۔ اس وقت گلی میں کافی اندھیرا تھا۔ کار کے پاس پہنچے تو محسن اچانک چیخ پڑا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو وہ گاڑی کے ٹائروں کی طرف اشارہ کررہا تھا۔ پھر مجھ پر یہ نیا انکشاف ہوا کہ گاڑی کے چاروں ٹائروں کو کسی نے کاٹ دیا تھا۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ گاڑی کی چابیوں کی گمشدگی محض اتفاق نہیں تھا۔ یہ سب باتیں ایک سوچے سمجھے منصوبے کی کڑیاں تھیں۔ محسن اور میں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ خطرے کی بُو ہم اب صاف سونگھ سکتے تھے۔
محسن اپنی تکنیکی مہارت سے کار کا دروازہ تار کے ذریعے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔لڑکیاں پہلے تو ایک دوسرے سے چمٹی کھڑی رہیں اور پھر کہیں سے ایک لکڑی کا بنچ گھسیٹ لائیں اور منہ چھپا کر اس پر بیٹھ گئیں۔ اب ان کی خود اعتمادی واپس آ گئی تھی اور وہ دوپٹوں کی اوٹ سے ہر راہگیر کا معائنہ کررہی تھیں۔ انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا جبکہ وہ سب کو دیکھ سکتی تھیں۔
پولیس کی گاڑیاں اپنی ہیڈ لائٹیں مارتی ہوئی بار بار گزر رہی تھیں اور کبھی کبھی سائرن بھی بجا دیتی تھیں۔ یہ سب تماشا وہ ہمیں دکھانے کے لیے کررہے تھے۔ ایک گاڑی ہر پانچ دس منٹ بعد گزرتی اور اس میں بیٹھے پولیس والے ہم سے بار بار پوچھتے کہ ہمارا مسئلہ کیا ہے۔ محسن نے تار سے دروازہ کھول دیا تھا اور اب کوشش کررہا تھا کہ اسی طرح گاڑی اسٹارٹ بھی کر سکے۔ جب بھی میں کوئی اوزار لینے کے لیے استاد صادق کی بیٹھک میں جاتی، لڑکیوں کی یہ ٹولی فوراً موقع غنیمت جان کر پولیس والوں سے گپیں لڑانے لگتی۔ میں نے انہیں بار بار منع کیا کہ وہ پولیس والوں سے گفتگو نہ کریں لیکن ہماری لڑکیاں اور لڑکے ہوتے ہی ایسے ہیں۔ ٹولی بنا کر وہ خاصی بچگانہ حرکتیں کر سکتے ہیں۔ پولیس والے ان سے ہنسی مذاق کی کوشش کررہے تھے اور انہیں بڑا مزا آ رہا تھا۔ آخر میرا غصہ پھٹ پڑا اور میں نے ان میں سے دو کو تو استاد صادق کی بیٹھک کے اندر بھیج دیا۔ فائزہ کو میں نے اپنے ساتھ رکھا تاکہ بیٹھک کے اندر دوبارہ ان کی ٹولی نہ بن جائے اور یہ کوئی دوسری حماقت نہ کریں۔ فائزہ یوں بھی دوسری لڑکیوں سے عمر میں کچھ بڑی اور ذرا زیادہ سمجھدار تھی۔
محسن اور استاد صادق نے گاڑی کے ٹائر اتار لیے تھے۔ محسن نے مجھے بتایا کہ وہ ٹائر ٹیکسی میں رکھ کر پنکچر لگوانے کے لیے لے جارہا ہے۔ یہ سن کر میری کچھ جان میں جان آئی۔ پولیس کی گاڑیوں کی قطار وہاں سے گزرتی جارہی تھی۔ وہ ہم سے وہی بے معنی سوال کیے جارہے تھے۔ ہماری

ذرا سی بھی مدد کرنے کی کسی نے پیشکش نہ کی۔ اس کے بجائے وہ ہماری حالت پر بہت عجیب انداز سے مسکراتے رہے۔

فائزہ اور میں اس دکاندار کے پاس پہنچے جس سے ہم نے کار کی نگہداشت کرنے کی درخواست کی تھی۔ میں نے کہا: ''جب یہاں اتنی پولیس گھوم رہی ہے تو پھر گاڑی کے ٹائر کاٹنے کی ہمت کس نے کی؟ کہیں وہ پولیس والوں کے دوست تو نہیں تھے؟''

دکاندار نے جواب دیا: ''ڈاکٹر صاحبہ، ٹائر کاٹتے ہوئے تو ہم نے خود پولیس والوں کو دیکھا تھا لیکن ہم انہیں منع کیسے کرسکتے تھے!''

میں بھونچکا ہوکر رہ گئی۔ میرا شک تو بس اتنا تھا کہ پولیس یہ حرکت کرنے والوں کو تحفظ دیتی ہوگی۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ حرکت خود پولیس والوں نے کی ہوگی! غصے سے میرا خون کھول اٹھا۔

میں نے فائزہ کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ ہم ٹیکسی لے کر گھر چلے چلیں۔ محلے والے صبح تک کار کی حفاظت کرلیں گے۔ فائزہ اس تجویز پر گھبرا گئی۔ اس نے کہا: ''اتنی رات گئے لڑکیوں کا ٹیکسی میں گھر پہنچنا بہت معیوب سمجھا جائے گا۔ اپنی کار کی تو دوسری بات ہوتی ہے لیکن شریف لڑکیاں کہیں رات کے تین بجے ٹیکسیوں میں آتی ہیں!!''

''اف خدا!'' میں نے سوچا۔ ''یہ لڑکیاں ان خونخوار پولیس والوں سے زیادہ اپنے والدین سے خوفزدہ ہیں!'' تھوڑی دیر بعد ایک ایک کرکے پولیس کی گاڑیاں غائب ہوگئیں۔

رات کے تین بج رہے تھے۔ میں نے غور کیا کہ محلے نے اپنا روپ بدل لیا ہے۔ اب نہ وہ دن اور نہ شام جیسا علاقہ لگ رہا تھا جب عام تماش بین گانا سننے آتے ہیں۔ یہاں اندھیرا تھا مگر اندھیرے میں بڑی چہل پہل تھی۔ ان گلیوں میں جیسے ایک پُراسرار ہوا لہراتی ہوئی نکل گئی تھی۔ یہاں اب دوسری طرح کے لوگ چل پھر رہے تھے۔ اس سے پہلے میں رات ایک بجے کے بعد یہاں کبھی نہیں رکی تھی۔ یہ میرے لیے بھی رات ڈھلنے پر محلے کے ماحول کا مشاہدہ کرنے کا ایک نادر موقع تھا۔

یہاں رہنے والے کئی سازندوں نے مجھے بتایا تھا کہ عام لوگوں کے رخصت ہونے کے بعد محلہ اپنے جوبن پر آتا ہے۔ صاحبِ حیثیت اور مقتدر گاہکوں کے آنے کے یہی اوقات ہیں۔ ان میں بیشتر لوگ سیاست دان تھے جو پولیس والوں کے ساتھ جانور سے بھی بدتر سلوک کرتے تھے۔ گلیوں میں اب بڑی بڑی قیمتی کاروں کا راج تھا۔ پیدل چلنے والے زیادہ نظر نہیں آرہے تھے۔ سامنے آنے والے کسی کوٹھے کے انتخاب میں نہیں بھٹک رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ انہیں کس کے

پاس جاتا ہے۔ ان میں بعض چند مخصوص طوائفوں کے مستقل گاہک تھے۔

گھنٹے بھر محسن کا انتظار کرنے کے بعد میں نے اور فائزہ نے چچا کے گھر ٹیلی فون کرنے کی ٹھانی۔ ہمیں امید تھی کہ فون فائزہ کا بھائی اٹھائے گا جو ساری رات پڑھائی کرتا ہے۔ ہم گلی کے ایک معمولی سے ریستوران میں پہنچے تاکہ وہاں سے گھر ٹیلی فون کرسکیں۔ اتفاق سے ان کا ٹیلی فون کام نہیں کر رہا تھا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہم ان کے سامنے والی پان کی دکان سے ٹیلی فون کرسکتے ہیں۔ ہم سڑک پار کرنے کے لیے جانے لگے تو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ رات کے اس سناٹے اور اندھیرے میں ہمیں لوگوں کا ایک ہجوم اپنی سمت بڑھتا ہوا نظر آیا۔ ہم گھبرا کر فوراً دوبارہ ریستوران میں گھس گئے۔ افسوس کہ اس ریستوران میں دروازہ بھی نہ تھا جس کے پیچھے خود کو محفوظ کیا جاسکتا۔ سڑک پر تقریباً بیس آدمیوں کا جتھا آرہا تھا۔ فاصلے سے معلوم نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ گا رہے ہیں یا رو رہے ہیں لیکن یہ صاف معلوم ہوسکتا تھا کہ وہ سب نشے میں پوری طرح بدمست تھے۔ نہ جانے وہ کسی محفل سے اٹھ کر آرہے تھے یا کسی جھڑپ کے بعد سڑک پر گھوم رہے تھے (ہوسکتا ہے دونوں ہی باتیں ہوں)۔ ایک گورا چٹا، ٹھیک ٹھاک حلیے کا شخص، نشے میں مدہوش تھا۔ اس کے سفید ریشمی کرتے پر خون لگا ہوا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ ان دوسرے آدمیوں کا سرغنہ معلوم ہو رہا تھا جو اس کے پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے۔ فائزہ نے خوف سے میرا بازو مضبوطی سے بھینچ لیا۔ یہ گروہ نشے میں لڑکھڑاتا یوسف صلاح الدین کی حویلی کی جانب جا رہا تھا۔

جب ہمیں یقین ہوگیا کہ وہ لوگ دور جا چکے ہیں تو ہم اپنی پناہ گاہ سے نکلے اور پان کی دکان سے گھر ٹیلی فون کیا۔ خوش قسمتی سے ٹیلی فون فائزہ کے بھائی نے پہلی گھنٹی پر ہی اٹھا لیا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم شاہی محلے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ اس بات پر کافی ناراض ہوا کہ اتنے دلچسپ پروگرام میں اسے کیوں نہ شامل کیا گیا۔ لیکن اس نے وعدہ کیا کہ اگر اس اثنا میں ان کے والدین جاگ گئے تو وہ فائزہ کے بارے میں انہیں کوئی ایسی بات بتا دے گا کہ ان کی تسلی ہوجائے۔

میں نے پان والے سے اس ہنگامے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا: ''اس پہر میں، محلے میں ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اس لیے اب ہم پروا نہیں کرتے۔ ہوگی کوئی وجہ۔ یہ بڑے لوگ پی کر بدمست ہو جاتے ہیں اور پھر وجہ بے وجہ ایک دوسرے سے بھڑ پڑتے ہیں۔''

دکاندار نے لفظ ''پہر'' استعمال کیا جس نے مجھے بڑا مسحور کیا۔ وقت کی پیمائش کا ہمارا پرانا مشرقی طریقہ یہی تھا۔ دن اور رات میں آٹھ پہر شمار کیے جاتے تھے۔ ایک پہر تین گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اس محلے میں ہر پہر کا اپنا علیحدہ رنگ ہوتا ہے۔ یہاں صبح ایسی ہی ہوتی ہے جیسے لاہور کے کسی بھی اور

علاقے میں ہوتی ہے۔ محلے کے باسی ناشتے کی دکانوں پر مجمع لگاتے ہیں مگر اس گھڑی طوائفیں اور موسیقار بے خبر سو رہے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دوسرے پہر میں بیدار ہو کر گلی کے حماموں میں نہاتے دھوتے ہیں اور ناشتہ کرتے ہیں۔ دن کا تیسرا پہر موسیقی کے ریاض اور بازار جانے کے لیے ہوتا ہے جبکہ چوتھے پہر میں رات کی چہل پہل کی تیاریاں کی جاتی ہیں۔

دوسرے علاقوں کے مقابلے میں یہاں رات کا ہر پہر بھی مختلف ہوتا ہے اور ہر آنے والا پہر یہاں کے سربستہ رازوں کو آشکار کرتا چلا جاتا ہے۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ اس محلے میں رات کا پچھلا پہر شہر کی مقتدر شخصیتوں کے تصرف میں ہوتا ہے۔ کوٹھوں پر اہم سیاسی فیصلے اور سودے بازی کی جاتی ہے۔ تب تک پولیس محلے سے عام، معمولی حیثیت کے شہریوں کو دفع کر چکی ہوتی ہے اور ان طاقتور شخصیتوں کو پولیس کا پورا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ یہ صاحبان انہی کوٹھوں پر رات کے چار بجے کے بعد سکون سے گانا سنتے ہیں اور پوری رازداری کے ساتھ اہم مسائل پر گفتگو کرتے ہیں۔ یہاں کے موسیقار اور طوائفیں مغلوں کے دور سے اہم سیاسی رازوں کو اپنے سینے میں دفن رکھنے کی تربیت حاصل کرتے رہے ہیں۔ وہ کونسا راز ہوگا جس سے یہ آشنا نہ ہوتے ہوں! وہ کونسا بھید ہوگا جس سے یہ طوائفیں امراء کا بستر گرم کرتے ہوئے واقف نہ ہو جاتی ہوں! مگر راز داری ان کے پیشے کا ایک اہم جزو ہوتی ہے۔ طوائفوں اور سازندوں کی موجودگی میں سیاست داں بلا کھٹکے ہر بات کہہ سکتے ہیں اور انہیں پورا اعتماد ہوتا ہے کہ ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی کمرے کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلے گا۔

اب رات کا آخری پہر آ گیا تھا اور محسن اب تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ میں نے سوچا کہ اتنی دیر میں گلی کے دکانداروں سے ان ''رات کے پنچھیوں'' کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل کرلوں۔ اس گھڑی اس محلے کی شناسا گلیوں کا ماحول بالکل دوستانہ نہیں رہا تھا۔ گلیوں میں لڑکھڑاتے، گالیاں بکتے مدہوش راہگیروں کے باعث پورے ماحول میں اُجڈپن اور بدتہذیبی سرایت کر گئی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ یہی قتل کی وارداتوں کا پہر ہوتا ہے۔ ان خاص اوقات میں گاہک اور دلال، دونوں کسی حد تک ہوش و حواس گنوا بیٹھتے ہیں۔

صبح کے ساڑھے چار بجے محسن واپس پہنچا۔ ہماری کار میں ریڈیَل ٹائر لگے تھے اور ان کی مرمت کے ماہر کی تلاش میں کافی دقت پیش آئی تھی۔ پھر کاریگر کو جگانے اور ایسے ناوقت خدمات پیش کرنے پر راضی کرنے کے لیے اس کی مٹھی گرم کرنا پڑی تھی۔ بہرحال، ہم سب نے مل کر مرمت شدہ ٹائر گاڑی میں لگائے۔ محسن نے جوں توں گاڑی اسٹارٹ کی۔ ہم نے اپنے میزبانوں کا دلی شکریہ ادا کیا جنھوں نے ہماری خاطر سردی میں ساری رات گلی میں گزاری تھی۔ وہ لوگ الٹی ہم سے معذرت

کرنے لگے کے ان کی گلی میں ہمیں ایسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ مجھے پولیس کی کارستانیوں کی کہانیاں سنایا کرتے تھے، سو اب یہ تجربہ خود مجھے بھی ہو گیا۔

میری کار کی چابی جس حیرت انگیز طریقے سے غائب ہوئی تھی، اسی طرح پردۂ غیب سے نمودار ہو گئی۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت لیلیٰ کو وہ کمرے کے عین وسط میں رکھی ہوئی ملی۔ اس کا خیال تھا کہ صبح کے وقت کسی نے چپکے سے کمرے میں داخل ہو کر چابی وہاں رکھ دی ہے۔ شاید یہ وہی بچے تھے جنہیں میں نے اس رات کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھے دیکھا تھا۔

باب ۱۰

ایک ہی کشتی کے مسافر

دوسری صبح جب ناشتے پر میری ملاقات اپنے چچا اور چچی سے ہوئی تو ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ پچھلی رات ہم کیسی آفت میں جا پھنسے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ ناشتہ کرنا شروع ہی کیا تھا کہ محسن بھی آ گیا۔ اس نے بھی ناشتہ کیا اور پھر ادھر ادھر کی باتیں کر کے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میری چچی نے کہا: ''محسن نے کافی صبح چکر لگایا، شاید دفتر جانے سے پہلے ادھر آ نکلا ہو۔''

انہیں کہاں پتا تھا کہ رات کے بچے کھچے ایک دو گھنٹے محسن نے ان کے گھر ہی پر سو کر گزارے تھے۔

چچی جان نے مجھے ایک خانم کے بارے میں بتانا شروع کیا جو لاہور کے شاہ نور اسٹوڈیو کے پاس رہتی تھی۔ زیادہ تر فلمی اداکاراؤں کی طرح وہ بھی شاہی محلے سے ہی آئی تھی۔ چچی نے کہا کہ اگر میری تحقیق میں مدد مل سکے تو وہ خانم سے میری ملاقات کا انتظام کر سکتی ہیں۔ خانم پہلے فلموں میں کام کرتی تھی مگر اب کچھ عرصے سے وہ کسی کی داشتہ بن چکی تھی اور اس نے فلمی دنیا چھوڑ دی تھی۔ میری تحقیق اب طوائفوں کے طویل مدت تعلقات تک جا پہنچی تھی۔ جسے اس محلے میں بھی ''شادی'' کا نام دیا جاتا تھا۔ ان ہی دنوں مجھے اس خاندان میں ایک ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا جس نے میرے شعور کو چونکا دیا۔

فائزہ کے خاندان سے میرے مراسم بہت گہرے تھے۔ فائزہ اور اس کے بہن بھائی میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے۔ عمر میں ہم بہن بھائی ان سے ذرا بڑے تھے مگر شرارتیں مل جل کر ہی

کرتے تھے۔ ان دنوں فائزہ یونیورسٹی میں ایم اے فائن آرٹس کی طالبہ تھی۔ اس کا بڑا بھائی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گیا ہوا تھا، اس سے چھوٹا بھائی کراچی میں میڈیکل کا طالب علم تھا جبکہ سب سے چھوٹا بھائی انگلینڈ جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ فائزہ کو پڑھائی سے واجبی سی دلچسپی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نہ اسے بیرونِ ملک بھیجا جائے گا اور نہ ہی ملازمت کی اجازت دی جائے گی۔ یونیورسٹی میں فائن آرٹ کے کورس سے اس کی تخلیقی امنگوں کو ایک راستہ ضرور مل جاتا تھا اور گھر سے باہر جاکر کچھ وقت اپنے دوستوں کے ساتھ گزارنے کا موقع بھی میسر آ جاتا تھا۔ وہ بہت ذہین اور سمجھدار لڑکی تھی اور یہ بات مجھے بہت پسند تھی۔

ایک دن اپنی تحقیقی گشت سے واپسی پر میں نے فائزہ کو بہت پریشان پایا۔ عام طور پر وہ روز میرے گھر میں داخل ہوتے ہی گرمجوشی سے میرا استقبال کرتی تھی۔ لیکن اس دن وہ گھر بھر میں اضطراب سے گھومے جا رہی تھی۔ چچی نے حسبِ معمول مجھ سے روزمرہ کی باتیں کیں۔ لیکن مجھے اپنے چچا نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے چچی سے ان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: ''وہ باہر گئے ہیں۔ وہ آج بڑے غصے میں ہیں۔'' پھر شرمندگی مٹاتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ گھر میں جھگڑا ہو گیا ہے۔

''کس بات پر۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''فائزہ کا موڈ بھی بگڑا ہوا نظر آ رہا ہے''۔

چچی نے کہا: ''بات کیا ہونی تھی۔ کچھ لوگ فائزہ کو دیکھنے آئے تھے۔''

اب تو میں اچھل پڑی۔ ''اوہو!'' میں نے کہا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

چچی نے کہا: ''ارے تم جانتی ہو نا، وہ میری دوست کی نند کی خالہ...''

''نہیں'' میں نے کہا: ''میں بھلا آپ کی دوست کی نند کی خالہ کو میں کیسے جان سکتی ہوں؟'' (یہ کافی پیچیدہ رشتے ہوتے ہیں)۔

چچی نے کہا: ''خیر۔ تو ان سے میں نے کہا تھا کہ فائزہ کے لیے کوئی لڑکا دیکھ لیں۔ اس نے دو ایک خاندانوں کو پہلے بھی بھیجا تھا مگر انہوں نے لڑکی کو پسند نہیں کیا۔''

''ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔'' میں نے دبے ہوئے غصے کے ساتھ کہا۔

''تو اس بار بھی اسی نے ان لوگوں کو بھیجا تھا۔ ان کی ننھیال لدھیانہ کی ہے۔ مجھے تو لڑکے کی ماں اور بہن پسند آئیں۔ لڑکا بھی ان کے ساتھ آیا تھا۔ تمہارے چچا کو یہ بات بالکل پسند نہیں کہ لڑکا فائزہ کو خود آ کر دیکھے لیکن ہمیں پہلے معلوم ہی نہیں تھا کہ لڑکا بھی آ رہا ہے۔''

اتنی دیر میں فائزہ بھی کمرے میں آ گئی۔ ماں کو یہ داستان سناتے دیکھ کر وہ بغیر کچھ کہے میرے صوفے کے پاس قالین پر بیٹھ گئی۔

چچی نے کہا: ''فائزہ ان کے لیے چائے شائے لے کر آ گئی۔''

فائزہ نے ان کی بات کاٹ کر کہا: ''میری نمائش کی جا رہی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ میں چل پھر بھی سکتی ہوں کہ نہیں۔''

''اب بس کر بچی!'' چچی نے کہا: ''پہلے ہی باپ کے سامنے کافی کچھ بول چکی ہے۔ قاعدہ ہی یہ ہے۔ یہ نہیں کریں گے تو تمہاری شادی کیسے کریں گے؟''

اب فائزہ سسکیاں بھر کر رو رہی تھی۔ اس نے میری گود میں سر رکھ کر کہا: ''اتنی بار یہی سب ہو چکا ہے! میں اب عاجز آ چکی ہوں۔''

چچی نے میری طرف دیکھ کر کہا: ''فوزیہ بیٹی، یہ ریت رواج میں نے یا تمہارے چچا نے تو نہیں بنائے ہیں۔ اس سے پوچھو کہ ہمیں کیوں الزام دیتی ہے؟ قاعدہ ہی یہ ہے۔ لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں اور پھر ان کی طرف سے بات آگے نہیں بڑھائی جاتی۔ میں نے لاکھ بار اس سے کہا ہے کہ دھوپ میں نہ پھرا کرے۔ اپنا کچھ خیال رکھے۔ یہ رات کو اتنی دیر دیر تک جاگتی رہتی ہے۔ پڑھائی کرتی رہتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے دیکھو کیسے حلقے پڑ گئے ہیں۔ اس عمر میں رات کو اتنا جاگنا نہیں چاہیے۔ اسے آرام کرنا چاہیے، دھوپ میں نہیں نکلنا چاہیے۔ کچھ اپنے رنگ کا خیال رکھے۔ اب تم ہی بتاؤ بیٹی! میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں؟''

میں نے کہا: ''چچی جان! فائزہ ابھی پڑھ رہی ہے۔ آپ اس کی شادی کے لیے اتنی فکرمند کیوں ہیں؟''

''یہی شادی کی عمر ہوتی ہے۔'' چچی نے کہا: ''یہ گزر گئی تو پھر کوئی نہیں ملے گا۔ یہی وقت ہے جب ہم بھی اپنی مرضی سے کسی کا انتخاب کریں گے۔ بعد میں تو بس رنڈوے یا طلاقی مرد ہی رہ جاتے ہیں۔''

فائزہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا: ''کس کی مرضی سے؟ کون انتخاب کرے گا؟ ذرا یہ تو بتائیے؟'' پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا: ''سب کہتے ہیں کہ میرا رنگ کالا ہے۔''

فائزہ کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ میں گم سم سی ہو کر رہ گئی۔ اس خاندان میں یہ مسئلہ کافی مدت سے چل رہا تھا۔ فائزہ کے بی اے کرتے ہی چچی نے اس کے لیے کوئی اچھا پیغام حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ ہمارے معاشرے میں لڑکی والے خود پیغام نہیں دے سکتے۔ انہیں دوسرے رشتہ داروں یا جان پہچان کے لوگوں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے جو لڑکی کے لیے شادی کا پیغام دلوانے میں ان کی مدد کر سکیں جبکہ لڑکے کا خاندان ٹھاٹ سے ہر گھرانے میں خود جا کر کسی لڑکی کو پسند یا ناپسند کر سکتا ہے۔

میری چچی کے ذہن میں یہ بات صاف تھی کہ فائزہ ابھی تک تعلیم اس لیے حاصل کر رہی ہے کیونکہ وہ کسی اچھے پیغام کا انتظار کر رہی ہے۔ جس دن کوئی لڑکا اور اس کا خاندان فائزہ کو قبول کر لیں گے اسی دن فائزہ کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ فائزہ اگر اس بات کی مخالفت کرے گی تو اسے کوئی نہیں سُنے گا کیونکہ بچوں کو خاندانی روایتوں کا کچھ علم نہیں ہوتا۔

ہماری روایتی خاندانی شادیوں میں لڑکی کے والدین اسی طرح اپنی بیٹیوں کے لیے اچھے پیغامات حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ پیغام کا آنا لڑکی کی خوبصورتی اور والدین کی مالی اور بھاری جہیز دینے کی استطاعت پر منحصر ہوتا ہے۔ لڑکے والوں کو اس پورے عمل میں کافی لطف آتا ہے۔ لڑکے کی بہنیں اور دوسرے رشتہ دار گھر گھر لڑکیاں دیکھتے پھرتے ہیں۔

اس رات میں دیر تک فائزہ کے بارے میں سوچتی رہی۔ میں اس سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کی صلاحیتوں کی قدر کرتی تھی۔ اسے کیسی مشکل روایتوں کا سامنا تھا! وہ کسی ادارے کی سربراہ ہو سکتی تھی، اپنا کاروبار کر سکتی تھی، لیکن اب اسے ساری توجہ اس بات پر مرکوز کرنی تھی کہ کوئی لڑکا اس کا انتخاب کر لے۔ بعد ازاں اس کا سماجی مرتبہ اور پہچان اپنے شوہر کی ذات سے منسوب ہو جائے گا۔

دوسرے دن میں نے اپنی چچی سے اس موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مجھے وہی جواب دیا جو تمام مائیں دیتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کے مستقبل کے لیے فکرمند ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ اسے سماجی اور معاشی تحفظ حاصل ہو جائے۔ اور میری چچی نے اعلان کیا کہ یہ صرف شوہر اور بچوں سے حاصل ہو سکتا ہے۔

لاہور میں میرے میزبان رشتہ دار میری طرح صبح سویرے اٹھ جاتے تھے۔ اس طرح صبح کا وقت دلچسپ گفتگو میں کٹتا تھا۔ میری چچی ایک نہایت دلچسپ شخصیت تھیں۔ ایک صبح انہوں نے انکشاف کیا کہ انہوں نے خانم سے میری ملاقات کا بندوبست کر لیا ہے۔ چچی خود خانم کو بالکل نہیں جانتی تھیں، مگر ان کی پڑوسن کی ساس کی بہن کی پڑوسن خانم سے واقف تھیں۔ چچی نے کہا کہ جب اتنی قریبی دوستی نکل آئی تو لازم ہے کہ وہ مجھے خانم سے ملانے لے چلیں۔ میں نے فرمائش کی کہ ہم فائزہ کو بھی ساتھ لے چلیں۔ میں چاہتی تھی کہ اس کی توجہ گھریلو مسائل سے ہٹے۔ چچی بڑی خوش مزاج اور ہنس مکھ خاتون تھیں۔ وہ اس پر راضی ہو گئیں اور ہنسی مذاق کے ماحول میں ہم اس مہم پر روانہ ہوئے۔ چچی نے مجھے بتایا کہ ایک فلم پروڈیوسر نے خانم کو شاہی محلے سے منتخب کیا تھا۔ اب وہ کسی دوسرے صاحب کی داشتہ ہے۔

خانم تک پہنچنے کا راستہ ہمارے لیے کافی پیچ و خم کا حامل نکلا۔ ہم پہلے اپنی پڑوسن کی ساس کے

گھر پہنچے جہاں چائے اور بسکٹوں سے ہماری تواضع کی گئی۔ ساس صاحبہ ہمیں اپنی بہن کے گھر لے گئیں اور دوبارہ چائے اور بسکٹ نوش جاں کیے گئے۔ ساس کی بہن ہمیں اپنی پڑوسن کے گھر لے گئیں۔ اس بار چائے اور بسکٹوں سے ہم نے پرزور انکار کیا۔ بالآخر خاتونِ خانہ ہمیں خانم کے گھر لے گئیں۔

میں نے خانم کی کوئی فلم نہیں دیکھی تھی۔ اس لیے میں اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کے بارے میں کچھ نہ جانتی تھی۔ وہ نچلے متوسط طبقے کی آبادی میں ایک تنگ گلی میں رہتی تھی۔ شاہ نور اسٹوڈیو کے سامنے اس کا گھر کافی معمولی حیثیت کا تھا۔ میں اس علاقے سے واقف تھی کیونکہ تھیٹر کے کافی فنکار یہاں اس امید پر رہائش پذیر تھے کہ کبھی ان کے بھاگ جاگیں اور انہیں فلموں میں کام مل جائے۔ وہ اسٹوڈیو کے آس پاس گھومتے پھرتے تھے کہ کسی ہدایت کار سے ملاقات ان کی تقدیر بدل دے۔

خانم خوبصورت تھی۔ دراز قد، گورا رنگ، لمبے سیاہ بال اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں... اس کے سبھاؤ سے پتا چل رہا تھا کہ وہ شاہی محلے کی ہے۔ اس کی آواز بھاری تھی اور دہانہ کثرتِ پان نوشی کی چغلی کھا رہا تھا۔ وہ پرانے لاہور کی ٹھیٹ پنجابی میں باتیں کر رہی تھی۔ خانم نے ہمیں اپنی بیٹھک میں بلایا جہاں وہ ایک چارپائی پر بیٹھی تھی۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز میں ایک عجب طرح کی طمانیت تھی جس سے اپنے حالات پر اطمینان اور فخر کے جذبات جھلک رہے تھے۔ ہم نے کافی دیر گفتگو کی۔ میری چچی کو سوالات کرنے کا ڈھب خوب آتا تھا اور جلد ہی ہمیں کئی مشہور اداکاراؤں سے خانم کے تعلقات کا علم ہوگیا۔ میں نے پوچھا کہ اسے فلم میں کام کرنے کا موقع کیسے ملا۔

"میں تو اس قابل نہیں تھی جی بس خدا کا کرم تھا!" خانم نے کہا۔ لیکن لہجے میں جو فخر تھا وہ اس جملے کی انکساری کا پول کھول رہا تھا۔ اس نے دور خلا میں دیکھتے ہوئے بتایا: "ہمارے کوٹھے پر ایک شخص مستقل آیا کرتا تھا۔ ایک دن خواجہ صاحب (فلم پروڈیوسر) اس کے ساتھ آئے تھے۔ وہ فلم میں کام کرنے کے لیے کسی کی تلاش بھی نہیں کر رہے تھے۔ بس جی یوں ہی دوست کے ساتھ آ گئے تھے۔ جب ہونی ہوتی ہے تو اپنے آپ ہو جاتی ہے۔ تو وہ ہمارے آفس☆ آئے اور مجھ سے گانے کی فرمائش کی۔ میرے استاد نے مجھے کچھ اچھی غزلیں سکھائی تھیں جو میں نے پیش کر دیں۔ انہیں وہ بڑی پسند آئیں۔"

☆ شاہی محلے کی طوائفیں اپنے کوٹھے کو عام گفتگو میں "آفس" کہتی ہیں۔

چچی نے ہنس کر پوچھا: ''غزلیں پسند آئیں یا آپ پسند آئیں۔''
خانم بھی ہنسنے لگی۔ اس نے کہا: ''دونوں ہی پسند آئی ہوں گی۔ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ میں فلم میں کام کیوں نہیں کرتی۔'' بس جی بعد میں، میں ان سے ملتی رہی۔ انہوں نے امید دلائے رکھی۔ لوگ مجھ سے کہتے تھے کہ یہ فلم والے ایسے ہی چکر دیتے ہیں۔ پیسے بھی نہیں دیتے اور فلم میں کام بھی نہیں دیتے۔ مگر میری اماں نے ان کی ایک نہ سنی۔ وہ کہتی تھیں کہ یہ لوگ تو جلتے ہیں۔ خدا نے فرشتے کی طرح انہیں آپ سے آپ ہمارے گھر بھیجا ہے تو اب ہم یہ موقع نہیں گنوائیں گے۔ میں تو جی ان کے پیچھے لگی ہی رہی۔ وہ مجھے اسٹوڈیو میں بلالیتے تھے اور پھر میرا سارا دن وہیں گزرتا تھا۔ زیادہ تر اماں میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ رات کو مجھے باہر لے جاتے تھے، کبھی کچھ خرید دیتے تھے۔ ایک دن فلم میں رول بھی دے دیا۔ میرا تو سارا خاندان نہال ہوگیا۔ کام کرنے کی ساری شرائط اماں نے طے کیں۔ مجھے ان کا کچھ پتا نہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بس ان کی ہو کر رہوں مگر اماں اس پر راضی نہیں ہوئیں کہ اس طرح تو آگے چل کر میرا نقصان ہوگا۔''
''وہ ایسا کیوں چاہتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں جی! وہ اماں کی بات پر راضی نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم احسان کا بدلہ چکائیں۔'' خانم نے کہا۔ ''میں اُن کی بڑی عزت کرتی ہوں۔ وہ بڑے اچھے بندے ہیں مگر اماں نے تو احتیاط کرنی تھی نا! وہ کہتی تھیں کہ جب آپ چاہیں، لڑکی حاضر ہے مگر صرف ان کی ہو کر رہوں، اس کے لیے تو کنٹریکٹ کرنا پڑے گا۔ آپ سمجھیں نا؟ یعنی شادی... ماہانہ رقم وغیرہ...''
''پھر اُنہوں نے کیا کہا؟'' میں پوری کہانی سننا چاہتی تھی۔
''اُن کی پہلے سے ہی دو بیویاں موجود تھیں۔ نہ تو وہ مجھے رکھ سکتے تھے اور نہ چھوڑنے پر راضی تھے۔ پھر وہ فلم بھی نہیں چلی۔ وہ بڑے مایوس ہوئے۔ اُنہوں نے اماں سے کہا کہ وہ مجھے دوسرے ڈائریکٹروں کے پاس لے جائیں گے۔ انہوں نے ایک دوست سے میرا تعارف کرایا۔ یہ بات اماں کو بھی اچھی لگی۔ ایک فلم میں آجائیں تو پھر فلم انڈسٹری میں اٹھنا بیٹھنا آسان ہوجاتا ہے۔ لیکن فلم ناکام ہوجائے تو سب دروازے فوراً بند ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ میرا تو بڑا چھوٹا سا رول تھا۔ فلم کی ناکامی کے لیے مجھے الزام نہیں دیا جاسکتا تھا لیکن... فرق تو پھر بھی پڑتا ہے ناجی!''
''آپ کس قسم کے رول کرتی ہیں۔'' میں نے پوچھا۔
''میں ڈانسر ہوں۔ ایک فلم میں، میں نے یہ رول کیا تھا کہ لڑکی کا ریپ ہوجاتا ہے۔ آخر کوٹھے تک جا پہنچتی ہے۔ اخیر میں، میں مرجاتی ہوں، اس فلم میں میرے دو ڈانس تھے۔'' خانم نے

بڑے فخر سے بتایا۔

پڑوسن بڑی گرمجوشی سے مسکرا کر کہنے لگیں ''وہ فلم میں نے دیکھی تھی۔ اس کی ساری فلمیں میں نے دیکھی ہیں۔ ہم تو پڑوسی ہیں۔ اس کی سب فلمیں تو ہمیں دیکھنی ہی چاہئیں۔''

''ایک دوسری فلم میں، میں نے نائٹ کلب کے دو ڈانس کیے تھے۔'' خانم نے کہا۔ ''ایک میں ندیم گاتا ہے اور میں ناچتی ہوں لیکن اس کے بعد میں نے فلموں میں کام چھوڑ دیا۔''

''لیکن کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''ابھی تو آپ کے کام کا آغاز ہی ہوا ہے۔''

''اب میں یہاں سیٹھ رحمان کھوکھر کے ساتھ رہتی ہوں۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں فلموں میں کام کروں۔''

مجھے کچھ تعجب ہوا کیونکہ یہ کسی سیٹھ کا گھر نہیں لگ رہا تھا۔ امیر لوگ تو عام طور پر اپنی داشتاؤں کو بڑی شان و شوکت سے رکھتے ہیں۔ میں نے خانم سے پوچھا کہ اس کی ملاقات سیٹھ رحمان سے کیسے ہوئی۔

''وہ بھی ایک گاہک تھے۔'' خانم نے بتایا۔ ''میں اپنے آفس میں بھی کام کرتی تھی۔ مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ فلموں میں مجھے کامیابی ملنے والی ہے۔ اس لیے اماں نے کہا تھا کہ آفس میں کام بھی جاری رکھوں۔ ٹی وی یا فلموں میں آ جائیں تو اچھے گاہک بھی ملنے لگتے ہیں۔'' خانم نے ہنس کر کہا۔

اس کی بے باکی اور صاف گوئی پر میں بہت خوشی محسوس کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا: ''تو شادی کر کے محلہ چھوڑنے کا فیصلہ کس وجہ سے کیا؟''

''فیصلہ تو اماں نے کیا'' خانم نے کہا۔ ''ڈائریکٹروں اور پروڈیوسروں کے پیچھے پیچھے پھرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ وہ مصروف لوگ ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے ان کے پاس ہمیشہ کوئی کام بھی نہیں ہوتا۔ سیٹھ رحمان کئی بار میری فلم کی شوٹنگ دیکھنے آئے تھے۔ پھر انہوں نے اماں سے بات کی کہ وہ میرے لیے کرائے پر الگ گھر لے دیں گے اور میرا خرچہ بھی اٹھائیں گے۔ اماں سے ان کا اور کیا معاملہ طے ہوا، یہ تو مجھے معلوم نہیں جی، مگر اب میں یہیں رہتی ہوں۔''

میں نے کہا ''شاہی محلہ میں تو ہر عورت فلموں میں کام کرنے کے لیے مری جا رہی ہے۔ آپ تو ان کے خواب کی تعبیر ہو۔ وہ آپ سے اس بارے میں کچھ کہتے ہیں۔''

''میرے بزرگ خوش ہیں اور مطمئن ہیں۔ اماں کہتی ہیں میرے فلم میں کام کرنے سے خاندان کی مدد ہوئی ہے۔ میری بہنوں کے لیے بھی یہ اچھا رہا، اس لیے میں بھی خوش ہوں۔ کیمرے

کے سامنے ڈانس کرنا مجھے اچھا لگتا تھا۔ یہ ہمارے آفس والے ڈانس سے بالکل الگ طریقے کا ڈانس ہوتا ہے۔ لوگ مجھے پہچانتے ہیں، تعریف کرتے ہیں، تو مجھے بھی اچھا لگتا ہے۔ میری اماں اور بہنیں بھی فخر کرتی ہیں۔ سیٹھ رحمان کہتے ہیں کہ اگر ان کے کسی دوست نے فلم بنائی تو وہ مجھے اس میں کام کرنے کی اجازت دے دیں گے۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔''

''کیا آپ فلموں میں کام کرنا چاہتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ایکٹنگ کا تو پتا نہیں، مگر مجھے ڈانس کرنا پسند ہے۔'' خانم نے کہا۔ ''فلموں میں مجھے نائٹ کلب ڈانسر کا رول پسند ہے مگر ڈائریکٹروں کے آگے پیچھے پھرنا، ان سے کسی چھوٹے سے پارٹ کی بھیک مانگنا، یہ سب کچھ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس سے یہ زندگی زیادہ اچھی ہے۔ سیٹھ رحمان خود اماں کے پاس آئے اور یہ بندوبست کیا۔ اماں نے منظور کر لیا۔ سیٹھ صاحب مجھ سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ ابھی انہوں نے اماں کو ایک ہیرے کی انگوٹھی خرید کر دی ہے۔ مجھے بھی چیزیں خرید کر دیتے ہیں۔ اماں چاہتی ہیں کہ مجھے کچھ تحفظ ملے۔ وہ میرے مستقبل کے بارے میں فکر مند رہتی ہیں۔''

''سیٹھ کے ساتھ آپ کب تک رہیں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''آگے کا حال کون بتا سکتا ہے! خانم نے کہا۔ ''آج کل تو باقاعدہ ہونے والی شادیوں کا پتا نہیں لگتا کہ کب تک چلیں گی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ ساری عمر یہیں رہوں، لیکن... کون کہہ سکتا ہے!''

باتوں باتوں میں میری چچی نے خانم کو بتایا تھا کہ میں شاہی محلے میں تحقیقی کام کر رہی ہوں۔ خانم کو بڑا تجسس تھا کہ میں وہاں کس کس سے ملی ہوں۔ میں نے قیصرہ کا نام لیا تو اس نے کہا:

''وہی جس کی بیٹی کا نام لیلیٰ ہے؟''

''ہاں، وہی۔'' میں نے کہا۔

خانم نے کہا ''ہاں! میں جانتی ہوں قیصرہ اور شمسہ دو بہنیں تھیں۔ اماں ان کے بارے میں زیادہ جانتی ہیں۔ آج کل وہ لیلیٰ کے لیے کوئی پیغام حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ لیلیٰ کی ماں بہت فکر مند ہے۔''

میں نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا ''مائیں ہمیشہ فکر مند رہتی ہیں۔''

''جی ہاں! اس سے فرق پڑتا ہے ناں کہ کون ملے گا۔ اس سے اس کا بھی مقام بنتا ہے اور اس کی بھتیجیوں کے مستقبل پر بھی اثر پڑے گا۔''

میں نے پوچھا ''اگر گاہک لمبے عرصے کا نہ ہو تو اس کے بڑا آدمی ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ لیلیٰ اپنا کاروبار جاری رکھ سکتی ہے۔''

خانم نے مُسکرا کر کہا ''برادری میں عزت بنتی ہے نا جی۔ وہاں سب اسی بزنس میں ہیں۔ وہاں اپنی ساکھ بنانی ہوتی ہے۔ وہاں جو دلال ہیں، استاد ہیں، ورائٹی شو کرانے والے، سب کی نظر لگی ہوتی ہے کہ کسی بھی طوائف کے ہاتھ کیسا بندہ آتا ہے۔ اگر نتھ کے لیے کوئی مالدار بندہ مل جائے تو آپ کے دام بڑھ جاتے ہیں اور آپ کی بہن کی قیمت بھی اونچی ہو جاتی ہے۔ سارے خاندان کو اس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ ویسے آپ ٹھیک بات کہہ رہی ہیں۔ صرف پہلے گاہک کی بات نہیں۔ کسی ڈانسر کو جب بھی کوئی مالدار آدمی ملتا ہے تو وہ پورے بازار میں خوب شیخیاں مارتی ہے۔ ناظمہ اور اس کی بہن کو دیکھ لو۔ وہ سیاست داں، جانے کیا نام ہے اس کا، وہ موٹو ان کے کوٹھے پر اتنا زیادہ آتا ہے کہ پولیس والے بھی ان سے ڈرتے ہیں۔ ان کا کوئی دوست مصیبت میں پھنس جائے تو ناظمہ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ انہیں کسی اور سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس سے بڑا فرق پڑتا ہے۔ مجھے ہی دیکھ لیجیے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرا اچھا رشتہ ہوگیا تو میری بہن کی نتھ کے لیے بھی ملتان کے ایک زمیندار کا رشتہ آیا ہے۔ یہ خوش نصیبی کی نشانی ہے۔''

چچی نے خانم سے سیٹھ کے خاندان کے بارے میں پوچھا تو خانم نے اطمینان اور بےفکری سے بتایا: ''ان کی ایک بیوی اور چار جوان لڑکے ہیں۔ ان میں دو شادی شدہ ہیں۔ سیٹھ صاحب بڑے زمیندار ہیں، مربعوں سے بڑا پیسہ آتا ہے۔ ان کے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ تو جانتی ہیں، ان لوگوں میں یہی رواج ہوتا ہے جی۔ ان کی مرضی ہے جو چاہیں کریں۔''

اس رات میں بڑی دیر تک سو نہ سکی۔ میں تمام عورتوں کے لیے شادی کی اہمیت اور عورتوں کے سماجی مقام کے تعین میں مردوں کے کردار کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ سب مائیں اپنی بیٹیوں کے لیے کس طرح بے تابی سے ''مناسب'' رشتہ تلاش کرتی رہتی ہیں۔ خانم کی ماں اپنی بیٹی کے لیے فکرمند تھی اور اپنی برادری کی روایتوں کے مطابق اس کے مستقبل کا تحفظ چاہتی تھی۔ قیصرہ، لیلیٰ کے لیے فکرمند تھی اور... میری چچی... فائزہ کے مستقبل کے تحفظ کے لیے اسی طرح پریشان تھیں۔

باب ۱۱
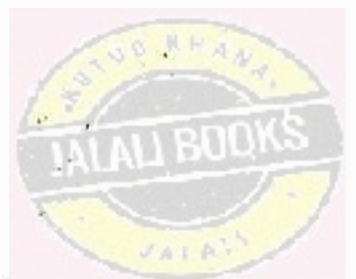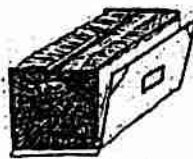
تین ناچنے والیاں

صبح کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ اتنی صبح میں اس محلے میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی مگر اس دن میں یہاں کے روایتی کھانوں کے لیے مشہور ہوٹلوں کا ایک پھیرا لگانے سویرے سویرے پہنچ گئی تھی۔ یہ ہوٹل شاہی محلے کی ایک پہچان ہیں اور صبح کے ناشتے کے لیے بہت شہرت رکھتے ہیں۔ لوگ دور دور سے یہاں بکری کے پایوں کا سالن خریدنے آتے ہیں، جو عرفِ عام میں صرف پائے کہلاتا ہے۔ زیادہ تر وہ پائے خرید کر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ ناشتے کے لیے یہاں کم ہی رکتے ہیں۔ میں ''پھجے'' کی دکان کے پاس، بازار کی بڑی سڑک پر چلی جا رہی تھی کہ ایک سوزوکی پک اَپ میرے پیچھے آ کر رُکی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو لیلیٰ پک اَپ میں کھڑی نظر آئی۔

''ارے تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے چیخی۔

لیلیٰ اس رات ممی اور چندا کے ساتھ پتوکی میں کوئی شو کرنے گئی تھی اور وہیں سے واپس آ رہی تھی۔ اپنے سازندوں سمیت (جنہیں وہ اپنا ''بینڈ'' کہتی تھی) وہ کسی شادی کی تقریب میں ایک متوسط زمیندار کی دعوت پر گئی تھی۔ یہ زمیندار صوبائی سیاست میں سرگرم رہا تھا، وہ اسمبلی کی نشست کے لیے تو کبھی کھڑا نہیں ہوا تھا مگر اپنی سیاسی جماعت کی انتخابی مہم میں کئی کمیٹیوں کا ممبر رہ چکا تھا۔

''ہا! میں تو سمجھی تھی کہ تم پتوکی میں ہو...'' میں نے کہا۔

لیلیٰ نے مجھے اپنے گھر آنے کا اشارہ کیا اور میں پایوں کی بھوک بھڑکانے والی خوشبو کو ٹھکرا کر ان کے پیچھے پیچھے چل دی۔

جب میں ان کے گھر پہنچی تو اس وقت سازندے اور دوسرے مرد جا چکے تھے۔ تینوں نوجوان عورتیں، تھکن سے چُور، فرش پر اور صوفوں پر دراز آرام کر رہی تھیں۔ چندا کے ایک استاد نے اس شو کا انتظام کیا تھا۔ تین رقاصاؤں کے علاوہ اس میں سات موسیقار اور ایک مسخرہ بھی شامل تھا جو شو کے درمیان میں لوگوں کو لطیفے سنا کر ہنساتا تھا اور ایک طرح سے شو کے میزبان کا کردار بھی انجام دیتا تھا۔

لیلیٰ نے بازو اٹھا کر کہا ''شو تو بس یوں ہی سا تھا، ہائے مگر ہم بیحد تھک ضرور گئے ہیں۔''

چندا اور پمی (پڑوس کی ایک رقاصہ) فرش پر لیٹی تھیں۔ جو سامان وہ اپنے ساتھ لے گئی تھیں وہ وہیں فرش پر بکھرا پڑا تھا۔ میں نے ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر پوچھا: ''تو کیسا رہا پروگرام؟''

وہ تینوں ایک ساتھ بولنے لگیں۔ لیلیٰ نے کہا: ''سب شہدے تھے۔ سارا مجمع شہدوں کا تھا۔''

چندا نے چیخ کر کہا: ''تو اور کون ہو سکتے تھے؟ شہدوں ہی کے لیے تو ہوتے ہیں یہ پروگرام... جتنے بڑے شہدے ہوں، ہمارے لیے تو اُتنا ہی اچھا ہے۔''

پمی نے دھیرے سے کہا: ''میرے تو پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔''

لیلیٰ نے ہنس کر کہا: ''ذرا دیکھو! اس کام چور کے چھالے پڑ گئے! ناچنے سے نہیں پڑے ہیں، اِس کی جوتی کی ہیل ہی ایسی تھی۔''

پمی بُرا مان کر اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی: ''تمھیں کیا پتا؟ پورے آٹھ گھنٹے تک ناچی ہوں میں!''

چندا اور لیلیٰ ہنس پڑیں۔

''ذرا سنو فوزیہ'' چندا نے کہا ''چھ گھنٹے کا تو شو تھا اور یہ مہارانی آٹھ گھنٹے تک ناچی!'' پمی کی طرف دیکھ کر بولی ''کیوں جی؟ کس کے ساتھ ناچ رہی تھیں کہ ہمیں خبر بھی نہیں ہوئی؟''

چندا نے بھی اسے چھیڑا۔ ''ہاں، ہاں! ہمیں بھی بتاؤ، کہاں ناچ رہی تھیں، کس کے ساتھ؟''

پمی اور بھی سٹپٹائی اور بولی، ''اس مونچھوں والے کے ساتھ پچھلے کمرے میں تو تم گئی تھیں۔ مجھے اور لیلیٰ کو تو اسٹیج پر رہنا پڑا تھا۔ ہم تو چوری چھپے کہیں نہیں گئے تھے۔''

لیلیٰ نے چڑاتے ہوئے کہا: ''اور چندا تمھیں تو تین تین پرچیاں بھی ملی تھیں۔ ہائے ہائے۔ تمھیں تو تین محبت کے پیغام ملے۔ ہمیں تو ککھ (تنکا) بھی نہیں ملا!!''

پمی ابھی تک غصے کھول رہی تھی، اس نے کہا: ''میں گاہک پھنسانے کے لیے کسی کی گود میں نہیں جا گرتی!''

''آئے ہائے! یہ تو اتنی شریف ہے!'' چندا نے ڈانٹ کر کہا ''ارے تو بی بی، یہ دھندا چھوڑ کر شادی کیوں نہیں کر لیتی؟''

پمی منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ اس نے کہا: ''کچھ بھی کہو جی، بڑے بدتمیز لوگ تھے۔''

یہ سن کر لیلیٰ نے اتنی زور کا قہقہہ لگایا کہ صوفے سے گرتے گرتے بچی۔ میں نے پوچھا:
''اوہو! لیلیٰ، کس بات پر اتنا ہنس رہی ہو؟''

چندا نے کہا: ''فوزیہ! جب ہم ناچ رہی تھیں تو ایک شہدا بڑا اُچک رہا تھا۔ جیب سے تو دمڑی بھی نہیں نکال رہا تھا مگر چاہتا یہی تھا کہ ہم اس کے پاس ہی ناچیں۔''

چندا نے ہاں میں ہاں ملائی: ''وہی، کالی قمیض والا؟ ہائے، کیسا گندا تھا! جیب سے تو دس سے بڑا نوٹ ہی نہ نکالے اور ہمیں اپنی طرف کھینچے جائے!!''

لیلیٰ کو پھر ہنسی آنے لگی۔ ''اور پمی کو تو اتنی زور سے چٹکی کاٹی کہ نیل پڑ گیا ہے۔''

یہ سن کر چندا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا: ''سچ مچ؟ چٹکی لی تھی؟ ارے تو اس میں برا منانے کی کیا بات ہے۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ اسے پتا نہیں کہ ہمارا تو دھندا ہی یہ ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ پھر فرش پر دراز ہوگئی۔ لیلیٰ نے ساری بات بتائی۔

''تم تو اس مُوچھل کے ساتھ پچھلے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ پمی ناچتے ناچتے ایک کونے میں گئی تو اس بندے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اپنی گود میں گرا لیا۔ واپس آ کر اس نے مجھے نیل دکھایا۔ یہ تو رونے والی تھی...''

پمی منہ سجائے بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی۔ اس نے اس گفتگو میں حصہ لینے کی زحمت نہیں کی۔

چندا نے کہا ''ہمارے میزبان کا کزن بڑی معشوق چیز تھا۔''

لیلیٰ کروٹ لے کر پیٹ کے بل لیٹ گئی اور بولی: ''ہائے! وہ تو بڑا جانی تھا! مگر میری طرف تو اس نے دیکھا ہی نہیں۔ وہ تو بس تیرے اوپر گرم ہو رہا تھا چندا! تو اب کب ملاقات کر رہی ہے تو اس سے؟''

''آج شام۔ وہ لاہور آ رہا ہے۔ تم بھی سارے گُر جلد ہی سیکھ جاؤ گی۔ سچی بات ہے، پمی اور تمہارے مقابلے میں میرا تجربہ زیادہ ہے۔ ان بندوں کو بالکل پاگل بنانا پڑتا ہے۔ یہی ہمارا کام ہے، یہی لوگ چاہتے ہیں، اسی لیے ہمیں بلاتے ہیں اور ہمیں پیسے دیتے ہیں۔''

میں نے چندا سے پوچھا کہ یہ ملاقات کس طرح طے کی گئی۔ اس نے بتایا کہ اس آدمی نے ایک پرچی پر تاریخ اور وقت لکھ کر اسے تھما دیا تھا۔ پھر چندا نے کہا: ''امی تو رقم پہلے طے کیے بغیر مجھے کسی سے ملنے نہیں دیتیں مگر اس بندے کے لیے میں انہیں راضی کرلوں گی۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے کنجوس میزبان کے مقابلے میں اس میں زیادہ دم ہے۔ موٹی اسامی لگتا ہے۔ کاروبار تو ایسے ہی چلانا پڑتا ہے۔''

لیلیٰ نے بات کاٹی: ''مجھے تو اس لڑکے کی باتوں میں بھی مزا آیا، وہی جو سنہرے رنگ کا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ سمجھ گئی ناں؟''

پمی مسکرا دی: ''دیسی شراب چڑھ گئی تھی اس کو۔ سارے وقت ایسی حماقت کی باتیں کر رہا تھا۔''

''احمق ہی سب سے اچھے ہوتے ہیں۔ تم دونوں ابھی سمجھ نہیں سکتی ہو۔ تمھیں تو یہ سارا تماشا نظر آتا ہے۔'' چندا نے گرہ لگائی۔ پھر اس نے پمی کی طرف دیکھ کر کہا ''اگر عقل ہوتی تو اسے وہیں جھپٹ لیتیں۔ یہ تو بڑا آسان کام تھا۔''

''تو تم نے کیوں نہ پکڑ لیا؟'' پمی نے بھاری لہجے میں پوچھا۔

چندا نے ایک فاتح سپاہی کی طرح مسکرا کر کہا: ''او پاگل! میں کسی اور کو پھنسا رہی تھی۔ تم جانتی ہو میں پیسے والوں اور دل والوں کو فٹافٹ پہچان لیتی ہوں۔ میں پوری استاد ہوں۔ جو میں نے کوئی دوسرا کاروبار کیا ہوتا تو آج میں خود بڑا آدمی بن چکی ہوتی۔'' یہ کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

لیلیٰ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: ''خیر... مزا تو بہت آیا۔ میرے تو ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑنے لگے تھے۔ ویسے وہاں بندے مزا تو زیادہ کرنا چاہ رہے تھے مگر بٹوے کھولنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ پچھلے والا شو زیادہ اچھا تھا۔''

''ارے اُس کا کیا مقابلہ!'' چندا نے کہا: ''سنار تو سب سے بہتر ہوتے ہیں۔ تمھاری ماں نے تمھیں اب تک نہیں سکھایا۔''

لیلیٰ نے کہا: ''تمھارے لیے تو پورا شو ایک طرف اور وہ سنہرے کرتے والا مُنڈا (لڑکا) ایک طرف...!''

اس پر ہم سب زور سے ہنسے تو لیلیٰ کی ماں کمرے میں آ گئی۔ وہ کافی ناراض لگ رہی تھی۔ شاید صبح ذرا زیادہ جلدی اٹھی تھی۔ اس نے آتے ہی سب کو ڈانٹا۔ ''اتنا اونچا اونچا کیوں ہنس رہی ہو، بدتمیزی سے؟ کچھ تمیز بھی ہے کہ نہیں؟ میرے بھیڑے (برے) نصیب کہ یہ دن بھی دیکھنے کو ملے۔ کنجریوں نے اب اپنا یہ حال بنا لیا ہے!''

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ قیصرہ نے فرش پر سامان بکھرا دیکھ کر کہا: ''یہ دیکھو! تم اتنی لاپروا کیوں ہو؟ اور تم؟ چندا اور پمی... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ گھر جا کر آرام نہیں کرنا؟ چلو، چلو، اپنے گھر جاؤ۔ تمھاری مائیں انتظار کر رہی ہوں گی۔''

تینوں لڑکیوں نے کھی کھی کر کے ہنسنا شروع کر دیا۔ لیلیٰ نے بچوں جیسا منہ بنا کر کہا: ''امی، میں نے انہیں بلایا ہے۔ ایک ایک پیالی چائے پی کر چلی جائیں گی۔ آپ جاؤ۔''

لیلیٰ کی ماں نے مجھے دیکھ کر کہا ''دیکھا تم نے فوزیہ؟ بڑوں کا کوئی ادب نہیں رہا۔ ان گشتیوں کو بس کھانے کو چاہیے اور ان سے مزے کرالو۔ نہ تمیز سیکھتی ہیں نہ اپنا کام کرنا سیکھتی ہیں۔''

لیلیٰ صوفے سے اٹھ کر چیخنے لگی: ''اور پتوکی میں رات بھر میں کیا کر رہی تھی؟ ناچتے ناچتے پیر دکھنے لگے ہیں۔ باجوں والے اٹھ جاتے تھے، مسخرہ بھی چلا جاتا تھا مگر ہم پورے وقت اسٹیج پر تھے۔''

''تیری اتنی لمبی زبان ہوگئی ہے۔'' قیصرہ نے باہر جاتے جاتے چیخ کر کہا: ''ٹھہر تو ذرا، تیرا بھائی آ جائے تو تجھے مزا چکھاؤں گی۔''

لیلیٰ نے زور سے پکارا: ''گوبا۔ گوبا۔ ارے کوئی ہے جو ایک پیالی چائے ہی پلا دے؟ میں اتنی تھک گئی ہوں۔ میں سوؤں گی اب۔''

یہ کہتے کہتے وہ رو پڑی۔ گوبا دوڑتا ہوا سیڑھیوں سے اتر کر بازار چلا گیا۔

کمرے میں موجود لیلیٰ کی دوست عورتیں ہمدردی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ لیلیٰ نے شکوہ کرتے ہوئے کہا: ''نہ جانے یہ لوگ مجھ سے چاہتے کیا ہیں! میں اتنی کوشش تو کرتی ہوں۔ مگر ان کو تو میرا ہنسنا ہی اچھا نہیں لگتا۔''

شور سن کر قیصرہ کمرے میں دوبارہ آ گئی۔ اس نے لیلیٰ کو ایسے گھورا جیسے ابھی مار ڈالے گی۔ آخر میرے پاس بیٹھ کر اس نے لیلیٰ سے کہا: ''میرے ہی نصیب خراب ہیں جو تجھ جیسی بیٹی ملی ہے۔''

''لیلیٰ بچوں کی طرح زور زور سے رونے لگی۔ اس کی ماں نے کہا: ''تم بڑی ہونا چاہتی ہی نہیں۔ بس ہر وقت ہی ہی ہا ہا چاہیے۔ تم وہاں مزے اڑانے نہیں گئی تھیں۔ یہ تمہارا دھندا ہے اور تمہارا خاندان اسی سے چلتا ہے۔ اپنے بہن بھائیوں کا بھی کچھ سوچو، مگر تم ذمہ داری اٹھانے کو تیار ہی نہیں۔ اپنے موج میلے میں اپنی روزی کو بھی بھول جاتی ہو۔ تمہارے ساتھ مسئلہ یہ ہے۔'' اتنا کہہ کر قیصرہ نے بھی رونا شروع کر دیا۔

میں اب سمجھ گئی تھی کہ قیصرہ کو کیا شکایت تھی۔ وہ ہمارا شور سن کر نہیں جاگی تھی۔ وہ دیر سے لیلیٰ کا انتظار کر رہی تھی۔ پچھلی رات کی ہر بات وہ جان گئی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ لیلیٰ کو کتنی رقم ملی ہے۔ بات یہ تھی کہ لیلیٰ نے کوئی خاص ویل وصول نہیں کی تھی۔ استاد نے جو رقم طے کی تھی، بس وہی سوکھی رقم اسے مل سکی تھی۔ اوپر کی کوئی آمدنی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ لیلیٰ کو پیسہ کھینچنے کا گر نہیں آتا تھا۔ اسی وجہ سے استاد نے بھی سخاوت نہیں دکھائی تھی اور اسے مقررہ رقم کے علاوہ کچھ نہیں دیا تھا۔ سونے پر سہاگا یہ تھا کہ کوئی گاہک بھی نہیں پھنسا تھا۔

گوبا چائے لے آیا۔ قیصرہ نے اسے ڈانٹ پلائی کہ وہ میرے لیے کیوں کچھ نہیں لایا۔ میں

نے ڈرتے ڈرتے انکار کرنا چاہا لیکن یہ مناسب موقع نہ تھا۔ کوبا دودھ لینے دوڑ گیا۔ کمرے میں خاموشی اور بھی گہری ہوگئی۔ صرف لیلیٰ کی سسکیوں کی آواز سب کو سنائی دے رہی تھی۔ اس نے چائے کے لمبے لمبے گھونٹ حلق سے اتارے اور آنکھیں ملتے ہوئے، زیرِ لب یہ کہتے ہوئے اندر چلی گئی کہ وہ سونا چاہتی ہے۔ قیصرہ نے چندا اور پمی کی طرف دیکھا۔ ان دونوں نے ابھی چائے ختم نہیں کی تھی۔ وہ کہنے لگی: ''خیر ہے، چائے ختم کرلو پھر گھر جاؤ۔ تمہاری مائیں انتظار کر رہی ہوں گی۔ یہ سامان کوبا پہنچا دے گا۔'' پھر اس نے چندا سے کہا: ''چندا! تم تو بڑی سیانی ہو۔ لیلیٰ کو کچھ عقل دو نا!''

چندا نے قیصرہ کو عجیب نظروں سے دیکھا اور بولی: ''مجھ کو تو معاف ہی رکھو۔ میرے اپنے دل پر کم داغ ہیں؟ چاہے جتنا بھی کرو، لوگوں کی تسلی تو کبھی ہوتی نہیں۔'' مجھے چندا کی آنکھوں میں جھلکتی ہوئی نفرت صاف نظر آ رہی تھی۔ میں محسوس کر سکتی تھی کہ اپنے گھرانے کے نظام کے جبر کا شکار چندا بھی ہے۔

چندا اور پمی نے چائے ختم کی اور کوبا کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو جانے لگیں۔ میں نے بھی اٹھ کر رخصت چاہی۔ قیصرہ منہ سے تو نہ بولی مگر اس نے میرا ہاتھ دبایا۔ میں یہ اشارہ نہ سمجھی اور جانے لگی۔ اس پر قیصرہ نے مجھے کھینچ کر روک لیا اور آنکھوں سے بھی اشارہ کیا۔ میں رک گئی۔ چندا اور پمی کے جانے کے بعد قیصرہ نے کہا: ''مہربانی سے ذرا رک جاؤ!''

ہم ڈرائنگ روم میں صوفوں پر پالتی مارے بیٹھے تھے۔ قیصرہ اداس تھی اور کسی سے اپنے دل کی بات کہنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے قیصرہ کو سب سے زیادہ موزوں میں ہی لگی تھی۔ اب میں اس گھرانے کی بااعتماد دوست بن چکی تھی جو ہمیشہ ان کی بات سننے کو تیار تھی۔

قیصرہ نے بات شروع کی۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لڑکی کا میں کیا کروں! اب یہ گھرانے پر بوجھ بن گئی ہے۔ لوگوں میں جو بدنامی ہو رہی ہے وہ الگ...''

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''سارا دن انڈین فلمیں دیکھتی رہتی ہے۔ دن چڑھے سو کر اٹھتی ہے اور ریاض کرنے بھی بس نام کو ہی جاتی ہے۔ اس پر گاہکوں کو خوش بھی نہیں کرتی۔ میں مانتی ہوں کہ روزی دینے والا اللہ ہے مگر کچھ ذمے داری تو اپنی بھی ہوتی ہے۔ محنت بھی تو کرنی پڑتی ہے۔ اسے بس شوں شاں چاہیے۔ نواب زادیوں کی طرح کوئی ہر وقت اس کی تفریح کا سامان کرتا رہے۔''

''یعنی؟'' میں نے کریدا۔

''اب اس کی شادی ہو جانی چاہیے مگر کوئی ڈھنگ کا رشتہ نہیں آیا ہے۔ میں اور میرا بیٹا بڑی

کوشش کر رہے ہیں لیکن ہم قیامت تک تو انتظار نہیں کر سکتے ناں!''

مجھے علم تھا کہ باضابطہ نتھ اترائی سے پہلے لیلیٰ کاروبار شروع نہیں کر سکتی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ محلے کی طوائفیں، نتھ کی رسم سے پہلے بھی، گنے چنے، مخصوص گاہکوں سے تعلقات قائم کر لیتی ہیں۔ مگر یہاں کی طے شدہ رسوم کے مطابق یہ سب کچھ وہ کھل کر پہلے گاہک سے نتھ اتروائی کے بعد ہی کر سکتی تھی۔ بکارت کے اونچے دام وصول کر کے پھر باقاعدہ کاروبار کا آغاز کیا جا سکتا تھا۔

قیصرہ کے ذہن پر جو بوجھ بڑھتا جا رہا تھا، میں اسے محسوس کر سکتی تھی۔ قیصرہ نے مایوسی سے کہا: ''لیلیٰ تو کسی کام کی نہیں... جب بھی باہر جاتی ہے، بس کھی کھی کر کے ہر بات پر ہنستی رہتی ہے۔''

وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھی اور اس کی نگاہیں دیوار پر لگی پرانی تصویروں پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے کہا: ''میری بہن نے مجھے پہلے ہی بہت دکھ دیئے ہیں۔ اب اور دکھ سہنے کی سکت مجھ میں نہیں۔''

''یہ... کیا یہ آپ کی بہن ہیں۔'' میں نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ پھر میں نے بے اختیار کہا: ''اور یہ دوسری... یہ آپ ہیں؟ بالکل آپ ہی کی شکل ہے۔ ہائے اللہ! مجھے پہلے پتا کیوں نہ چلا!!'' میں نے ان تصویروں کے بارے میں پہلے بھی سوال کیے تھے مگر قیصرہ نے ہمیشہ بات ٹال دی تھی۔

''ہاں!'' قیصرہ نے جواب دیا۔ ''وہ اور زمانے تھے۔ ہم بڑوں کا ادب کرتے تھے۔ کیسی ہی مشکل کیوں نہ پڑے، ہم بزرگوں کی بات ٹال ہی نہیں سکتے تھے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔''

''اور... آپ کی بہن؟'' میں نے پوچھا۔

قیصرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چند لمحوں تک وہ بول بھی نہ سکی۔ پھر دوپٹے سے منہ صاف کرتے ہوئے اس نے کہا: ''اس کے بارے میں پھر کبھی بتاؤں گی۔ ابھی تو تم لیلیٰ سے بات کرو۔ اسے سمجھاؤ کہ میری بات پر کان دھرے ورنہ کل کو پچھتائے گی۔ پہلے ہی بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔''

''میں!!'' میں چونک پڑی۔ اس بات پر تو میں بڑی خوش تھی کہ قیصرہ مجھ پر اتنا اعتماد کرنے لگی ہے کہ خاندانی مسائل سلجھانے کے لیے میری مدد کی طالب ہے، لیکن یہ میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ میں لیلیٰ کو اپنی ماں کی نصیحت پر عمل کر کے اچھی طوائف بننے پر راضی کروں گی۔ مگر قیصرہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی۔ ''تم اس کی بہن کی طرح ہو۔ اگر بہن کا کوئی رشتہ نہ آئے تو خاندان مدد کرتا ہے۔ تم اسلام آباد میں اس کے لیے کسی کو کیوں نہیں ڈھونڈتیں؟''

یہ سن کر میرے سر پر ہتھوڑا سا پڑا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک لمحے میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور قیصرہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہنسنے کا مقام ہے کہ رونے کا... میں اس کی بات سنجیدگی سے سنوں، ہنسی میں اڑاؤں یا اٹھ کر چلی جاؤں! بہرحال

میں نے فوراً ہی فیصلہ کیا کہ میں اس کی پوری بات سنوں گی اور پھر یہیں بات صاف کر دوں گی۔

قیصرہ کہہ رہی تھی: ''تمہارا شہر بڑے امیر افسروں اور سیٹھوں سے بھرا پڑا ہے۔ تم ضرور لیلیٰ کے لیے کسی کو ڈھونڈ سکتی ہو۔ ہم لالچی لوگ نہیں ہیں۔ لیکن ہمیں برادری میں اپنا بھرم بھی رکھنا ہے۔ ہم بس اتنی رقم کا مطالبہ کریں گے جو خاندان کی عزت قائم رکھ سکے۔''

''کتنی رقم؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اتنی سیدھی نہ تھی کہ مجھے رقم صاف صاف بتا دیتی۔ اس نے کہا: ''یہ تو دیکھیں گے۔''

میں نے قیصرہ کا ہاتھ تھاما اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔ میں نے کہا: ''میں صاف بات کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے لیلیٰ بہت اچھی لگتی ہے اور آپ بھی۔ میں خوب سمجھتی ہوں کہ آپ کے دل پر کیا بوجھ ہے۔ جب اچھا رشتہ نہ آئے تو ہمارے خاندانوں میں بھی مائیں اسی طرح بیٹیوں کے مستقبل کے لیے پریشان ہو جاتی ہیں۔ لیکن... اس سلسلے میں، میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ میں جھوٹا وعدہ نہیں کروں گی۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اچھی طرح بات سمجھ لیں۔ میں اس معاملے میں بالکل نہیں پڑ سکتی۔''

قیصرہ میری آنکھوں میں جھانک کر بہت غور سے ایک ایک لفظ سُن رہی تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ لیلیٰ کے بھلے کی بات سوچتی ہیں۔ کل کہیں وہ دن نہ آئے کہ لیلیٰ کو دو وقت کی روٹی کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں لیکن... میں اس معاملے میں قطعی نہیں پڑ سکتی۔''

قیصرہ نے سر جھکا لیا۔ پھر ایک لمحے بعد اس نے مجھے گلے لگا کر کہا: ''تو پھر میرے لیے دعا کرو۔ میری روح کو سکون نصیب ہو جائے۔''

باب ۱۲
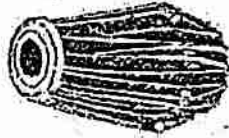
پمّی کا خاندان

پمی کی ماں چارپائی پر بیٹھی پالک کا ساگ کاٹ رہی تھی۔ کٹا ہوا پالک نیچے رکھی سینی میں گرتا جارہا تھا۔ وہ بھاری بھرکم تھی اور اسے بڑا پسینہ آتا تھا۔ اس تن وتوش کے ساتھ تیل کے چولہے کے پاس پڑی چھوٹی سی پیڑھی پر تو وہ بیٹھ ہی نہیں سکتی تھی۔

وہ ایک اونچی عمارت کی نچلی منزل میں رہتی تھی۔ پرانے شہر کی زیادہ تر عمارتوں کی طرح، اس عمارت کے وسط میں بھی ایک بڑا، کھلا صحن تھا جو اس منزل میں رہنے والے تین خاندانوں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ پمی کے خاندان کے پاس تین کمرے تھے۔ دو کمروں میں وہ رہتے تھے اور تیسرے میں کاروبار کرتے تھے۔ تینوں کمروں کے دروازے، گلی میں نہیں بلکہ اسی صحن میں کھلتے تھے۔ دوسرے دو کرایہ داروں کے پاس دو دو کمرے تھے جن کے دروازے بھی صحن میں ہی کھلتے تھے۔ صحن کے ایک کونے میں غسل خانہ تھا جو سارے مل بانٹ کے استعمال کرتے تھے۔ اس صحن میں کھانا پکانا، کپڑے دھونا، بچوں کو نہلانا، سب کچھ ہوتا تھا اور یہاں کے مکینوں کے لیے یہ ایک بیٹھک یا چوپال بھی تھی۔

پمی کی ماں اپنے کمرے کے دروازے کے بالکل نزدیک بیٹھتی تھی تاکہ صحن میں آنے جانے والوں پر نظر رکھ سکے۔ سانولا رنگ، بڑے بڑے نین نقش، اور گول چہرہ... اس کے ہاتھ بھی بڑے بڑے تھے۔ اس نے اپنے سیاہ رنگے ہوئے بالوں کی چوٹی کس کر گوندھ رکھی تھی۔ وہ اکثر پھولدار شلوار قمیض

کے ساتھ ململ کا سفید دوپٹہ اوڑھتی تھی۔ میں نے اسے زیادہ تر میلے کچیلے کپڑوں میں ہی دیکھا تھا۔

پمی کی ماں کی سات اولادیں زندہ بچی تھیں۔ دو بچے پیدائش کے وقت اور تیسرا تین ماہ کا ہو کر فوت ہو گیا تھا۔ مرنے والے تینوں لڑکے تھے۔ اب اس کی پانچ بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ پمی سب سے بڑی بیٹی تھی اور کنجروں کے دستور کے مطابق اب اس کا نام ''پمی دی امی'' پڑ گیا تھا۔ اس کا بیٹا پمی سے دو برس بڑا تھا مگر اس محلے میں لڑکیاں زیادہ اہم تھیں، اس لیے ماں کا نام بھی بیٹی کے نام پر پڑا تھا۔

اس کا سب سے بڑا بیٹا چودہ برس کی عمر میں گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ پمی کی ماں کا کہنا تھا کہ اس پر کوئی سایہ ہو گیا تھا۔ وہ گھر کا چھوٹا موٹا کام کرتے ہوئے اور پاس کی دکانوں کا چکر کاٹتے ہوئے بڑا ہوا تھا۔ بازار سے ناشتہ لانا، گاہکوں کے لیے سگریٹ، ماچس لانا، ان کے بڑے نوٹ تڑانا، ماں کے لیے پان اور مہمانوں کے لیے چائے لانا، یہ سب اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ چھوٹی موٹی چیزوں کی مرمت کرواتا، بہنوں کے لیے گانوں کے کیسٹ لاتا اور پسند نہ آنے پر کیسٹوں کو بدلوا بھی لاتا۔ ماں کے پیغامات وہ محلے کے سازندوں تک بھی لے جاتا۔ شاید وہ اس زندگی سے مطمئن نہ رہا ہو مگر کام سب دلچسپ تھے۔ پمی کی ماں کا کہنا تھا کہ اس پر کوئی جن آ گیا اور اس لیے وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ پمی کی ماں اس کا ذکر کم ہی کرتی تھی اور بات نکلے تب بھی بس اتنا کہتی تھی کہ وہ بھی شانو کے لڑکے پپو کی طرح اپنے خاندان کے لیے دو پیسے کما سکتا تھا۔ یہ شانو کا لڑکا ذرا نچلے درجے کا دلال تھا جو اپنی بہنوں اور دوسری پڑوسنوں کے لیے اچھے سودے پٹاتا تھا۔

اس معمولی سے گھر کی شہزادی تھی پمی... وہ گھر کی بڑی بیٹی اور کماؤ سپوتنی تھی۔ اس لیے ماں بہت لاڈ کرتی تھی۔ موٹاپا اسے ماں سے ورثے میں ملا تھا اور انیس برس کی عمر میں ہی اس کا بدن بھاری ہو چلا تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ اپنی کمائی کی عمر کے آخری نصف دور میں داخل ہو چکی تھی۔ اب اسے مستقبل کی منصوبہ بندی سنجیدگی سے کرنی تھی۔ اس کی دوسری دو بہنیں سترہ اور چودہ برس کی تھیں اور یہ ان کے عروج کا دور تھا لیکن ان کے گھر کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس گھرانے میں پانچ بیٹیاں ہیں۔ پمی کی ماں کا کہنا تھا کہ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔

اس بار میں دس دن کے لیے لاہور آئی تھی۔ پہلے ہی دن سہ پہر کو میں اس محلے میں اپنے رابطے کے ایک آدمی کے پاس جا پہنچی تھی جو اس عمارت میں رہتا تھا۔ اس کے ایک شاگرد نے بتایا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے اور تھوڑی دیر میں آئے گا۔ اس کے کمرے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے میرا استقبال تالے نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اس علاقے میں ہر گھر میں کوئی نہ کوئی ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔

وقت کاٹنے کے لیے میں نے اپنے اطراف نظر ڈالی۔ پمی یہیں رہتی تھی۔ دوسرے کوٹھوں پر میری پمی سے ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں مگر اس کے خاندان سے میرا باقاعدہ تعارف نہیں ہوا تھا۔

پمی کی ماں سے بھی میرا واجبی سا تعلق تھا۔ ہم نے آپس میں کبھی باتیں نہیں کی تھیں۔ میں پمی کے کمرے کی طرف بڑھی تو اس کی ماں نظر آئی جو ساگ کے ڈھیروں گٹھے لیے، ہاتھ میں ایک بڑا سا چاقو تھامے اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس کی قمیض بغلوں کے پاس پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ اس نے سر اٹھائے بغیر، صرف نگاہیں اٹھا کر میرا جائزہ لیا اور کوئی بھی تاثر ظاہر کیے بغیر ساگ کاٹتی رہی۔ مجھے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے میں ایک دریائی بھینسے کے پاس سے گزر رہی ہوں جو جنبش کیے بغیر، صرف آنکھوں سے میرا تعاقب کر رہا ہے۔ صحن میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں سے علیک سلیک کرتی ہوئی میں سیدھی اس کے پاس جا پہنچی اور ایک عدد "سلام علیکم" داغ دیا۔ اب تو چارو ناچار اسے سر اٹھانا ہی پڑا۔

"وعلیکم..." اس نے کہا

میں نے سارا ماجرا کہہ سنایا کہ میں اس کے پڑوسی سے ملنے آئی تھی لیکن کیونکہ وہ گھر پر نہیں ہے اس لیے مجھے اس کا انتظار کرنا ہے۔ پمی کی ماں نے کچھ کہے بغیر چاقو سے اشارہ کیا کہ میں چارپائی پر بیٹھ جاؤں۔ پھر اسی چاقو سے وہ ساگ کے کٹے ہوئے پتے ایک طرف ہٹانے لگی۔ میں اس کے برابر بیٹھ گئی۔ صحن میں بہت گرمی تھی اور خوب شور مچ رہا تھا۔ پاس ہی ایک لڑکی اور لڑکا کھیل رہے تھے۔ ایک دوسری چارپائی پر دو لڑکیاں بیٹھی تھیں اور قریب میں ایک لڑکی کپڑے دھو رہی تھی۔ پمی کی ماں اپنے کمرے کے دروازے میں چارپائی پر ڈٹی ہوئی تھی۔

میں نے جب اس سے پوچھا کہ پمی کہاں ہے تو اس نے کہا: "کام پر گئی ہے۔"

اس کی صاف گوئی سے مجھے بہت مزا آیا۔ میں اس سے اپنا تفصیلی تعارف کرانے لگی تاکہ وہ میرے ارادوں کے بارے میں کسی شک و شبہ میں نہ پڑ جائے۔ پمی کی ماں نے سر اٹھایا اور اپنے بڑے سے چاقو سے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر کہنے لگی: "میں تمہیں نہیں جانتی کیا؟ ارے خوب جانتی ہوں! یہاں تو ہر کوئی تمہیں جانتا ہے۔"

میں نے جھینپ کر کہا "جی، میں تو آپ کو جانتی ہوں مگر مجھے علم نہیں تھا کہ آپ بھی مجھ سے واقف ہیں یا نہیں..."

میری آنکھوں کے سامنے وہ خوفناک چاقو نچاتے ہوئے اس نے پوچھا: "تم اسلام آباد سے ہمارے گھر فون نہیں کرتیں؟"

مجھے لگا جیسے اس کے درشت چہرے پر مسکراہٹ کی پرچھائیں سی پڑ رہی ہے۔
میں نے کہا ''جی ہاں! اور آپ کے بچوں نے میری بڑی مدد کی ہے۔ ہمیشہ میرا پیغام پہنچا دیتے تھے۔''
''میرے بچے؟ ارے اتنے زیادہ تو ہیں یہ۔ کسی اچھے کام تو آئیں!''
میں نے ہمت کر کے بات بڑھائی: ''آپ کی تو ماشاء اللہ پانچ بیٹیاں ہیں۔ آپ تو بڑی خوش قسمت ہیں۔ یہاں تو لوگ مزاروں پر منتیں مانتے ہیں کہ بیٹیاں پیدا ہوں۔''
پمی کی ماں نے ٹھنڈی سانس لی اور بولی: ''ہاں۔ یہ تو ہے! مگر صرف بیٹیاں ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ نصیبہ بھی تو ہونا چاہیے!''
ساگ کے گٹھے کی کٹائی ختم کر کے اس نے بلند آواز سے کسی لڑکی کو پکارا۔ کیا آواز تھی! لگتا تھا کہ گلے میں بھونپو لگا ہوا ہے۔ اس وقت تک مجھے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ بغیر مائیکروفون کے گانے کی وجہ سے اس محلے کی عورتوں کی آوازیں دوسری عورتوں سے زیادہ بلند ہو گئی ہیں لیکن یہ آواز تو کسی تھیٹر کی اداکارہ جیسی کراری تھی۔ پمی کی ماں نے اپنی کسی بیٹی کو حکم دیا کہ کٹی ہوئی سبزی اور چاقو وہاں سے ہٹا لے۔ اس چاقو کی رخصت پر مجھے دلی سکون محسوس ہوا۔
اس کی بیٹی کٹی ہوئی سبزی چولہے کے پاس اٹھا لے گئی۔ صحن میں جہاں ایک لڑکی کپڑے دھو رہی تھی، وہیں ایک چولہا بھی بنا ہوا تھا۔ چارپائی پر بیٹھی دونوں لڑکیاں اب چولہے کے پاس جا بیٹھیں۔ لگتا تھا دونوں کو ایک دوسرے سے بہت لگاؤ ہے۔ ان میں سے ایک کا نام ''روزی'' اور دوسری کا ''سونی'' تھا۔ دونوں پمی کی بہنیں تھیں۔
پمی کی ماں نے اپنی زلزلہ خیز آواز میں پھر کوئی اعلان کیا۔ میری سمجھ میں صرف کچھ الفاظ آ سکے مگر معلوم ہوتا تھا کہ بچوں کو شور نہ مچانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔
اس حکم کا بہرحال کچھ اثر نہ ہوا لیکن ایک لڑکی نے میرے پاس آ کر مجھ سے چائے کے لیے پوچھا۔ ہمیشہ کی طرح میں نے انکار کر دیا اور چائے کی جگہ مجھے دودھ پیش کیا گیا۔ میں ٹھہری پنجابن، دودھ سے کیسے انکار کر سکتی تھی۔ میں نے پمی کی ماں سے پوچھا کہ اس کی بیٹیاں ناچتی کہاں ہیں۔ اس گھر میں تو کوئی مناسب جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ ایک عمارت کا پچھواڑہ تھا جس کا دروازہ ایک تنگ گلی میں کھلتا تھا۔ ایک صحن شاہراہِ عام بنا ہوا تھا اور ہر جگہ لوگ ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے۔
پمی کی ماں نے کہا ''کسی کے بھی کوٹھے پر ناچ لیتی ہیں۔ کبھی کہیں تو کبھی کہیں... آج کل کوٹھے والی ڈیرہ دارنیاں ناچنے والیوں کو پورا حصہ بھی نہیں دیتیں۔ ایک جگہ سے تنگ آ جاتے ہیں تو

ہم دوسری جگہ ڈھونڈتے ہیں۔''

میں نے پوچھا کہ حصہ کس طرح تقسیم کیا جاتا ہے تو اس نے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ اتنے براہِ راست سوال کے لیے تیار نہ تھی مگر اب تک اس نے مجھ سے بڑی صاف گوئی سے بات کی تھی۔ میں نے مسکرا کر وضاحت کی: ''دراصل میں اس نظام کو سمجھنا چاہتی ہوں۔''

اس نے کہا ''بتا دوں گی۔ مگر ابھی نہیں۔''

''پھر کب؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

اس نے میرے کندھے کے اوپر دیکھتے ہوئے کہا: ''جب تم دودھ پی لوگی، تب...''

میں نے مڑ کر دیکھا تو اس کی بیٹی ٹھنڈے دودھ کے دو گلاس لیے کھڑی تھی۔ مجھے اس کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ہم سب ہنس پڑے اور دودھ کے دور کا آغاز ہوا۔ ایک گلاس پمی کی ماں نے لیا اور ایک ہی گھونٹ میں سارا دودھ غٹاغٹ پی گئی۔

میں نے بھی پہلا گھونٹ بھرا اور پوچھا: ''اب بتائیں گی؟''

وہ ہنسنے لگی۔ پھر اس نے کہا: ''میں نے سن رکھا ہے کہ تم تو بڑی پڑھی لکھی ہو۔ کیا ہم بھی تمھیں کچھ سکھا سکتے ہیں؟''

''جی ہاں! بالکل...'' میں نے کہا۔

وہ چارپائی پر پہلو بدل کر آرام سے بیٹھ گئی۔ اس نے مجھ سے بھی کہا: ''پاؤں اٹھا کر آرام نال بیٹھو...'' پھر اس نے بتانا شروع کیا: ''جب ناچنے گانے کا ویلا ختم ہو جاتا ہے تو شام بھر کی کمائی کے سب حصہ دار آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں۔''

''کون حصہ دار؟'' میں نے پوچھا۔

''صبر سے سنو تو سہی۔''

''اچھا، اچھا۔ اب میں بیچ میں نہیں بولوں گی۔'' میں نے معذرت کے انداز میں کہا۔ پمی کی ماں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''پہلے تو کل رقم سے نیاز کے پیسے نکالے جاتے ہیں۔ یہ اکثر چوتھا حصہ ہوتا ہے۔ سب مل کر طے کر لیتے ہیں کہ نیاز کتنے کی دینی ہے۔ کبھی یہ روپے میں پانچ پیسے بھی ہو جاتی ہے۔ باقی رقم کے دو حصے کیے جاتے ہیں۔ ایک حصہ ناچنے والیوں کو ملتا ہے تو دوسرا استادوں کو دیا جاتا ہے۔ ڈیرہ دار کو دونوں میں سے حصہ ملتا ہے۔ یہ اس کا حق بنتا ہے۔ آئی سمجھ میں؟''

''کچھ کچھ...'' میں نے پوچھا: ''یہ ڈیرا دارنی کوٹھا چلانے والی ہوئی نا؟''

پمی کی ماں بولی، ''ہاں''، پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے سمجھانا شروع کیا۔ پہلے اس نے

ایک چلّو سا بنایا جیسے اس کے ہاتھوں میں پانی ہو۔ ’’روپیے میں سولہ آنے... دو آنے نیاز کے چلے گئے۔‘‘ اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

’’باقی بچے چودہ آنے... ان کے کیے دو حصے۔‘‘ اس نے دونوں ہاتھ الگ کر دیے۔ ’’ایک حصہ گیا استادوں کے پاس، اور دوسرا ناچنے والیوں کو ملا۔ ڈیرہ دار کو دونوں سے حصہ ملے گا۔‘‘

میں نے بات کاٹ کر کہا: ’’ذرا رکیے... ڈیرہ دار کو کتنا حصہ ملتا ہے، اور کیسے یعنی کس بنیاد پر؟ اگر استادوں کو سو روپے ملے اور ناچنے والیوں کو سو روپے ملے تو ڈیرہ دار کو کیا ملے گا؟‘‘

پمی کی ماں نے بتایا: ’’اگر تین ناچنے والیاں ہوں تو کل رقم کے چار حصے کیے جائیں گے۔ ایک حصہ ڈیرہ دار کو ملے گا۔ اگر ساز بجانے والے چار ہوئے تو ان کی رقم کے حصے ہوں گے پانچ... اس میں سے ایک حصہ ڈیرہ دار کو ملے گا۔‘‘

’’اب میں سمجھی!‘‘ میں نے خوش ہو کر کہا ’’تو رقم اس طرح تقسیم ہوتی ہے لیکن... ڈیرہ دارنی تو ناچنے والیوں میں ہی سے ہوتی ہے۔ ساز بجانے والے تو کوٹھا نہیں چلاتے۔‘‘

پمی کی ماں نے کہا: ’’اگر ناچنے والی ڈیرے دارنی کے اپنے گھر کی ہو تو اسے اس کا حصہ ہاتھ میں نہیں دیا جاتا۔ سب کچھ ڈیرہ دارنی ہضم کر جاتی ہے۔ ناچنے والی باہر سے آئی ہو، جیسے میری بیٹیاں کسی اور کے کوٹھے پر جا کر کام کرتی ہیں، تب ہی اس کو اس کا حصہ ملتا ہے۔ نیاز کے پیسے بھی ڈیرہ دارنی کے پاس جاتے ہیں۔ اب یہ اس پر ہے کہ نیاز دے یا نہ دے۔ وہ جانے اور اس کا خدا... اسی کی کہنا (ہم کیا کہہ سکتے ہیں)! مگر آج کل ڈیرہ دارنیاں سب کو اُلّو بنا لیتی ہیں۔ سارے پیسے اپنی گلک میں رکھ لیتی ہیں۔‘‘

اس نے مسکرا کر کہا: ’’اب تو خوش ہو؟ ہوگئی تیری تسلی؟‘‘

پمی کی ماں کی شہرت ملنساری کی نہیں تھی مگر وہ مجھے اچھی لگی۔

وہ پھر بچوں پر طوفان کی طرح گرجی۔ آدھی درجن گالیوں کے علاوہ جو کچھ اس گرجنے سے میری سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ شاید وہ اپنی لڑکیوں سے ہمارے لیے پکوڑے بنانے کی فرمائش کر رہی تھی۔

چارپائی پر ایک پہلو بیٹھے بیٹھے میرے پیر سُن ہو گئے تھے۔ میں نے پہلو بدل کر اس سے پوچھا۔

’’اور وہ کمرہ کس لیے ہے؟‘‘ کمرے میں روایتی کنڈی لگی تھی جس میں بڑا سا تالہ لٹک رہا تھا۔

’’گاہکوں کے ساتھ سونے کے لیے۔‘‘ پمی کی ماں نے کہا۔ ’’اس کی ڈیرہ دار میں ہوں۔ ہماری یہ حیثیت نہیں ہے کہ بڑی جگہ لیں جہاں ناچ ہو سکے۔ لیکن ایک چھوٹا کمرہ میں لے سکتی ہوں۔ یہ جو کشتیاں گلیوں میں دھندا کرتی ہیں ان کو رات کو کرائے پر دے دیتی ہوں۔ اس کمرے کا باہر تو

دروازہ نہیں ہے۔ یہ ناچ کے لیے استعمال نہیں ہوسکتا۔ ان لڑکیوں کے پاس رات کو گاہک لے جانے کی جگہ نہیں ہوتی تو میرا یہ والا کمرہ کرائے پر لے لیتی ہیں۔"

میں نے تجسس سے پوچھا: "کیا میں اسے اندر سے دیکھ سکتی ہوں؟"

"پھر کبھی..." اس نے جواب دیا۔

"اور... آپ کرایہ کتنا لیتی ہیں؟"

یہ سن کر وہ اتنی زور سے ہنسی کہ سب بچے خاموش ہوکر اسے تکنے لگے۔ شاید انہوں نے برسوں سے اس عورت کو ہنستے نہیں دیکھا تھا۔

"بچوں جیسی باتیں پوچھ رہی ہو... ہیں؟؟ اس نے کہا۔

میں مسکرا کر جواب کا انتظار کرنے لگی۔ آخر اس نے کہا: "روپے میں دس پیسے لیتی ہوں۔"

"یعنی دس فی صد...!" میں نے کہا "اور کتنی دیر استعمال کی اجازت ہوتی ہے؟"

عین اس وقت استاد گامن کے شاگرد رزوبا کی بھاری آواز نے اعلان کیا کہ استاد جی واپس آچکے ہیں۔ یہ بھی کوئی وقت تھا آنے کا۔ میں کسی صورت اپنی گفتگو ابھی ختم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"جاؤ جاؤ!! میں نے کہا، "مجھے خالہ سے باتیں کرنے میں بڑا مزا آ رہا ہے۔"

میرا خیال ہے پمی کی ماں کو میری یہ بات بہت بھائی کہ میں فوراً اٹھ کر نہیں چلی گئی۔ اس نے مجھ سے کہا: "آج روٹی ہمارے ساتھ کھانا۔" میں فوراً تیار ہوگئی۔ اس روز سہ پہر میں اس سے اور اس کی بیٹیوں سے باتیں کرتی رہی اور یوں ان خواتین نے میرے علم میں اضافہ کیا۔

باب ۱۳
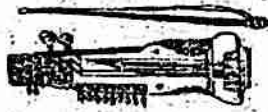
بیٹھک میں

ایک روز میں بیٹھک میں دو موسیقاروں کا انٹرویو لے رہی تھی۔ یہ دونوں بھائی تھے اور کہا جاتا تھا کہ اب اس محلے میں صرف یہ دو ہی ایسے استاد باقی رہ گئے ہیں جو موسیقی کی تعلیم سنجیدگی سے دیتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ صرف ان شاگردوں کو قبول کرتے ہیں جو واقعی موسیقی سیکھنا چاہتے ہیں اور جن کے خاندان والے بھی اس بارے میں سنجیدہ ہیں۔ وہ سختی سے اس اصول پر کاربند تھے کہ ایسی لڑکیوں پر وقت ضائع نہیں کریں گے جو مجروں میں ہندوستانی فلمی گیت گا کر صرف کام چلانا چاہتی ہیں۔

بڑے بھائی اشرف علی نے کہا: ''ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے شاگرد ترقی کریں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب تک انہوں نے بڑا نام کمایا ہے۔''

چھوٹے بھائی عثمان علی نے اضافہ کیا: ''استاد کا فرض صرف موسیقی سکھانا نہیں ہوتا۔ نئے فنکاروں کا موسیقی کی دنیا میں تعارف بھی کرانا پڑتا ہے۔ فنکارہ کو سکھانا ہوتا ہے کہ کونسی چیز کہاں گائی جائے۔''

میں نے مہذبانہ سوال کیا کہ آیا ان کی مراد مختلف گاہکوں سے ہے۔ اشرف نے کہا ''نہیں۔ ہمارا مطلب ہے کہ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم والوں کے لیے کیا گایا جائے۔''

عثمان علی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا: ''وقت بدل گیا ہے، پھر بھی اس محلے نے بڑے نامور فنکار پیدا کیے ہیں۔ ساری اونچی گانے والیاں، اداکارائیں، موسیقار، سب یہیں سے نکلے ہیں۔ اس محلے میں طوائف کے پیشے سے کچھ ایسے فنونِ لطیفہ بھی منسلک ہیں جن کی معاشرے میں اپنی مخصوص

روایت اور مقام ہے۔ کلاسیکی موسیقی سے وابستہ ہمارے زیادہ تر عظیم موسیقاروں کا اس محلے سے کسی نہ کسی طرح واسطہ رہا ہے۔ ان کے گھرانوں کی روایات اپنی جگہ مسلّم ہیں لیکن شاہی محلے کے رقص و سرود نے بھی ان کی فنی نشوونما میں ایک کردار ادا کیا ہے۔ دوسری طرف ان کے فن نے کوٹھوں میں گائیکی کا معیار بھی بلند کیا ہے، حالانکہ اب اسے سمجھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔''

اشرف نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: '' یہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم استادوں کا طوائف کے پیشے سے یا کنجر ذات سے ہرگز کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس بازار میں ہمارا سروکار صرف موسیقی سے ہوتا ہے۔ جب کلاسیکی موسیقی کی ہی معاشرے میں اہمیت نہ رہی تو اس محلے کی رہی سہی ساکھ پر بھی پانی پھر گیا۔ اب تو ہمارے لیے بھی یہاں رہنا ایک مسئلہ بنتا جارہا ہے۔ ہماری اولاد محسوس کرتی ہے کہ یہ رہنے کا باعزت علاقہ نہیں ہے۔ وہ والدین سے اصرار کرتے ہیں کہ ہم کریم پارک میں منتقل ہو جائیں (یہ پڑوس کا علاقہ ہے جو شاہی محلے سے دور نہیں لیکن ٹکسالی گیٹ سے باہر واقع ہے)۔

میں نے انہیں بتایا کہ میری ملاقات کلاسیکی موسیقی کے نامور اساتذہ مرحوم استاد امانت علی خان اور ان کے بھائی استاد فتح علی خان سے ان کے کریم پارک والے گھر میں ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا '' استاد فتح علی خان اپنے شاگردوں سے ملنے اب بھی کبھی کبھی یہاں آتے تو ہوں گے۔''

'' بالکل آتے ہیں!'' عثمان علی نے جواب دیا۔ وہ پٹیالہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس محلے سے باہر رہائش اختیار کر لی ہے۔ ان کا تو پورا خاندان نورٌ علیٰ نور ہے۔ چھوٹا بھائی حامد علی، استاد اسد امانت علی، ان کے صاحبزادے وغیرہ ..... ان لوگوں نے اپنے استادوں کا نام روشن کر دیا ہے۔ کلاسیکی موسیقی میں دونوں کا مقام نہایت بلند ہے۔ اب نئی نسل کی بھی اس فن میں اعلیٰ تربیت ہو رہی ہے۔''

عثمان علی نے مجھے بتایا کہ استاد بڑے غلام علی خان بھی '' سپرداری'' کرتے تھے، یعنی ماضی میں اعلیٰ درجے کی طوائفوں کے ساتھ سنگت کیا کرتے تھے۔ عثمان نے یہ بھی بتایا کہ شاہی محلے میں آج بھی ان کے کئی شاگرد موجود ہیں۔

'' میرے نزدیک تو شاگرد اللہ پاک کی رحمت ہوتے ہیں''۔ عثمان علی نے کہا۔ '' مجھے تو یہاں رہنا پسند ہے جہاں میرے شاگرد بھی ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی موسیقی کی سمجھ ہے۔''

'' کیوں نہیں!'' میں نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا '' میں یہاں ماسٹر عنایت حسین سے بھی ملی ہوں۔ وہ بھی اس محلے میں اپنی رہائش سے مطمئن ہیں۔ وہ ٹبی تھانے کے پاس کوچہ سیٹھیاں

میں رہتے ہیں۔ ان کا بھی کہنا ہے کہ محلے کے پاس رہنے سے کام میں سہولت ہو جاتی ہے۔"

ماسٹر عنایت کا نام سُن کر عثمان علی خوشی سے کِھل اٹھے۔ انہوں نے کہا: "ماسٹر عنایت کی کیا بات ہے!! پوری فلم انڈسٹری میں ان کے مقابلے کا ایک بھی موسیقار نہیں ہے۔ ان کی بنائی ہوئی دھنیں یادگار ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ الفت کی نئی منزل کو چلا...، اے دل کسی کی یاد میں ہوتا ہے بیقرار کیوں...، ان گیتوں کو کون بھول سکتا ہے!"

اشرف علی نے کچھ دوسرے گیت بھی یاد دلائے: "جانِ بہاراں، رشکِ چمن... اور ترکِ الفت کا صلہ پا بھی لیا ہے میں نے...، کیا اعلیٰ موسیقی دی تھی!"

ہم سب نے ان لازوال گیتوں کی یاد میں مخمور ہو کر اثبات میں سر ہلائے۔ اشرف نے ہنس کر کہا: "بھئی کوئی کچھ بھی کہے، مجھے تو اپنے محلے پر فخر ہے۔ موسیقی کے لیے بھی مٹی زرخیز ہے۔ میں نے فلمی دنیا میں تین بہترین گائیکوں کو متعارف کروایا ہے۔ کسی استاد کے لیے اس سے زیادہ فخر کی بات کیا ہو سکتی ہے؟"

جس کمرے میں ہم بیٹھے تھے وہاں دو نوجوان یوں ہی کبھی آ جاتے اور کبھی چلے جاتے۔ میں سمجھ نہ پائی تھی کہ آیا وہ ملازم ہیں یا شاگرد۔ اشرف نے ان میں سے ایک کو آواز دے کر ہارمونیم منگوایا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ صرف لڑکیوں کو موسیقی کی تعلیم دیتے ہیں۔

اشرف نے کہا: "نہیں۔ ایسی کوئی پابندی تو نہیں ہے۔ لیکن ہمارے اڑوس پڑوس کا آپ کو معلوم ہی ہے، لڑکیاں ہی اکثر میری شاگرد ہیں۔ میں خود چونکہ موسیقار ہوں اور گائیکی سکھاتا ہوں، گانے کے لیے زیادہ لڑکیاں ہی آتی ہیں۔ ہاں اگر میں کوئی سازندہ ہوتا تو میرے پاس زیادہ لڑکے آتے۔" پھر اس نے اپنے بھائی سے کہا: "اب آپ بتائیں..."

عثمان نے ہنس کر کہا: "دو لڑکے میرے شاگرد ہیں تو سہی۔ بہت کم عمر ہیں۔ باقی تو لڑکیاں ہی ہیں۔"

وہ نوجوان ہارمونیم لے آیا جو اشرف کے سامنے رکھ دیا گیا۔ اسی لمحے بیٹھک میں دو سازندے داخل ہوئے جن سے میں واقف تھی۔ وہ اشرف کے پاس کسی اسٹوڈیو میں کام حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان میں سے ایک طبلہ، بونگو اور نال بجاتا تھا جبکہ دوسرا تاروں والے تمام ساز خصوصاً ستار بہت اچھا بجاتا تھا۔ بے تکلفانہ سلام دعا کے بعد ان میں سے ایک سازندے نے جس کا نام رُوبا تھا، میری طرف جھک کر پوچھا: "کیا آپ کی ملاقات اُس بالشت برابر گلوکارہ سے ہوئی ہے؟"

میں اشرف کے گیت کے درمیان مخل نہیں ہونا چاہتی تھی اس لیے صرف سَر کے اشارے سے اُسے کہا نہیں۔ روبا نے بلند آواز سے کہا: ''استاد جی! آپ نے ڈاکٹر صاحبہ کو اپنی سب سے چھوٹی شاگرد سے نہیں ملایا؟''

اس دخل اندازی پر اشرف نے کچھ جھنجلا کر کہا ''بعد میں...'' اور سُر کی جستجو میں محو ہو گیا۔ ابتدائی الاپ کے بعد اس نے کہا: ''اس غزل کی دھن میں نے خود بنائی ہے۔'' دھن پسند تو مجھے بھی آئی مگر رُوبا اور اس کا ساتھی اپنی مبالغہ آمیز تعریف کے ڈونگرے اس طرح برسا رہے تھے کہ صاف معلوم ہوتا تھا وہ مذاق کر رہے ہیں۔

غزل کے بعد دونوں بھائیوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کسی اور دن ان کی ایک شاگرد کے گھر مِل سکتی ہوں۔ میں اس بات پر بخوشی راضی ہوگئی۔ یہ کنجر گھرانہ محلے کے پرانے باسیوں میں سے تھا۔ اس گھرانے کی رقاصہ ان کی اصل شاگرد تھی مگر وہ اس کی چھوٹی بہن اندلیہ کی تربیت بھی کر رہے تھے۔ ان دونوں لڑکیوں کے مستقبل سے انہیں بڑی امیدیں تھیں۔

اشرف نے اچانک کہا: ''ارے۔ ہمیں تو فوراً اسٹوڈیو پہنچنا چاہیے۔ وجاہت عطرے ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔ ہم اکٹھے ایک کام کر رہے ہیں۔ پھر ہم میڈم کے گھر جائیں گے۔ ان کی طبیعت ناساز ہے۔''

میڈم سے اُس کی مراد ملکۂ ترنم نور جہاں تھی جو اس وقت حیات تھیں۔ ان کے جانے کے بعد رُوبا اور اس کے ساتھ جاجی نے ہنسنا شروع کر دیا۔ رُوبا نے کہا: ''ڈاکٹر فوزیہ! مجھے بھی اب اجازت دیجیے۔ مجھے جاوید شیخ (مشہور فلمی اداکار) سے ملنا ہے۔ وہ ایک مہینے سے میری منتیں کر رہا تھا کہ میں اُسے ملاقات کا وقت دوں۔ مَیں نے سوچا ہے کہ آج اس کی یہ عزت افزائی کر ہی ڈالوں۔''

جاجی نے ہنستے ہوئے کہا: ''اور میں نے تو جی وزیرِ اعظم کو ملاقات کا وقت دے رکھا تھا مگر آپ کی خاطر وہ کینسل کر رہا ہوں۔''

ہم سب ہنس رہے تھے مگر میں بے چینی بھی محسوس کر رہی تھی کیونکہ اشرف وغیرہ کے دو سنگتی ابھی وہیں موجود تھے۔ میری کیفیت بھانپ کر روبا نے ان میں سے ایک کو بلا کر کہا: ''ڈاکٹر صاحب ہمارے بازار کے واحد کدّو سے ملیے۔''

وہ شخص کچھ جھینپ تو گیا مگر توجہ کا مرکز بن کر خوش بھی ہوا۔ اس کا رنگ بالکل کالا تھا اور وہ موٹا بھی بہت تھا۔

روبا نے کہا: ''یہ ایسا بندہ ہے کہ اس کی تصویر نہیں اتر سکتی۔ تصویر میں یہ نظر ہی نہیں آئے گا۔ آپ تصویر اتار کر دیکھ لیجیے۔''

میں نے بری طرح شرمندہ ہو کر کہا: ''ایسی باتیں مت کرو۔''

مگر روبا باز نہ آیا۔ اُس نے کہا: ''یہ اُسی وقت نظر آ سکتا ہے جب یہ ہنسے۔ رات کے وقت تو ہمیں اپنا یہ یار نظر ہی تب آتا ہے جب ہنستا ہے۔ اس کے دانت نظر آتے ہیں تو ہم کہتے ہیں۔ 'یہ تو اپنا کدّو ہے'...۔''

جاجی نے لقمہ دیا: ''اور وہ بھی تب، جب یہ دانت مانجھ لے!''

وہ دونوں 'کدّو' کا مذاق اڑاتے رہے (نہ جانے بیچارے کا نام کیا تھا)۔ اپنا سامان تھیلے میں رکھتے ہوئے میں نے پوچھا: ''تمہارے خیال میں لیلیٰ کی ''نتھ اتروائی'' کی رقم کتنی ہوگی؟''

روبا نے لاپروائی سے کہا: ''نتھ اتروائی تو کنواریوں کی ہوتی ہے۔ لیلیٰ کی کیوں ہوگی۔''

میں نے کہا: ''مگر وہ تو کہتے ہیں کہ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔''

روبا نے کہا: ''شادی تو نہیں ہوئی مگر یہ جو سال بھر سے کوٹھے پر محفل سجا رہی ہے تو آپ کے خیال میں کیا تماش بین صرف گانا سننے آتے ہیں؟ نہ وہ اتنی سریلی ہے اور نہ آنے والے اتنے پارسا ہیں!''

اس پر روبا اور جاجی دونوں ہنس پڑے۔ جاجی نے روبا کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا: ''پارسا ہوتے تو یہاں آتے؟''

''تم لوگ ان کا ہمیشہ مذاق اڑاتے رہتے ہو'' میں نے کہا ''مگر انہیں سچ مچ کسی کی تلاش ہے۔''

''ہاں جی، وہ تو ہے!'' روبا نے کہا ''گھر والوں کو برادری میں ناک بھی رکھنی ہے۔ اب سب سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی شادی نہیں ہوئی لیکن پیسوں کی ضرورت تھی اس لیے دھندا اس نے یونہی شروع کر دیا۔ انہیں کوئی نہ کوئی مرغا پھنسانا ہی پڑے گا جس کو پتا ہی نہ چلے کہ وہ کنواری ہے یا نہیں۔''

دونوں اس بات پر پھر ہنسے۔ روبا نے کہا: ''میں کچھ کہنے والا کون ہوتا ہوں۔ آج کل تو یہ پھٹکری سے دھو لیتی ہیں اور پھر نئی نکور بن جاتی ہیں۔ وہ تو کسی کو بھی اُلو بنا سکتی ہیں۔''

پھر اس نے رُک کر کہا: ''کیا آپ کو معلوم ہے کہ پمّی کے گھر والے بھی کسی اُلو، میرا مطلب ہے کسی آدمی کی تلاش میں ہیں''

''پمّی کے لیے؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''ارے نہیں۔'' روبا نے فوراً ٹوکا۔

''آپ بھی کیا باتیں کرتی ہیں! پمّی نہیں، اس کی چھوٹی بہن رضیہ کے لیے... یہ بندہ، جوان کا باپ کہلاتا ہے، بڑا بھیڑا (بُرا) ہے۔ خدا جانے پمی کی ماں اس کو لات مار کر نکال کیوں نہیں دیتی!''

''وہ بڑی مضبوط عورت لگتی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
روبا نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کہا: ''مگر وہ شخص مجھے بالکل پسند نہیں۔''
جاجی بھی گفتگو میں شامل ہوگیا۔ اس نے کہا: ''ڈاکٹر فوزیہ! میں بتاتا ہوں کہ وہ روبا کو کیوں بُرا لگتا ہے۔''

رُوبا نے جاجی پر ایک تکیہ دے مارا اور کہا: ''اب یہ آپ کے سامنے بکواس کرے گا۔''
''کیوں رُوبا؟'' میں نے کہا ''تو مجھ سے کچھ چھپایا جارہا ہے!''
جاجی نے فوراً بڑھ کر کہا: ''بات یہ ہے کہ یہ پمی کی چھوٹی بہن پر لٹو ہے۔ اب سمجھیں آپ!''
''کون سی والی بہن پر؟'' میں نے پوچھا۔
''جو سب سے اچھی ہے۔'' رُوبا نے بے ساختہ جواب دیا۔
''میرے پاس تمہارے دل کی آنکھیں تو نہیں ہیں۔'' میں نے کہا ''کونسی والی بہن؟ نمبر دو، یا نمبر تین؟''

جاجی نے کہا: ''تیسری والی رضیہ۔ آجکل اس کا باپ اسی کے لیے پیغام ڈھونڈ رہا ہے۔ میں نے تو اس سے کہا ہے کہ ہم سب چندہ کر کے پیسے جمع کرلیں گے۔ اس نوکری کی درخواست یہ دے ہی ڈالے۔ مستقل گاہک بن کر پہنچ جائے اور وہیں رہنے لگے۔ جب سسرا اتنا اچھا ہو تو اس کو تو کوئی دوسری فکر ہی نہیں ہوگی۔''

''ابے چُپ!'' رُوبا کو اب غصہ آرہا تھا۔
''یا اللہ!'' میں نے حیران ہوکر کہا، ''اسے تو واقعی عشق ہوگیا ہے۔ تو کیا رضیہ کے باپ سے بات کی جاسکتی ہے؟ کوئی امید ہے؟''
رُوبا نے تکیہ ایک طرف پھینک کر اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ اس کے بال بکھر سے گئے۔ اس نے کہا: ''ہرگز نہیں... کبھی نہیں... انہیں میرے دل کی بات معلوم ہو جائے تو وہ مجھے اس کے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیں گے۔ میں میراثی برادری کا ہوں۔ ہم اُن کے ساتھ ایسے رہتے ہیں جیسے تیل اور پانی۔''

جاجی نے بات کاٹی ''خالص کنجر تو وہ لوگ بھی نہیں ہیں۔ اس کی ماں ڈومنی تھی۔''
طوائف کے پیشے میں کنجر ہی ایسی ذات سمجھی جاتی ہے جسے یہ پیشہ اختیار کرنے کا پیدائشی حق ہے۔ پمی کا خاندان خالص نہ رہا تھا مگر ظاہر یہی کرتا تھا کہ وہ اصل نسل کنجر ہیں۔ اگر اس کی ماں کو کوئی ڈومنی کہتا تھا تو وہ بہت برا مناتی تھی۔ ڈوم ذات کے لوگ میلوں ٹھیلوں میں، ایک دوسرے کی

سنگت میں گا بجا کر روزگار حاصل کرتے ہیں۔ یہ اکثر تھاپ سے بجنے والے ساز مثلاً ''گڑوی'' بجاتے ہیں۔ گاؤں کے شادی بیاہ اور میلوں میں ڈوم کٹھ پتلی کا تماشہ کرنے والوں کے ساتھ لوگوں کا دل بہلاتے ہیں۔ اُن کی کچھ عورتیں رفتہ رفتہ طوائف کے پیشے میں داخل ہوگئی ہیں۔

میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ روبا واقعی رضیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے یا محض ایک وقتی دل لگی ہے۔ میں نے پوچھا: ''اچھا! یہ پابندیاں تو اپنی جگہ رہیں، لیکن تم کیا کرنا چاہتے ہو۔''

''بیٹا، اب تو جا!'' روبا نے وہاں منڈلاتے اشرف کے سنگتی کو بھگایا۔ پھر میرے قریب بیٹھ کر کہنے لگا۔ ''میرا بس چلے تو میں رضیہ کو یہاں سے کہیں دور لے جاؤں۔ اس گِدھ خاندان سے کہیں بہت دور... یہ صرف اس کا خون چوسنا چاہتے ہیں۔ وہ بہت اچھی ہے... وہ اس جگہ کے لیے نہیں بنی۔''

جاجی نے کہا: ''ڈاکٹر صاحبہ! یہ ہندوستانی فلمیں بہت دیکھتا ہے۔''

''چُپ کر!'' روبا نے اسے ڈانٹا۔ ''تیرے جیسے دوستوں سے تو بندہ اکیلا ہی بھلا!'' اسے سچ مچ غصہ آ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر جاجی فوراً سنجیدہ ہوگیا۔

میں نے پوچھا: ''مگر ان لوگوں کو تو صرف پیسہ چاہیے۔ اگر پیسے تم دے دو تو کیا یہ پھر بھی تمھیں قبول نہیں کریں گے؟ تم بھی مستقل گاہک بن سکتے ہو۔''

جاجی نے کہا ''اوّل تو وہ مر جائیں گے مگر لڑکی کا میراثی سے رشتہ نہیں کریں گے اور پھر فرض کرو قبول کر بھی لیں تو رضیہ سے دھندا وہ پھر بھی کرائیں گے۔ کیا رُوبا یہ برداشت کرے گا؟ کبھی نہیں۔ رُوبا کے اِس کھیل میں جیتنے کا کوئی امکان نہیں۔''

''اور رضیہ!'' میں نے پوچھا ''کیا وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے؟ یا یہ یک طرفہ معاملہ ہے۔ مجھے وہ لڑکی بڑی خاموش طبیعت کی نظر آتی ہے۔''

جاجی کو ایک اور موقع ملا کہ رُوبا کو ستائے۔ وہ کہنے لگا: ''یقین مانیے! اُس کو تو خبر تک نہیں۔ ویسے اُس کو معلوم ہو بھی جائے تو اِس پھکڑ کے ساتھ کیوں جائے گی۔ وہ تو وہی کرے گی جو اس کی پیاری ماں کہے گی۔''

''تُو کیوں ہر بات میں ٹانگ اڑاتا ہے؟'' رُوبا نے جاجی کو پھٹکارا۔ پھر اُس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''اُسے ضرور معلوم ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ میرے جذبات سمجھتی ہے۔''

''ڈاکٹر صاحبہ!'' جاجی نے کہا ''اِسے کئی بار استاد نے مارا بھی ہے۔ مگر یہ وہی بات کیے جاتا ہے۔ استاد گامن نے کہا ہے کہ پانی اور تیل آپس میں نہیں مل سکتے۔ چلو رُوبا... استاد جی انتظار کر رہے ہوں گے۔ رستے میں تیری سسرال بھی ہوتے چلیں گے۔''

جاجی نے جلدی سے اپنی چپل اٹھائی اور باہر کی طرف دوڑ گیا۔ رُوبا اس کے پیچھے دوڑا۔ وہ اس کی پیٹھ پر مکہ مارنا چاہتا تھا لیکن نشانہ چُوک گیا۔ وہ سر جھکائے، اداس صورت بنائے لوٹ آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ میں ایک بات ضرور معلوم کرنا چاہتی تھی جو میں نے پوچھ لی۔

''کیا ایک دن تم اسے اپنے دل کی بات بتا دو گے؟''

''ہاں، ایک دن!'' رُوبا نے میری طرف دیکھے بغیر کہا ''چلیے، میں آپ کو کار تک چھوڑ دیتا ہوں۔''

''شکریہ'' میں نے کہا ''مگر میں ابھی گھر نہیں جاؤں گی۔ تم میرے ساتھ استاد گامن کی بیٹھک تک چلے چلو۔ وہاں مجھے ان سے ملنا ہے۔''

ہم بازار سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے ہوئے گزرے، مگر مجھے معلوم تھا کہ رُوبا اس لڑکی کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔

تاثرات

ثروت علی

ثروت علی موسیقی اور موسیقی سے متعلق شخصیات کے بارے میں اکثر اخبارات اور رسائل میں لکھتے رہتے ہیں۔ ان کو جنوبی ایشیا کے فنونِ لطیفہ پر لکھنے کا کافی تجربہ ہے۔ ایک دن میں ان کے گھر پہ بیٹھی باتیں کر رہی تھی تو گفتگو کا رخ طوائف کے پیشے کی وجوہات کی طرف مڑ گیا۔ مجھے ان کے تنقیدی خیالات بہت دلچسپ لگے۔

انہوں نے کہا، ''ہماری فلمیں، موسیقی، شاعری اور بصری فنون سب خانم کی ثقافت سے متاثر ہیں۔ خانم اور طوائفیں ہمیشہ مردوں کا خواب رہی ہیں۔ گھر میں ان کی بیوی ہوتی ہے جس کی عصمت پہ شک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس نے نسل آگے بڑھانی ہوتی ہے۔ بازار کی داشتہ دلکشی کا نمونہ اور تخلیقی صلاحیتوں میں برتر سمجھی جاتی ہے۔ وہ مرد کے خوابوں کی تعبیر ہوتی ہے، جو گاتی ہے، ناچتی ہے اور کبھی کبھار اپنے کہے ہوئے شعر بھی سناتی ہے اور مرد حضرات اس سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔''

''مجھے امراؤجان ادا بہت پسند آئی۔''☆ میں نے کہا، ''پاکستانی اور ہندوستانی فلم انڈسٹری نے اس ناول پہ فلمیں بنائیں۔ میں ہنسی کہ پاکستانی فلم میں امراؤجان کا کوئی اور گاہک نہیں تھا سوائے اپنے 'ہیرو' کے اور وہ بھی اس کے ساتھ شادی ہونے کے بعد۔ ہم نے اسے پاکباز رکھنے کے لیے کہانی کا رخ موڑ دیا۔ لیکن ہندوستانی فلم میں امراؤ جان کے اور گاہک بھی دکھائے گئے تھے، یہ الگ بات کہ آخر میں اُسے کوئی ہیرو نہیں اپناتا۔''

ثروت نے کہا، ''یہ بات صرف امراؤجان ادا تک ہی محدود نہیں بلکہ انارکلی، پاکیزہ اور ہر اس فلم کے لیے جس میں کسی طوائف کا حسنِ دلفریب دکھانا ہو کوٹھے کا (جاری)

☆ امراؤ جان ادا لکھنؤ کی ایک طوائف کی کہانی ہے۔ اس کے مصنف مرزا محمد ہادی رسوا (۱۸۵۷ء۔۱۹۳۱ء) تھے۔ پہلی دفعہ یہ ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی۔۔
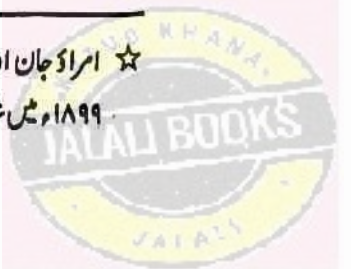
سہارا لیا جاتا ہے۔ اس طرح ہدایتکار کو فلم، رقص اور نغمات سے مزین کرنے کا جواز مل جاتا ہے۔ اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس میں دکھایا جاتا ہے کہ ایک خوبصورت لڑکی کی زندگی کے مشکل حالات اور قسمت اسے اس موڑ پہ لے آئے ہیں کہ وہ طوائف بننے پر مجبور ہو گئی ہے۔ وہ اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس سے پہلے ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکی تھی اور برے حالات اسے اس پیشے کی طرف لے آئے ہیں۔ پھر آخر کار اسکو مشکلات سے نجات دلانے والا ایک ہیرو آتا ہے اور وہ اسے بچا لیتا ہے۔"

میں نے ان کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا، "پاکستانی فلموں میں ہیرو اسے پہلے گاہک کا شکار ہونے سے پہلے ہی بچا لیتا ہے ورنہ کہانی لکھنے والا اس کا معاملہ آگے نہیں بڑھا سکتا۔ اگر وہ ناچنے والی طوائفیت کی راہ پر چل پڑے تو ہیرو سے شادی نہیں کر سکتی اور آخرکار خود کشی کرلیتی ہے یا کسی اور طرح مر جاتی ہے۔ کہانی نویس اور ہدایت کار کسی بھی ہیروئن کو طوائف تصور نہیں کرسکتے کیونکہ یہ بات معاشرے کے اخلاقی ڈھانچے کے مطابق نہیں ہوتی۔"

ثروت نے کہا، "کچھ جرأت مند ہدایتکاروں نے ایسی فلمیں بنائیں ہیں جو حقیقت سے قریب تر ہیں۔ طوائفوں سے متعلق بہت سی فلمیں بنی ہیں۔ مثال کے طور پہ 'منڈی' اور شیام بینیگل کی فلم کیا نام تھا؟"

میں نے یاد کرایا، 'بھومیکا'۔

"ہاں، وہ ایک حقیقت پسندانہ تصور تھا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ کونسی فلموں سے زیادہ پیسہ کمایا جا سکتا ہے۔ لوگ طوائفوں کی عشق بازی کی زندگی پرمبنی فلمیں دیکھنا پسند کرتے ہیں، جن میں ایک ہیرو طوائف کو دلالوں اور نائیکہ کے ہتھکنڈوں سے بچا لیتا ہے۔"

"آپ کے خیال میں ہمارے ان متضاد رویوں کی کیا وجہ ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہمارے مرد ان عورتوں کے حُسن اور اداؤں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ یہ بات انہیں اپنے گھر میں نظر نہیں آتی اور وہ اگر جذباتی طور پر اس کے نزدیک ہو جاتے ہیں تو اس کی اصلاح کر کے اُس کو پاکیزہ عورت بنانا چاہتے ہیں جیسی ان کے خاندانوں میں ہوتی ہیں۔ اگر انہیں واقعی پاکباز عورت ہی چاہیے تو وہ تو پہلے ہی ان کے گھر میں موجود ہوتی ہے، لیکن وہ سمجھ نہیں پاتے کہ کشش کہاں اور کیوں ہے؟ یہ اسرار انہیں سمجھ نہیں آتا لیکن اس کا وجود ہے۔ میرے خیال میں فلموں کی کامیابی اسی اسرار کی مرہونِ منت ہے۔ انہیں دیکھ کر لوگوں کو اپنے خوابوں کی تعبیر مل جاتی ہے۔ وہ خوبصورت رقاصہ سے متاثر ہو کر اس کا دل جیتتے ہیں۔ پھر اس کی اصلاح کرتے ہیں اور اسی خوشگوار خواب کے ساتھ ساتھ وہ اپنی روایات بھی قائم رکھتے ہیں۔ جو لوگ کبھی طوائف کے کوٹھے پر نہیں گئے وہ ان تمام تصورات کو فلم میں دیکھ لیتے ہیں۔"

"یہ فلمیں واقعی دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ کیا ایسا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے کہا، "ہاں، ہمارا سماج منافقت اور تضاد سے بھرپور ہے اور اس کا اعتراف نہیں کرتا۔"

باب ۱۴

رقص و موسیقی کی اکیڈمی

ایک دن میں استاد گامن کی بیٹھک میں تھی کہ چندا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ شاگردہ تو استاد صادق کی تھی مگر مُجرا کرنے استاد گامن کے ساتھ بھی جاتی تھی اور ان کی تعظیم اپنے استاد کی طرح ہی کرتی تھی۔ چندا نے مجھ سے استاد گامن کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتایا کہ وہ آنے والے ہیں۔ یہ سُن کر وہ میرے ساتھ ہی انتظار کرنے بیٹھ گئی۔

آسمانی شیفون کے لباس میں، لمبے لمبے آویزے پہنے ہوئے، چندا بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ کسی اچھے موڈ میں تھی اور خود سے ایک کے بعد دوسرا گانا گنگنا رہی تھی مگر بڑے دھیمے سُروں میں جیسے اپنے آپ کو سنا رہی ہو۔ اس نے دوپٹہ اپنے بازو پر پھیلا کر اسے کنگن سے چھڑایا اور پھر بار بار شانوں پر دوپٹے کو مختلف انداز سے سنوارتے ہوئے، اپنے آپ پر اس طرح نظر دوڑائی گویا جائزہ لے رہی ہو کہ وہ کیسی لگ رہی ہے۔ اس کی پشت پر لہراتی ہوئی لمبی لمبی سیاہ زلفیں پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھیں۔

اپنے نوٹس کی ورق گردانی کرتے کرتے میں نے یونہی کہا کہ میں استاد گامن سے آج اس لیے ملنا چاہتی ہوں کیونکہ وہ ایک ہفتے کے لیے اپنے گھر جانے والے ہیں۔ چندا یہ سُن کر چونک گئی۔ اس نے کہا: ''وہ گھر جا رہے ہیں؟ کیا آپ کبھی اُن کے گھر گئی ہیں؟''

''نہیں'' میں نے جواب دیا اور سوچا کہ اپنے گھر تو وہ مجھے شاید کبھی نہ بلائیں۔

چندا نے ذرا قریب کھسک کر کہا: ''ان لوگوں کے گھر کوئی نہیں جا سکتا، نہ یہ کسی کو وہاں لے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی استاد گامن اپنے دس برس کے لڑکے کو کچھ دن کے لیے ساتھ لے آتے ہیں، اور بس! مگر میں ان کے گھر ایک بار ہو آئی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے چندا کی آواز جوشِ مسرت سے کانپ رہی تھی۔ ''وہ کیسے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

چندا نے بتایا ''ایک بار ہم نے ان کے گھر کے پاس ہی شو کیا تھا۔ واپسی تک سب اتنے تھک گئے تھے کہ چائے پیے بغیر آنا نہیں چاہتے تھے۔ تب استاد گامن سب کو اپنے گھر لے گئے تھے۔ مگر اندر نہیں... ان کے بیٹے نے باہر ہی کرسیاں رکھ دی تھیں۔ بیوی نے سب کے لیے چائے بنا دی تھی۔ مگر میں... میں تو عورت ہوں۔ اس لیے مجھے اندر جانے کا موقع مل گیا۔ میں بھی موقع ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ جھٹ سے اندر جا پہنچی۔ گھر میں اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ اندر بہت سارے بچے تھے... پتا نہیں کتنے تو بچے ہیں ان کے... مگر دو بیٹیوں سے میری ملاقات بھی ہوئی۔ ایک تو کوئی بارہ برس کی ہوگی، اور دوسری میری عمر کی تھی... یا شاید کچھ چھوٹی ہو...''

میں نے مسکرا کر کہا: ''میرا خیال ہے کہ بڑی والی کی ہی شادی ہو رہی ہے۔''

''اچھا! تو اس لیے گھر جا رہے ہیں؟'' چندا نے خوشی سے اُچھل کر کہا، اور پھر بولی: ''وہ تو گانا سیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ ابا جی جب بھائیوں کو سکھاتے ہیں تو چپکے چپکے میں بھی سیکھ لیتی ہوں۔ کہتی تھی کہ اس کی آواز اچھی ہے۔ بچاری کو گانے کی بڑی آرزو تھی مگر اجازت کہاں ملتی!''

''وہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''استاد لوگ بیٹیوں کو نہیں سکھاتے۔ اس لڑکی کو مجھ پر بڑا رشک آ رہا تھا کہ میں گاتی ہوں۔ ظاہر ہے وہ بھی ہمیں ''بری عورتیں'' سمجھتی تھی مگر گانے کا اسے بڑا شوق تھا۔ اس نے مجھ سے گانا بھی سنا۔ ہارمونیم لے آئی تھی اور منتیں کر رہی تھی، بس ذرا سا گا کے سنا دو۔ بچاری کہتی تھی کہ اس کی بڑی آرزو ہے کہ گلوکارہ بنے۔ لیکن اس کو معلوم تھا کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اسے تو خاندان کے شادی بیاہ تک پر گانے کی اجازت نہیں ہے۔''

میں نے چندا کو بتایا کہ مجھے اس بات کا علم ہے کہ رقص و موسیقی کے فن میں معاشرتی امتیاز کئی سطحوں پر موجود رہتا ہے۔ میراثی گھرانوں میں صرف لڑکوں کو موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ با قاعدہ سازندے بھی اپنے خاندانوں کو اپنے فن سے کہیں دور رکھتے ہیں۔ وہ اپنے لیے ایک علیحدہ بیٹھک بنا لیتے ہیں۔''

چندا نے کہا: ''اگر بیٹی کو سکھا بھی دیتے ہیں تو اسے گانے کی اجازت پھر بھی نہیں ہوتی۔ نہ

ہی وہ کسی محفل میں ساز بجا سکتی ہے۔ لڑکیاں تو استادوں پر بھی بوجھ ہی ہوتی ہیں۔ ایک ہی فکر رہتی ہے کہ کسی طرح شادی کر کے چھٹکارا حاصل کرو۔ اگر کوئی لڑکی کافی کچھ سیکھ جاتی ہے تو بھائیوں کو سکھا دیتی ہے، یا اگر اس کی شادی کسی موسیقار سے ہو جائے تو اس کی مدد کر دیتی ہے، لیکن اسے اسٹیج پر اپنا فن پیش کرنے کی اجازت کبھی نہیں ملتی۔"

"ہاں" میں نے کہا "آج تک صرف شام چوراسی گھرانے کے استاد سلامت علی کی واحد مثال سامنے آئی ہے جن کے ایک کنسرٹ میں ان کی بیٹی نے تان پورہ بجایا تھا۔ ورنہ گھرانے کی موسیقی کی روایت کے پاس بھی بیٹی کو نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔ استاد سلامت علی خان کا واسطہ ملک کے اونچے گھرانوں سے اور مغربی شائقین سے پڑتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ذرا روشن خیال ہو گئے۔"

چندا نے چہک کر کہا: "آپ استاد گامن سے پوچھیے کہ وہ بیٹیوں کو موسیقی کی تعلیم کیوں نہیں دیتے۔" "اچھا!" میں راضی ہو گئی، "ہم دونوں پوچھیں گے۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ یہاں سب عورتوں اور لڑکیوں کو صرف گانے کا شوق کیوں ہے؟ تم کوئی ساز بجانا کیوں نہیں چاہتیں؟ مثلاً تم طبلہ یا نال کیوں نہیں بجاتیں۔ جب اکیلے گنگناتی ہو تب تو تمہاری انگلیاں آپ ہی آپ چلتی ہیں۔ جیسے طبلہ بجا رہی ہوں۔ تم صرف ہارمونیم بجاتی ہو۔ وہ بھی کبھی کبھی اپنے گانے کے ساتھ۔"

چندا ساکت بیٹھی میری بات سن رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔ پھر اس نے سنجیدگی سے میری طرف دیکھ کر کہا: "مجھے سچ مچ نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہے؟" پھر اس نے کہا: "یہ بھی استاد جی سے پوچھیں گے۔ مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ لڑکیاں کوئی ساز نہیں بجاتیں۔"

میں نے چندا سے پوچھا کہ وہ اپنی زندگی میں کیا کرنا چاہتی ہے؟

چندا کی آنکھیں کسی خواب سے جگمگانے لگیں۔ اس نے کہا: "میں بہت مشہور فنکارہ بننا چاہتی ہوں۔ اس محلے سے اتنے بڑے بڑے گلوکار نکلے ہیں۔"

"میں بھی یہی مطالعہ کر رہی ہوں کہ اس محلے اور دوسرے شہروں میں اس پیشے سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں کے رہائشی علاقے نے پاکستان میں موسیقی کے فن کی ترقی میں کیا کردار ادا کیا ہے۔ لوک موسیقی اور گائیکی کو چھوڑ کر، باقی کے تمام گلوکار تو ایسے ہی محلوں کے ہیں۔"

"سارے کے سارے یہیں کے ہیں۔" چندا نے اپنا دوپٹہ دوسرے شانے پر ڈالتے ہوئے کہا: "کتنے مشہور ہیں وہ! میں بھی ویسی ہی بننا چاہتی ہوں!"

اس کی آنکھوں میں ایک عزم کی چمک تھی۔ پھر اس نے اضافہ کیا: "اگر یہاں کسی خاندان کی لڑکی مشہور گلوکارہ بن جاتی ہے تو پھر وہ لوگ یہ والا دھندا چھوڑ دیتے ہیں۔ دوسری لڑکیوں کو بھی

صرف موسیقی کی تعلیم دلاتے ہیں۔ اور لڑکیوں کی شادی 'شرفا' میں کرواتے ہیں۔"

"کیا تمہارے خاندان کا بھی یہی ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔ اچانک یہ سوال سن کر چندا جھینپ کر ہنسی جیسے چونک پڑی ہو۔ اس نے کہا: "پتا نہیں! مجھے تو اپنا کام پسند ہے۔ پتا ہے، میں نے کئی اچھے موسیقاروں کی سنگت میں گانا گایا ہے۔ ایک دن مجھے بھی 'چانس' مل جائے گا۔"

میں نے کہا "تمہارے سامنے بڑی شاندار مثالیں ہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ محلہ رقص اور موسیقی کی اکیڈمی ہے جس نے ہمارے ملک کے بہترین موسیقار، اداکار اور رقاص پیدا کیے ہیں۔"

"اور گلوکار بھی!" چندا نے زور سے کہا: "سارے مقبول گانے والے اور گانے والیاں یہیں کی ہیں۔ کیا اعلیٰ مقام ملا ہے ان کو!! میڈم نور جہاں کو ہی دیکھیے۔ نئی گانے والیاں تو ان کے ہی راستے پر چلنا چاہتی ہیں۔"

میں نے چندا کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ میں نے کہا: "اُن کی کیا بات ہے! سارے ہندوستان، پاکستان میں نصف صدی سے ان کی آواز گونج رہی ہے۔ ان کے کمال کی ایک دنیا قائل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ان کا تعلق قصور کی ہیرا منڈی جیسے محلے سے تھا لیکن انہیں کم سنی سے ہی اس پیشے سے علیحدہ کر لیا گیا تھا۔ ہندوستان بھر کے بہترین موسیقاروں نے ان کی تربیت کی۔ ان کی دریافت پر پوری فلم انڈسٹری کو ناز تھا۔ پہلے وہ اداکاری بھی کرتی تھیں لیکن بعد میں صرف گانے لگیں۔"

ہم دیر تک یہی باتیں کرتے رہے کہ شاہی محلے سے کون کون سے مشہور فنکار نکلے ہیں۔ چندا اس موضوع سے بہت خوش نظر آ رہی تھی جیسے خود اس کی ہمت افزائی ہو رہی ہو۔ میں نے کہا کہ اگر وہ شاہی محلے کے مشہور فنکاروں کی فہرست بنانے بیٹھے تو یہ فہرست کتنی لمبی ہوگی؟

چندا نے کہا "وہ تو ختم ہی ہونے میں نہیں آئے گی۔ مگر باجی، حکومت کو تو پھر بھی کوئی خیال نہیں۔ یہی حال رہا تو یہاں سے بھی صرف بیکار، گھٹیا موسیقار ہی نکلیں گے آگے چل کے۔ اَب تو یہاں بھی کوئی کوئی ہی موسیقی کی تعلیم پر توجہ دیتا ہے۔ میرا خاندان ابھی تک خیال کرتا ہے کہ موسیقی کی تعلیم دی جائے۔ میری ماں نے میرے لیے دو استاد رکھے ہیں۔ ماسٹر صادق تو میرے شو وغیرہ کراتے ہیں۔ رقص سیکھنے کے لیے الگ استاد ہے۔ استاد اشرف علی کے پاس بھی جاتی ہوں جو مجھے گائیکی سکھاتے ہیں۔ میں تو یہاں کی دوسری لڑکیوں کو دیکھ کر عبرت پکڑتی ہوں۔ ان کو تو بھیرویں اور بھیروں کا فرق بھی معلوم نہیں۔"

میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا: "یہ بالکل سچ ہے۔ اگر تربیت جاری نہ رہی تو یہ تمام فنون بے موت مر جائیں گے۔ چندا! ہوسکتا ہے کہ حکومت چاہتی ہو کہ یہ محلہ بس ختم ہو جائے،

مگر اس کی جگہ رقص اور موسیقی کی تربیت کے لیے کوئی ادارہ قائم کرنے کا بھی نہیں سوچا گیا ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ خود اس محلے میں بھی کوئی پروا نہیں کرتا۔ لڑکیاں بس ہندوستانی فلمی گانے سن سن کر وہی گاتی رہتی ہیں۔ پاکستان میں 'ثقافت' وغیرہ کے بھی کچھ نام نہاد ٹھیکیدار ہیں۔ ان کو بھی کچھ خیال نہیں کہ ان فنونِ لطیفہ کا مستقبل کیا ہوگا۔ قومی ثقافت کو اس بے دردی سے برباد کرنے کی جگہ کوئی مثبت پالیسی اپنانی چاہیے۔''

اتنی دیر میں ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا اور استاد کی چیزوں سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر واپس بھاگ گیا۔ چندا نے پیچھے سے پکارا: ''استاد گامن کہاں ہیں؟''

''بس ابھی آئے۔'' لڑکے نے دوڑتے ہوئے کہا، ''انہوں نے سگریٹ منگوائے ہیں۔''

اس کے جانے کے بعد چندا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: ''تو اگلے مہینے استاد جی کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا: ''مجھے بھی کوئی تحفہ دینا چاہیے۔''

چندا نے کہا: ''یہاں کوئی اچھا سا جوڑا یا نقدی دینے کا رواج ہے۔ اُن کی شاگردوں کی مائیں یہی دیں گی۔''

''مجھے تو کوئی دوسری چیز دینی چاہیے۔'' میں نے کہا ''نقدی تو وہ مجھ سے یوں بھی قبول نہیں کریں گے۔'' ابھی ہم تحفے پر بحث کر ہی رہے تھے کہ استاد گامن آ پہنچے۔ وہ تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی چائے منگوائی۔ میں نے اور چندا نے چائے سے معذرت کر لی لیکن ان کا ملازم لڑکا ہاتھ میں نوٹ دبائے دوڑ گیا۔

چندا نے استاد گامن سے کچھ ضروری باتیں کیں جس کے لیے وہ آئی تھی۔ اس کے بعد استاد گامن جب آرام سے بیٹھ گئے تو چندا نے بے صبری سے مجھے اشارے کیے کہ اب میں ان سے وہ سارے سوال پوچھوں جن کے بارے میں ہم باتیں کرتے رہے تھے۔ آخر میں نے ان سے موسیقی کی تربیت میں صنفی امتیاز کے بارے میں سوال کر ہی لیا۔ وہ میری بات سُن کر حیرت سے چونک پڑے۔

''صنفی امتیاز؟'' انہوں نے کہا۔ میں نے جلدی سے وضاحت کی ''عورتیں کوئی ساز بجانا کیوں نہیں سیکھتیں؟ میراثی برادری کی عورتیں نہ گاتی ہیں نہ ساز بجاتی ہیں۔ آخر کیوں؟''

استاد گامن کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا: ''گانے والی عورتیں کنجر برادری سے تعلق رکھتی ہیں یا طوائفوں کے خاندان سے ہوتی ہیں۔ ناچنا گانا گاہکوں کے دل کو لبھاتا ہے۔ ساز بجا کر گاہک نہیں پھنسایا جا سکتا۔ اس کے لیے تو کسی گیت کے بول گانے، ہاتھ سے اشارے وغیرہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہاں، ہارمونیم یا تانپورہ گانے کے ساتھ ساتھ بجایا جا سکتا ہے۔ کبھی

کبھی عورتیں ستار بھی بجالیتی ہیں۔ مگر اپنے ہی گانے کے ساتھ بجاتی ہیں۔ کسی دوسرے کے گانے کے ساتھ نہیں بجاتیں۔" جوش میں آ کر وہ سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے: "کنجر برادری صدیوں سے طوائف کے پیشے سے منسلک ہے۔ اس برادری میں مرد کچھ نہیں کرتے۔ وہ کھانے والے ہوتے ہیں اور عورتیں کمانے والی ہوتی ہیں۔ مگر میراثی برادری میں مرد کمانے والے ہوتے ہیں۔ وہ طوائف کی سنگت کرتے ہیں مگر وہ اپنی عورتوں کو کنجروں کی عورتوں سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ دوسری ذات کی عورتیں ہیں۔"

میں نے کہا: "اور پاکستانی معاشرے نے ذات سے منسلک کام کی اس تقسیم کو سوچے سمجھے بغیر قبول کرلیا ہے۔ دوسرے طبقوں میں بھی اگر شوقیہ گانے یا کوئی ساز بجانے والے ہیں تو خواتین صرف گاتی ہیں مگر ساز نہیں بجاتیں۔"

استاد گامن ان باتوں پر سوچ بچار کرنے لگے۔ پھر انہوں نے کہا کہ وہ تھوڑی دیر سونا چاہتے ہیں۔

چندا نے جلدی سے پوچھا: "استاد جی! ہماری سرکار اس محلے کی حالت پر کوئی توجہ کیوں نہیں دیتی؟" "سرکار؟" استاد گامن نے قہقہہ لگایا: "اُن کا بس چلے تو سارے آرٹ نیست و نابود کردیں۔ وہ تو بس کہتے ہیں کہ یہ سب ہندوؤں کا اثر ہے۔ مسلمانوں کو بھلا آرٹ سے کیا واسطہ!! پچاس برس سے یہی کہے جارہے ہیں۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر اضافہ کیا: "ہمیں تو پورا ملک فقط نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ گانا سننے کا سب کو شوق ہے! ناچ بھی دیکھنے کے لیے مرے جاتے ہیں۔ مگر ہم؟ ہم ناپاک ہیں۔ آرٹ شارٹ کی بے کفن لاش اس محلے میں گل سڑ جائے تو ان کی جوتی سے... ہونہہ!"

اتنا کہہ کر وہ منہ سر لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔ چندا اور میں دل گرفتہ ہوکر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باہر نکلتے ہوئے مجھے ایک بات سوجھی۔ میں نے چندا سے کہا:

"استاد جی کی بیٹی کے لیے میں نے ایک بڑا اچھا تحفہ سوچا ہے۔"

"وہ کیا؟" چندا نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ڈھولک!" میں نے کہا۔ "پاکستان کے ہر علاقے کی عورت ڈھولک بجاتی ہے۔ شادی بیاہ میں عورتیں اور لڑکیاں ڈھولک بجا کر گیت گاتی ہیں۔ ہیں نا؟ استاد جی کو شاید اس ساز کا خیال نہیں آیا۔ مجھے بھی ڈھولک بجانے میں بڑا مزا آتا ہے۔" "اور مجھے بھی۔" چندا نے خوشی سے کہا۔

اب سوال پیدا ہوا کہ ڈھولک کہاں سے خریدی جائے۔ تحفہ کسی معمولی لڑکی کو نہیں، موسیقی کے استاد کی بیٹی کو دیا جارہا تھا۔ استاد عام دکانوں سے اپنے ساز کبھی نہیں خریدتے۔ اس بازار میں جگہ

جگہ سازوں کی دکانیں بھی موجود ہیں۔ پہلے ہم نے وہیں جانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہاں جاکر معلوم کر سکیں کہ ڈھولک بنائے کہاں جاتے ہیں۔

سازوں کی دکانوں کا سلسلہ یہاں نوگزا چوک سے لانگا منڈی تک چلا گیا ہے۔ زیادہ دکانیں یہیں ہیں مگر بعض دکانیں ٹبی تھانے کے پاس بھی ہیں۔ راستے کے دونوں طرف دکانوں کے باہر آویزاں ڈھولک اور ڈفلیاں ہر ایک کو نظر آسکتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ تر پیشہ ور سازندے اسی محلے میں رہتے ہیں اس لیے موسیقی کے ساز بھی اس محلے کا ایک اہم جزو ہیں۔ شوقیہ گاہک اور سازندے بھی ساز خریدنے کے لیے اسی طرف کا رخ کرتے ہیں۔ کیونکہ شہر میں سازوں کی دوسری دکانیں نہیں ہیں۔ طبلہ، ڈھولک، نال، ستار، ہارمونیم، ڈفلی، کونگو، گھنگرو اور دوسرے بہت سے ساز یہاں ملتے ہیں۔

لاہور کے اس بازار کا مال دوسرے شہروں میں بھی جاتا ہے۔ اس طرح شاہی محلہ ساز بنانے کا ایک بڑا اہم مرکز بن گیا ہے۔ یہ بازار تال کے سازوں کے لیے مشہور ہے۔ گوجرانوالہ کے ہارمونیم اور سیالکوٹ کے کلارنیٹ، سیکسوفون اور بیگ پائپ برآمد کیے جاتے ہیں (بیگ پائپ برطانوی فوجی بینڈ کی ایک یادگار ہیں)۔ ساز بنانے کے چھوٹے بڑے کارخانے اب شہر کے دوسرے حصوں میں بھی منتقل ہو گئے ہیں مگر بنانے والے خاندان وہی ہیں جو پہلے تھے اور اس محلے سے اور یہاں کے کاروبار سے ان کے مضبوط رابطے ہیں۔

مجھے اور چندا کو یہاں یہ مشورہ دیا گیا کہ پہلے ہم کسی کارخانے میں جاکر ڈھولک کا چوبی خول بنوالیں۔ (اس پر چمڑا دوسرے لوگ منڈھتے ہیں۔) بعض کارخانوں کا نام بھی بتایا گیا۔ ٹکسالی میں بابا فرید کی دکان، مالی پورہ میں اللہ رکھا کی، کاسو پورہ میں ہیرو اور مالک پورہ میں یامین کی دکان کی تعریف کی گئی۔ ان میں بعض کارخانے لاہور سے باہر تھے۔ ہم نے نزدیک ترین کارخانے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ بابا فرید کا تھا اور گلی کے پار ہی تھا۔

بابا فرید ہم سے بڑی شفقت سے ملے۔ وہ اس بات پر کافی محظوظ نظر آرہے تھے کہ دو عورتیں ڈھولک بنوانے کے لیے آئی ہیں۔ انہوں نے بڑی گرمجوشی سے ہمیں اپنا کارخانہ دکھایا۔ ان کا خاندان گزشتہ تیس برس سے ڈھولک کے چوبی خول بنا رہا ہے۔ یہ کام ان کے والد نے سن ساٹھ کے عشرے میں شروع کیا تھا۔ وہ کیرم بورڈ اور چارپائی کے پائے وغیرہ بناتے تھے۔ کئی دوسرے کاریگروں کو بھی ایسے کارخانے کی ضرورت تھی جہاں بڑے آرے، رندے اور خراد کی سہولتیں دستیاب ہوں۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ موسیقی کے ساز بھی بنانے لگے۔ اب بابا فرید کے بیٹے، محمد اقبال یہ کام سنبھال رہے تھے۔

انہوں نے ہمیں لکڑی کے تراشے ہوئے چوکور ٹکڑے دکھائے اور بتایا کہ ان سازوں کو بنانے کے لیے شیشم یا آم کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔ انہوں نے ہم سے لکڑی منتخب کرنے کے لیے کہا اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ ڈھولک کے لیے بہتری لکڑی ''گلی'' ہوتی ہے۔ ایک ڈھولک کا خول بناتے وقت جو اندر کی لکڑی نکلتی ہے اسے گلی کہتے ہیں۔ یہ ذرا گہرے رنگ کی ہوتی ہے اور استاد لوگ اس لکڑی سے ساز بنوانا پسند کرتے ہیں۔ میں نے بھی اسی کا انتخاب کیا۔ آدھ گھنٹے میں بجلی سے چلنے والے رندے نے اسے چھیل کر ڈھولک کا خول تیار کر دیا۔ کاریگروں نے بتایا کہ یہی کام ہاتھ سے کرنے میں آٹھ دن لگتے تھے۔ دوسرے چھوٹے بڑے اوزاروں سے کاریگروں نے خول کی نوک پلک سنوار دی۔

میں اور چندا خوشی سے پھولے نہیں سمار ہے تھے جیسے یہ خول خود ہم نے ہی بنایا ہو!

بابا فرید نے کاریگروں کو ہدایات دیں کہ خول پر رنگ کر دیا جائے۔ انہوں نے رندے پر خول رکھ کر اس پر لاکھ سے دلکش رنگین دھاریاں ڈال دیں اور ڈھولک کا خول مکمل ہوگیا۔ میں اس کارنامے پر اتنی مسرور تھی کہ جھٹ سے اپنے لیے بھی ایک ڈھولک تیار کرنے کی ہدایات دے دیں۔

اب چمڑا منڈھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ ڈھولک کے خول کو ہم نے ایک ماہر چمڑا منڈھنے والے کے سپرد کیا اور دوسرے دن ڈھولک ہمیں تیار مل گئی۔ اس کاریگر نے ہمیں بتایا کہ ڈھولک کی آواز اپنی پسند کے مطابق بدلنے کے لیے ہم اسے تھوڑی سی گرمائش پہنچائیں یا گندھا ہوا آٹا اس کے پڑوں پر لگا دیں۔

اپنی بیٹی کے لیے ہمارے اس تحفے پر استاد گامن حیرت میں پڑ گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ اس پر کیا ردِّعمل ظاہر کریں۔ بہرحال، کچھ دیر بعد انہوں نے ہمارا شکریہ ادا کیا۔

چندا اور میں استاد گامن کے گھر سے لوٹتے ہوئے خوش تھے۔ میں نے چندا سے کہا: ''یہ بحث تو جاری رہے گی کہ آیا کسی عورت کو گانا یا ساز بجانا چاہیے یا نہیں؟ لیکن فی الحال یہ ڈھولک ہی پاکستانی عورتوں کے اندر کے اظہار کی علامت ہے۔ پاکستانی عورتوں کو صرف یہی ایک ساز بجانے کی اور شادی بیاہ پر، اس کی تال پر ناچ گا لینے کی اجازت ہے۔''
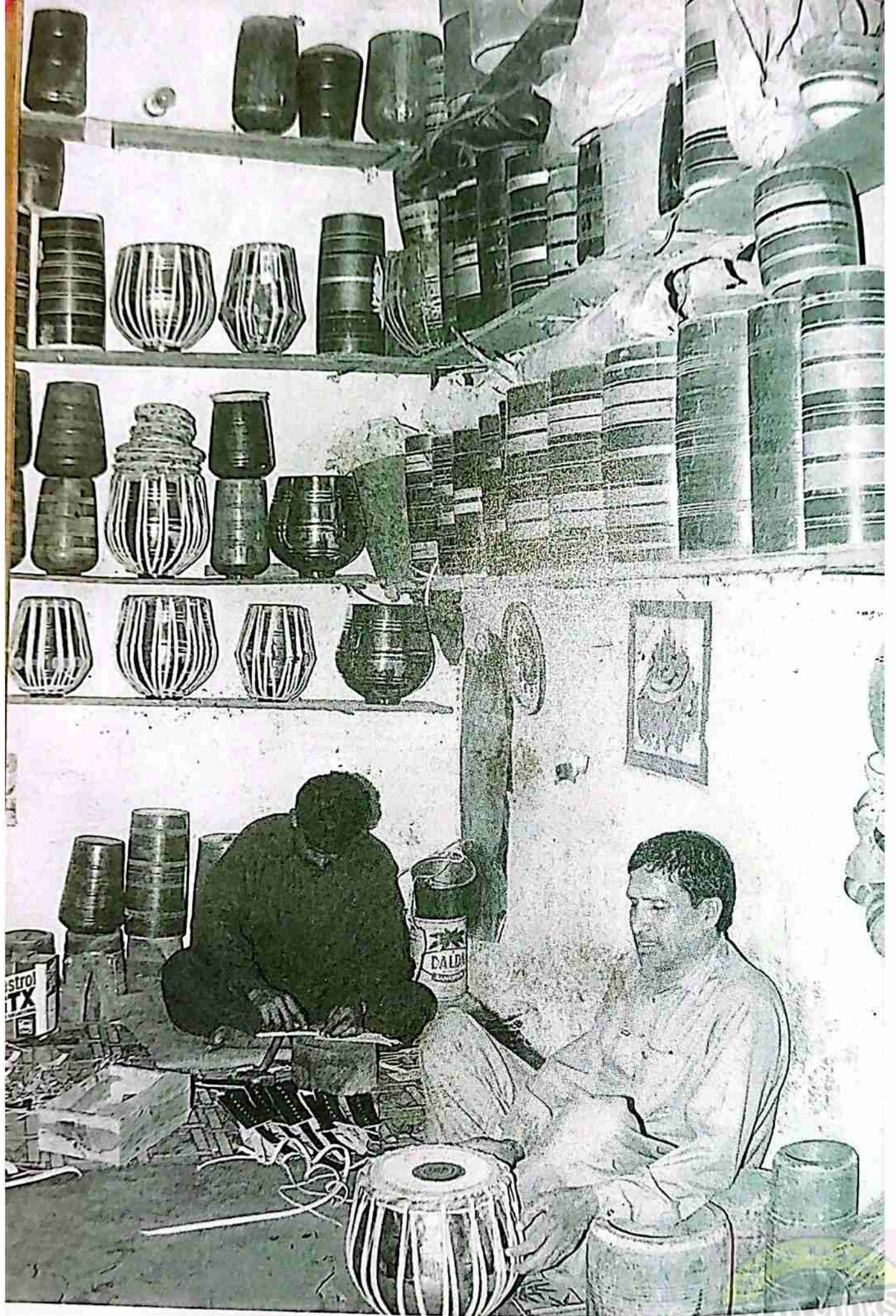
موسیقی کے ساز بنانے والی دکان میں ایک دستکار طبلہ تیار کر رہا ہے۔

سُروں کو موزوں کرنے کے لیے ڈھولک (نال) پر پیچ نصب کیے جا رہے ہیں۔

ہارمونیم میں نصب کرنے سے پہلے اس کی چابیوں (keyboard) کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔
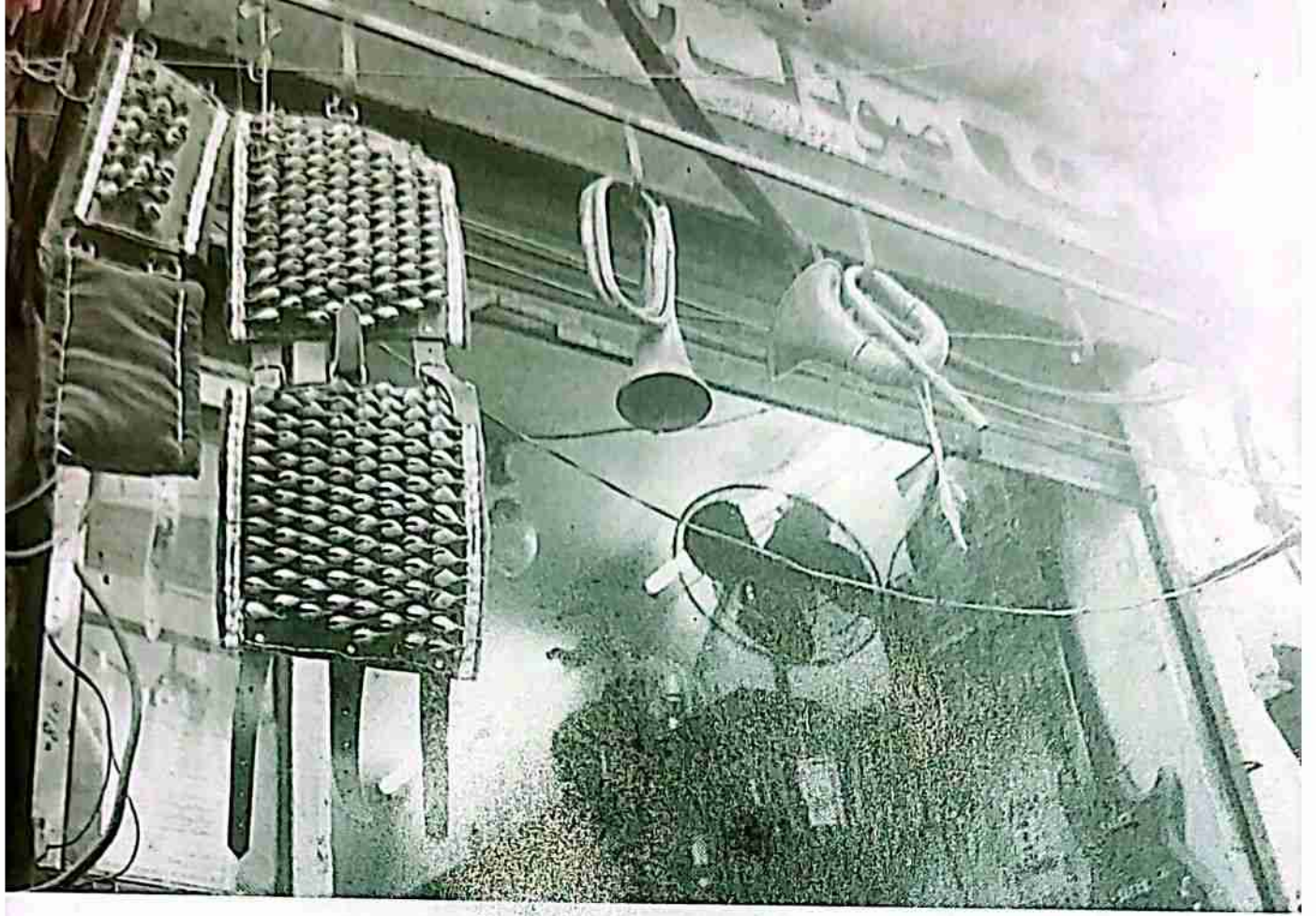
سازوں کی دکان میں گھنگھروؤں کی نمائش

سازوں کے زیادہ تر خریدار محلے کے مقامی سازندے اور فن کار ہی ہوتے ہیں۔

باب ۱۵

فلم اسٹوڈیو میں

گلوکاروں اور موسیقاروں کی طرح، فلمی صنعت کو بہترین اداکار فراہم کرنے کا سہرا بھی شاہی محلے کے ہی سر ہے۔ تقریباً تمام اداکارائیں، بلکہ بعض اداکار بھی اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

فلمی اداکارائیں، فلموں میں کام ملتے ہی اس محلے سے اپنا رشتہ ختم کرنے کی کوشش شروع کر دیتی ہیں۔ اپنے ماضی اور خاندان کے بارے میں وہ کوئی جھوٹی سچی کہانی گھڑ کر سنا دیتی ہیں اور اپنی نائیکہ کو ماں یا خالہ کے روپ مین پیش کرتی ہیں (بعض اوقات یہ سچ بھی ہوتا ہے)۔ مشہور ہونے کے بعد تو وہ اخبارات اور رسالوں میں یہی کہانیاں سناتی ہیں اور محلے سے کسی قسم کے رشتے کا گمان بھی نہیں ہونے دیتیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس محلے سے تعلق رکھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ فلم ایکٹریس بننے سے پہلے یہ یقیناً طوائف رہی ہوں گی۔ ان میں سے کئی لڑکیوں کو تو ہاسٹل میں رکھا جاتا ہے۔ بعض اوقات ان کی ماؤں نے خاندان کے ہر دباؤ کا مقابلہ کر کے اپنی بیٹیوں کو طوائف نہیں بننے دیا ہوتا۔ فلمی اداکاری کسی طوائف کے لیے اس بدنام پیشے سے نکل کر ملک کی قابلِ عزت اور مقبول شخصیت بن جانے کا ایک پُرکشش طریقہ ہے جس کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں۔ کسی حد تک وہ تو اپنے پیشے کو خیر باد کہہ کر معاشرے میں ایک نیا مقام پیدا کر لیتی ہیں مگر دولت اور شہرت کے امکانات باوجود ہمارے ملک کی فلمی صنعت ابھی تک شریف گھرانوں کی خواتین کے لیے ایک

شجرِ ممنوعہ ہی رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ معاشرے کے ذہن میں فلم سے منسلک خواتین کا رشتہ ابھی تک طوائفیت سے جڑا ہوا ہے۔ شاید اس لیے کہ اب تک وہاں ایسی ہی خواتین کی اکثریت رہی ہے۔ چند ہی ایسی اداکارائیں ہیں جن کا تعلق ان گھرانوں سے نہیں رہا مثلاً فلم سٹار شبنم، مسرت نذیر، نیّر سلطانہ، نیلو اور ثمینہ پیرزادہ ایسی اداکارائیں ہیں جن کا پس منظر دوسرا ہے۔ مشہور اداکارہ صبیحہ خانم کا تعلق بھی ایسے خاندان سے ہے جو تھیٹر میں اداکاری کرتا تھا اور اسکا شاہی محلے سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ ساٹھ کے عشرے میں اونچے طبقے کے بعض خاندانوں نے مغربی طرزِ زندگی اپنا لیا اور اس طرح ان کی خواتین کو فلموں میں جانا معیوب نہیں لگا۔ فلم اسٹار حسنہ ایسی ہی خواتین میں سے تھیں۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ آجکل بعض نئی اداکارائیں اس محلے سے اپنے رشتے کو نہیں چھپا رہی ہیں۔ گو انہوں نے لاہور کے دوسرے رہائشی علاقوں میں گھر لے لیے ہیں مگر ان کے ملاقاتیوں کا حلقہ وہی پرانا ہے۔ اسٹوڈیو میں وہ اپنی بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ آتی ہیں اور اپنے رشتے داروں کو وہاں سٹوڈیوز میں ہی چھوٹے موٹے کام سے لگوا دیتی ہیں۔

پاکستانی فلمی صنعت میں مقبولیت کا دارو مدار صرف کسی قبول صورت چہرے اور ایسے کشادہ دل پروڈیوسر پر ہے جو کسی لڑکی کو فلم میں کام کرنے کا موقع دے دے اور اسے مشہور کرنے کے لیے کچھ پیسہ بھی خرچ کر سکے۔ موسیقی اور رقص کے لیے کڑے ریاض کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اب "بڑی اداکارہ" یا "اداکار" وہی ہے جس کی چمک دمک مشہور ہو گئی ہے۔ پہلے علاؤالدین یا طالش جیسے اداکار محنت اور بہت مؤثر اداکاری کے لیے مشہور تھے۔ لیکن آجکل کی نامور اداکارائیں اور اداکار اعلیٰ صلاحیتوں کے باعث مشہور نہیں ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ فلم سٹوڈیوز کا ماحول محلے کے ماحول ہی کی توسیع لگنے لگا ہے جہاں ان اداکاراؤں کو اپنے آپ کو 'مہذب' بنانے کی یا کسی طرح بھی تبدیل کرنے کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ پاکستان میں اداکاری کی تربیت دینے والے ادارے وجود نہیں رکھتے۔ عام خیال ہے کہ ہدایت کار فلم بناتے ہوئے اداکاری بھی سکھا دے گا۔ اس طرح ہدایت کار کو اداکاری کے استاد کا کردار بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔

میں کئی مرتبہ فلم اسٹوڈیو جا چکی تھی، ایک ایسی دنیا کو دیکھنے کے لیے جو شروع دن سے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ہمیشہ باعثِ کشش رہی ہے۔ اگر قسمت ساتھ دے جائے تو ان میں سے چند کو دولت، شہرت اور عزت کی بلندیوں کو سر کرنے کا موقع مل جاتا ہے، جبکہ ان جیسے ہزاروں دوسرے پروانوں کی طرح فرش پر رینگتے رہ جاتے ہیں جن کے پر ایک ایسی شمع نے جلا ڈالے جس کو وہ سمجھ نہیں

سکے تھے۔ پھر تمام عمر وہ اس شمع کا طواف کرتے ہوئے دوسرا موقع ملنے کے منتظر رہتے ہیں۔

مجھے مشہور اداکاراؤں کی زندگی میں دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے تو اسٹوڈیو سے منسلک رنگارنگ فنکاروں اور ہنرمندوں کی زندگی میں کشش محسوس ہوتی تھی جنھوں نے اس پوری دنیا کو آباد کر رکھا تھا۔ وہ معمر اداکارائیں جو فلموں میں ''ماں'' کا کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ سٹنٹ مین، جو ہیرو کی جگہ خطرناک کارنامے سرانجام دیتے ہیں، سیٹ ڈیزائنر، موسیقار، سنگت دینے والے، کورس میں اپنی آواز شامل کرنے والے گلوکار اور وہ نئے امیدوار جو اس دنیا میں پہلا قدم رکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ یہ سب مجھے انتہائی دلچسپ لگتے تھے۔ ان میں وہ ایجنٹ حضرات بھی شامل تھے جنھوں نے برسوں کی محنت سے جوڑ توڑ کرنے اور انسانی مزاج شناسی کے ذریعے کام نکلوانے کے فن میں مہارت حاصل کر لی تھی۔

میں نے لاہور کے مشہور ''شاہ نور اسٹوڈیو'' میں شوٹنگ دیکھنے کا انتظام کیا۔ یہاں ایک احاطے کو پارک کی شکل دی گئی تھی۔ ایک خوبرو اداکارہ سب کی مرکزِ توجہ تھی۔ اس نے سنہرے بالوں کی وِگ اور آنکھوں میں نیلے لینز لگا رکھے تھے۔ ایک جانب فوارہ تھا، اور دوسری جانب درختوں کی قوس بنی ہوئی تھی۔ شوٹنگ دیکھنے کا خیال دلچسپ لگتا ہے، لیکن اصل میں یہ بہت اکتا دینے والا کام ہے۔ کئی گھنٹوں میں ایک یا دو شاٹ ہی لیے جاتے ہیں۔

فلم کا ہدایت کار جو خود اداکار بھی تھا، ایک اونچے اسٹول پر اس طرح متمکن تھا جیسے وہ خدا ہو۔ میں نے ایسے تجربہ کار ہدایت کار بھی دیکھے تھے جن کی سب لوگ تعظیم کرتے تھے مگر یہ تو خود ابھی نوجوان لڑکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ اتنا رعب کس بنیاد پر دکھا رہا ہے۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ یہ تو ابھی اس کی پہلی ہی فلم تھی۔ وہ فلمی دنیا میں با آسانی داخل ہو گیا تھا کیونکہ وہ ایک مشہور اداکارہ اور ہدایت کار کا بیٹا تھا۔ اس دن اس نے سیاہ کپڑے پہنے تھے اور پیشانی پر سرخ پٹی باندھ رکھی تھی اور بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ ساز پر سنگت دینے والے بعض لوگوں سے میں نے اس کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا: ''فوزیہ بی بی! آجکل تو جو ہمیں کام دے، سو اچھا ہی ہے۔ کچھ ہدایت کار ہماری عزت کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم لوگ برسوں سے یہاں کام کر رہے ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ اپنے خاندان والوں کی طرح سلوک کرتے ہیں۔ مگر ان نئے لڑکوں کا خیال ہے کہ بس یہی عرش سے اُترے ہیں۔ باقی لوگ تو بیوقوف ہیں۔''

میری ملاقات ایک ادیب سے ہو گئی جو پروڈیوسر سے ملنے آئے تھے۔ میری ایک دوست نے نہایت پُرتکلف انداز میں ان سے میرا تعارف کرایا۔ میں نے ان سے پوچھا: ''آپ نے جو پاکستانی

فلمیں لکھی ہیں، سب بالکل ایک جیسی کیوں ہیں؟''

انہوں نے قدرے ترش روئی سے جواب دیا ''آپ جیسے لوگوں کے لیے تو تمام پاکستانی فلمیں ایک جیسی ہی ہوتی ہوں گی۔''

میں اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے دوبارہ کہا: ''میرا مقصد فلم انڈسٹری میں نقص نکالنا نہیں لیکن آخر یہ فارمولا فلمیں ہی کیوں؟''

انہوں نے جواب دیا: ''ہر کوئی چاہتا ہے کہ فلم یقینی طور پر کامیاب ہو۔ اگر ایسی فلم کامیاب ہوتی ہے جس میں بیہودہ رقص ہیں، ایک ریپ سین ہے، تھوڑی سی کامیڈی ہے، تھوڑا سا رومانس، کچھ مار دھاڑ کے سین اور شہوت انگیز ناچ گانا، تو پھر ہر شخص ان سارے مصالحوں کی فلم بنانے لگتا ہے۔ کون اپنی رقم ڈبونا چاہے گا؟ اتنے سالوں بعد اب کہیں جا کر فلموں نے کچھ بہتر بزنس کرنا شروع کیا ہے۔ ہم سب بڑے مشکل وقت کا سامنا کرتے رہے ہیں۔ ویڈیو انڈسٹری نے تو ہمارا بیڑا ہی غرق کر دیا تھا۔ یہ نقصان پورا تو ہو ہی نہیں سکتا۔''

میں نے پوچھا: ''کہیں ایسا تو نہیں کہ فارمولا فلمیں ہی پاکستانی فلمی صنعت کے زوال کا باعث بنی ہوں؟''

''نہیں۔'' اس نے سختی سے کہا ''ویڈیو فلموں نے ہمارا ستیاناس کر دیا۔ جب لوگ دھڑا دھڑ اسمگل شدہ بھارتی فلموں کے ویڈیو گھر بیٹھے آرام سے دیکھ سکتے ہوں تو ہماری فلمیں کیوں دیکھنے جائیں گے؟''

میں نے پوچھا کہ اب شاہی محلے سے ''نئے چہرے'' کیسے حاصل کیے جاتے ہیں تو انہوں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا کہ اس سوال کے جواب کے لیے کوئی پروڈیوسر موزوں رہے گا۔

''مگر میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔'' میں نے اصرار کیا۔

انہوں نے بد دلی سے کہنا شروع کیا ''آجکل جو لڑکیاں یہاں آتی ہیں انہیں اپنے حسن اور صلاحیت پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ انہیں پہلے ہی سے سب کچھ آتا ہے۔ کوئی زمانہ تھا کہ جب ہدایت کار یا پروڈیوسر اس محلے سے کوئی لڑکی منتخب کرتا تھا تو وہ اسے فن کے سارے اسرار و رموز سکھاتا تھا۔ ایسی تربیت کرتا تھا کہ لڑکی کی شخصیت نکھر جاتی تھی۔ ذرا پرانی ایکٹریسوں کو دیکھیں، کیسی مہذب اور شائستہ ہوتی تھیں۔ وہ اداکاری کا فن سیکھتی تھیں، بڑوں کی عزت کرتی تھیں، ہدایت کار کی بات سنتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔ ان کی اداکاری کا معیار آج کل کے مقابلے میں سوگنا زیادہ تھا۔ اب تو بس پیسہ ہی سب کچھ ہے۔'' اس نے بات جاری رکھی۔

''پہلے محلے کی حسین ترین اور سب سے زیادہ باصلاحیت لڑکیاں فلم انڈسٹری میں آتی تھیں۔ لیکن اب اس محلے میں ہی کچھ نہیں رہ گیا۔ صرف چھچھورپن ہاتھ لگتا ہے۔ ذومعنی فقرے، گھٹیا ادائیں۔ اور معاف کیجیے گا، پبلک بھی یہی دیکھنا پسند کرتی ہے۔ ثمینہ پیرزادہ جیسی تو لاکھوں میں ایک ہوگی جو اداکاری کو فن سمجھتی ہے۔''

ہم گفتگو کر رہے تھے اور پس منظر میں ایک گیت کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ یہ ایک ہندوستانی فلمی گیت کا ہو بہو چربہ ہے۔ جبکہ ہندوستانی گیت خود ایک امریکی گیت کا چربہ تھا۔

مجھے پنجابی فلموں کے موسیقار ماسٹر عبداللہ کی بات یاد آئی۔ ماسٹر عبداللہ بے مثال تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ کہتے تھے کہ چربہ سازی سے انہیں سخت نفرت ہے اور اس لعنت کے باعث ہمارے باصلاحیت موسیقار بھوکوں مر رہے ہیں۔ ایک ملاقات میں انہوں نے مجھ سے کہا تھا ''جب ہم نئی دھن بناتے ہیں تو وقت بھی لگتا ہے اور ہم معقول معاوضے کی توقع بھی رکھتے ہیں۔ چربے میں کتنا وقت لگتا ہے؟ وہ لوگ پیسے بھی زیادہ نہیں مانگتے۔ فلموں میں ویسے ہی کم رقم لگ رہی ہے۔ ان کو چربہ گانے بنوانا موزوں ترین حل نظر آتا ہے۔ ہماری دھن نئی ہوتی ہے تو گانے والوں کو بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ چربہ گیت گانا آسان ہے۔ اصلی گانے کو تین چار بار سن کر گلوکار چربہ اتار دیتا ہے۔ میں دھن بناتا ہوں تو ریکارڈنگ میں تین تین دن لگ جاتے ہیں۔ چربہ گانا ایک دن میں ریکارڈ ہو جاتا ہے اور سب لوگ پیسے کھرے کر لیتے ہیں۔ مگر سب سے بڑی ستم ظریفی تو یہ ہے کہ سننے والوں کو بھی چربہ بھاتا ہے!''

انہوں نے ایک دوسرے پہلو پر بھی روشنی ڈالی تھی، ''فلموں کی کم لاگت کے باعث معیار بالکل گر گیا ہے۔ ہم موسیقی دیتے تھے تو مختلف سازوں سے کئی ٹکڑے جوڑتے تھے: کہیں ذرا سا ستار چھیڑا تو کہیں شہنائی سے اٹھان لی؛ کہیں وائلن سے بول کہلوایا تو کہیں بانسری سے بہلوا دیا۔ اب پروڈیوسر کا اصرار ہوتا ہے کہ بس دو ساز استعمال کیے جائیں جو 'تال' فراہم کریں اور ہارمونیم پر سب کچھ سیٹ کر لیا جائے۔ پہلے چند سیکنڈ کی موسیقی کے لیے میں پیانو کرائے پر لیتا تھا اور بجانے والے کو رقم دی جاتی تھی۔ ہماری پرانی موسیقی سنیے۔ اس میں جلترنگ، تان پورہ، سُرمنڈل، گٹار، بانسریاں، کیا کچھ نہیں تھا۔ ان سے موسیقی میں رنگ روپ پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اب تو یہ مغربی بَلا، سینتھا سائزر (synthesizer) ہمیں لڑ گیا ہے۔ پروڈیوسر کا جُوتا ہمارے سر پر رہتا ہے کہ یا تو طبلہ، نال اور ہارمونیم استعمال کرو ورنہ اس بجلی کے آلے سے بنی بنائی دھن کی نقل کر لو!۔ اور یہ سارے ذلیل ہدایت کار اور اداکار اس میں خوش ہیں۔ میں کہتا ہوں انہیں شرم نہیں آتی! ایک دن

میرا دل ایسا جلا... ایسا جلا کہ میں نے اپنے سارے انعامات اور تصویریں آگ میں جھونک دیں۔ اب میرے پاس اپنی ایک تصویر بھی نہیں ہے۔ اس ایمانداری کا، رات دن کی محنت کا آخر فائدہ کیا ہے جب میں اپنے بچوں کو دو وقت کی روٹی نہیں دے سکتا۔"

ہمارے ملک کے نامور فلم ساز مشتاق گزدر نے اپنی تصنیف پاکستانی سینما میں لکھا ہے کہ فنونِ لطیفہ پر پاکستان میں ایسا برا وقت پڑا کہ تخلیقی صلاحیت تقریباً نابود ہوگئی۔ مثال دیتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ۱۹۷۷ء میں ضیاء الحق نے مارشل لا نافذ کیا جس کے بعد ماضی کی تمام فلموں کے سنسر سرٹیفکیٹ منسوخ کر دیے گئے اور کسی بھی فلم کی نمائش سے پہلے سنسر بورڈ سے نیا اجازت نامہ لینا لازمی قرار پایا۔ اس سے پہلے تیس برس تک بنائی جانے والی تمام فلموں کو بین کر دینے سے فلم انڈسٹری کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اس سے پیدا ہونے والے خلا کو عجلت میں بنائی ہوئی غیر معیاری فلموں نے پُر کیا اور جھرلو گھما کر سونا بنانے والوں نے فلمی صنعت پر قبضہ کر لیا۔ ضیاء الحق کا فیصلہ فلمی صنعت کے لیے درحقیقت موت کا پروانہ تھا۔

تاثرات

فائزہ کی امی

ایک صبح میں اپنی چچی، یعنی فائزہ کی امی سے ثروت علی کے ساتھ ہونے والی گفتگو کا ذکر کر رہی تھی۔ میں نے مردوں کی اس ریت کا ذکر کیا کہ اُنہیں وہ عورتیں بہت پُرکشش لگتی ہیں جو ناچتی گاتی ہیں اور وہ اُن کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ جیسے ہی وہ اُن سے کوئی رشتہ قائم کر لیتے ہیں تو پھر اُن کے پُرکشش پہلوؤں کی اصلاح شروع کر دیتے ہیں۔ انہوں نے میری بات بڑی خاموشی سے سنی اور پھر کہا، "میں اتنی ذہین نہیں ہوں کہ ان باتوں کا تجزیہ کر سکوں مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ مردوں کی اپنی نیندیں اُڑ جاتی ہیں اگر اُن کے اپنے گھر کی عورتیں ناچنے گانے لگیں۔ میں حیران ہوتی ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟"

میری چچی کسی خیال میں کھو گئیں جیسے وہ اپنے ماضی میں بہت دور نکل گئی ہوں۔ پھر اُنہوں نے مجھے سنانا شروع کیا،

"جب میں کالج میں تھی تو ہر فن میں حصہ لیتی تھی۔ میری آواز بہت سریلی تھی اس لیے کالج کی تقریبات میں گایا کرتی تھی۔ یہ خواتین کا کالج تھا اس لیے میرے والدین نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ایک دفعہ میں نے کالج کے ایک ڈرامے میں حصہ لیا۔ کچھ باہر کے مہمان بھی آئے تھے۔ یہاں میرے ہنر کی پہچان ہوئی۔ ریڈیو پروڈیوسر میری آواز کا آڈیشن لینا چاہتے تھے۔ گھر والوں سے اس کی اجازت لینا بہت بڑا امتحان تھا۔ میری بڑی بہن اورسہیلیوں نے میرے والد کو یقین دلایا کہ کوئی میرا چہرہ نہیں دیکھے گا، صرف میری آواز ہی سنیں گے۔ بہت منت و سماجت کے بعد وہ مان گئے۔ جب میں نے ریڈیو پہ کام شروع (جاری)

کیا تو مجھے بہت شہرت ملی۔ ان دنوں ریڈیو بہت مقبول تھا۔ ٹیلی وژن کی ابھی شروعات نہیں ہوئی تھیں اور لوگ ریڈیو کے ڈرامے شوق سے سنا کرتے تھے۔"

میں نے پوچھا، "آپ کے والد خوش ہوئے؟"

انہوں نے جواب دیا، "وہ ہمیشہ فکرمند رہتے تھے جیسا کہ باپ ہوتے ہیں۔ انہیں ڈر تھا کہ میری شادی کے لیے کوئی اچھا پیغام نہیں آئے گا۔ جن خاندانوں کو بہو کی تلاش ہوتی ہے وہ کسی ایسی عورت کو قبول نہیں کر سکتے جو فنکارہ ہو۔ مردوں کو یہ پسند نہیں ہوتا۔ میں نے فائزہ کو فائن آرٹس میں اس لیے چھوڑا کہ بس اتنی ہی اجازت تھی، اِس سے زیادہ نہیں۔ مجھے اپنی بیٹی کی شادی کی طرف سے فکر ہے۔ ایسے ہی جیسے میرے ماں باپ کو میرے لیے فکر تھی۔"

"جب آپ کی شادی ہو گئی تو کیا ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

انہوں نے ایک آہ بھر کر جواب دیا، "وہی جو بہت سی دوسری فنکار عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ مجھے گانا چھوڑنا پڑا۔ ایک عرصے بعد میں نے اخبار میں ریڈیو کے فنکاروں کے بارے میں ایک مضمون پڑھا۔ مصنف نے میرے بارے میں لکھا تھا کہ 'مشہور ریڈیو سنگر اور آرٹسٹ شبانہ اختر شادی کے بعد کہاں گم ہوگئیں، کسی کو علم نہیں'۔ یہ پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میں لوگوں کو اب بھی یاد ہوں۔ لیکن میں غمگین بھی ہوئی کیونکہ مجھے ریڈیو پہ گانا بہت اچھا لگتا تھا۔ لوگ میری آواز بہت پسند کرتے تھے۔"

مجھے اس بات کا اندازہ تھا کیونکہ ہمارے خاندان میں شادیوں پہ جو عزیز اور رشتے دار خواتین گانے گاتی تھیں ان میں میری چچی کی آواز سب سے نمایاں تھی۔

یہ اُن پاکستانی عورتوں کی ایک مثال ہے جو شادی کے بعد اپنی ہزار خوبیوں کو دبا دیتی ہیں یا اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتیں۔

باب ۱۶

اُلجھے رشتے

لیلیٰ مجھ سے ناراض تھی۔ میں دس دن سے اس کے گھر نہیں گئی تھی۔ اسے شک ہوگیا تھا کہ میں نے محلے میں نئی دوستیاں کر لی ہیں اور اس کو اپنی پوری توجہ نہیں دے رہی۔ وہ مجھ کو صرف اپنی ملکیت سمجھنے لگی تھی اور اب اس احساس کو دھچکا لگا تھا۔ وہ لوگوں سے، خصوصاً اپنے گاہکوں سے میرا تعارف ''میری اسلام آباد والی پکی سہیلی'' کے طور پر کرایا کرتی تھی۔ اس میں اسے بہت مزا آتا تھا۔

لیلیٰ کو یہ یقین دلانا مشکل تھا کہ دوسرے لوگوں سے واقفیت حاصل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ میں اسے بھول گئی ہوں۔ بہر حال اس کی بچگانہ طبیعت نے میرے لیے اس کی ناراضگی دور کرنا آسان کر دیا۔ کار میں آئس کریم کھلانے لے جانے کی پیشکش پر وہ ہمیشہ سب کچھ معاف کر سکتی تھی۔ لیلیٰ کا بچگانہ رویہ سب سے زیادہ ابھر کر سامنے تب آتا تھا جب اس کی کوئی خواہش پوری ہو یا پھر پوری نہ ہو۔ اس بار وہ میری اس پیشکش پر دیوانی ہوئی جا رہی تھی اور اپنی ماں سے اجازت لے کر تیار ہونے کی بجائے پہلے اس معرکے کا رعب اپنے گاہکوں پر ڈالنا چاہتی تھی۔ اس نے ٹیلی فون اٹھایا اور مختلف گاہکوں سے بات کرنے لگی۔ میں دلچسپی کے ساتھ اس کی گفتگو سنتی رہی۔

سب سے پہلے اس نے جاوید نامی کسی شخص کو فون کیا۔ لیلیٰ اسے ''جاوید صاحب'' کہہ رہی تھی۔ شاید وہ کسی بازار سے بول رہا تھا کیونکہ لیلیٰ کی گفتگو میں ایک دو بار آس پاس کی دکانوں کا ذکر آیا۔ وہ ذرا پر تکلف پنجابی میں گفتگو کر رہی تھی۔ کسی ایسی بچی کی آواز میں جو اپنا لاڈ کروانا چاہتی ہو۔

جنوبی ایشیا کی فلمی صنعت میں طوائفوں کی کہانیاں بہت مقبول ہیں۔ فلم اسٹار انجمن ایک طوائف کے کردار میں (اعجاز گل کے تصویری مجموعے سے)۔

فلمی صنعت نے ایک طوائف کے کردار کو ہمیشہ بڑھا چڑھا کر جگمگاتا ہوا پیش کیا ہے۔ کوٹھا نام میرا بدنام میں۔(اعجاز گل کے تصویری مجموعے سے)

طوائفوں کی دردبھری کہانیوں کے ساتھ ساتھ فلم بنانے والے ان کی دل لبھانے والی ادائیں دکھا کر اپنی فلمیں کامیاب بناتے ہیں (اعجاز گل کے تصویری مجموعے سے)۔

فلم اسٹار نیلی (اوپر) اور شبنم (دائیں) رقاصاؤں کے کردار میں، ایک صدی پہلے کی طوائفوں کی اداؤں اور رکھ رکھاؤ کے معیار پہ پورا اترنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ (اعجاز گل کے تصویری مجموعے سے)

ایک طوائف اپنے گاہک کی ہوس زدہ خواہش پر سر نہیں جھکانا چاہتی۔ فلم خوددار کا ایک منظر (اعجاز گل کے تصویری مجموعے سے انتخاب)۔

فلم امراؤ جان ادا میں ہیرو نے ایک ناچنے والی کو طوائف بننے سے پہلے اپنی بیوی بنا لیا۔ یہ تصور ہماری فلموں میں بار بار پیش کیا جاتا ہے۔

اب پچیس روپے میں لوگ سینما کی اسکرین پر مجرے دیکھتے ہیں۔

رسمی سلام دعا کے بعد اس نے اپنے منصوبے کی تفصیلی داستان چھیڑ دی۔ ''وہ میری دوست ہے نا، وہی میری پکی سہیلی، جو صرف مجھ سے ملنے لاہور آتی ہے... اس کی اپنی گاڑی ہے جی! ٹیوٹا کرولا... قیامت کار ہے۔ ڈیک شیک سب لگا ہوا ہے۔ آج اس میں مجھے مال لے جا رہی ہے... آئس کریم کھلانے...'' ٹیلی فون کا تار کافی لمبا تھا۔ لیلیٰ فون ہاتھ میں پکڑے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ پہلے وہ صوفے پر دراز ہوگئی۔ پھر اٹھی اور ایک کرسی پر جا بیٹھی اور آخر میں فرش پر لیٹ کر باتیں کرنے لگی۔ بالکل یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ٹیلی فون پر یہ گفتگو کسی فلم کا سین ہو اور لیلیٰ کو علم ہو کہ یہ سب کرتے ہوئے اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ ''میری دوست اصلی دوست ہے۔'' لیلیٰ کہہ رہی تھی۔ ''تمہاری طرح نہیں ہے۔ تم مجھے کہاں لے جاتے ہو؟ تم تو دوستی کے نام پر کلنک کا ٹیکا ہو!'' وہ ہنسی، ''... کیا؟ اجازت نہیں ملتی؟ ارے دل گردہ ہوتا تو لے لیتے امّی سے اجازت۔ سچ... مجھے باہر جا کر بڑا مزا آتا ہے؟''

لیلیٰ کے ہونٹوں پر عجیب مسکراہٹ پھیل گئی۔ شاید وہ سمجھتی ہو کہ وہ مردوں کو لبھانے والے انداز میں مسکرا رہی ہے۔ افسوسناک حقیقت یہ تھی کہ وہ کسی ایسے بچے کی طرح لگ رہی تھی جسے کیمرے کے سامنے مسکرانے پر مجبور کیا گیا ہو۔ ایک لمبے وقفے تک کچھ سننے کے بعد لیلیٰ نے فون پر کہا: ''کون سا دوست؟ مجھے یاد نہیں، میں تو سارے وقت تمہیں دیکھ رہی تھی۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں چلا کہ کمرے میں دوسرا بھی کوئی ہے! تمہاری ہی تو تصویر ہے میرے دل میں!'' اس نے اپنی طرف سے بہت رومانی آواز میں کہا اور شرارت سے ہنسی۔ ''اچھا! اگر میں تمہارے ساتھ باہر جاؤں تو مجھے کیا لے کر دو گے؟ جو بھی کہوں لے دو گے؟ پکی بات ہے نا؟ پھر نہ مکر جانا۔''

اس نے فون رکھ دیا اور مجھ سے کہا: ''اماں کہتی ہے ان حرامیوں سے فون پر زیادہ باتیں کروں، انہیں اچھی طرح پٹاؤں۔ اب جس کو فون کروں گی وہ بڑا مزیدار ہے۔ ذرا سنو!''

لیلیٰ کا اپنے ماحول سے گلہ شکوہ اپنی جگہ لیکن اس روز میں اپنی آنکھوں سے اس نوعمر لڑکی کو ایک طوائف کی جون بدلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ اپنی ماں اور بھائی کے دباؤ سے اتنی ناخوش نہ تھی۔ وہ گاہکوں کو پھنسانے کے ہتھکنڈے آزما رہی تھی۔ لیلیٰ ہار مان چکی تھی۔ کسی حد تک اسے اس کام میں لطف بھی آنے لگا تھا۔ اس نے اشتیاق سے دوسرا نمبر ملایا اور وہی آئس کریم کھانے کی کہانی دہرائی۔ پھر اس نے کہا: ''دن بھر دکان پر کیا کرتے رہتے ہو؟'' اس نے اشارہ کیا تو میں نے قریب جا کر کان فون سے لگا کر سنا۔ دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز آئی۔

''دکان میں چیزیں بیچتا ہوں۔ اور کیا کروں گا!''

''دن بھر؟'' لیلیٰ نے بچگانہ آواز بنا کر پوچھا۔ ''ہاں!'' اس نے کہا ''میرا کام ہی یہ ہے۔''

لیلیٰ نے نہایت موہنی آواز میں سوال کیا: ''اچھا، تو میرے بارے میں کب سوچتے ہو؟''
دوسری طرف مرد یہ جملہ سن کر نثار ہی تو ہوگیا۔ وارفتہ ہوکر بولا: ''مر جاؤں آپ کی اداؤں پہ... ہر سانس کے ساتھ تمہارا ہی خیال آتا ہے!''
اب لیلیٰ نے اپنی اصلی آواز میں چیخ کر دھمکایا: ''میرے بارے میں اتنا سوچتے ہو، اسی لیے مجھے اتنی بار فون کرتے ہو؟'' اس پر وہ معافیاں مانگنے لگا۔ لیلیٰ اس کا احساسِ جرم بڑھائے جارہی تھی۔ اور وہ مزید معافیاں مانگے جارہا تھا۔ لیلیٰ نے کہا: ''ٹھیک ہے! اب میں تم سے ایک نیا جوڑا لوں گی۔'' وہ اس پر فوراً رضامند ہوگیا۔ لیلیٰ نے اضافہ کیا: ''اور میری چھوٹی بہن کے لیے چوڑیاں بھی...'' وہ اس پر بھی راضی ہوگیا۔ لیلیٰ نے کہا: ''کب؟ کل... میں خود پسند کروں گی۔ تم مجھے بازار لے چلنا۔ میں خود جوڑا خریدوں گی۔''
اچانک مجھے احساس ہوا کہ لیلیٰ کا ''طریقۂ واردات'' یہی ہے۔ وہ میرے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کرتی ہے۔ پہلے اس نے مجھ میں احساسِ جرم پیدا کیا کہ اب میں اسے اہمیت نہیں دیتی اور پھر مجھ سے آئس کریم کھلانے کا وعدہ کروالیا۔
لیلیٰ کی ماں نے کمرے میں آکر کہا ''ارے! مجھے پتا ہی نہ چلا کہ تم یہاں بیٹھی ہو۔ کیسی ہو؟ تمہیں کسی نے ٹھنڈا بھی پلایا کہ نہیں؟'' میں اٹھ کر اس سے بغلگیر ہوئی اور کہا ''میں یہاں مہمان تھوڑی ہوں!'' ہم دونوں ایک دوسرے کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ میں نے اس کی خیریت دریافت کی اور پھر سوچا کہ آئس کریم کے لیے لیلیٰ کو باہر لے جانے کی بات میں خود ہی چھیڑوں۔ ''لیلیٰ چاہتی ہے کہ میں اسے آئس کریم کھلانے لے جاؤں۔ اجازت ہے؟''
قیصرہ بولی ''تم تو اس کی باجی جیسی ہو۔ مجھے کیا اعتراض ہوگا؟''
یہ سن کر میں کچھ حیران ہوئی۔ اس خاندان سے میرے تعلقات پہلی ملاقات کی نسبت ہزار گنا بہتر ہوچکے تھے پھر بھی یہ رویہ بالکل انوکھا تھا۔ قیصرہ کی آواز سے جھلک رہا تھا کہ وہ اب لیلیٰ پر اعتماد کرنے لگی ہے۔ چلتے وقت قیصرہ نے فرمائش کی کہ ہم لیلیٰ کی چھوٹی بہن کو بھی ساتھ لے لیں۔ لیلیٰ نے انوکھے اعتماد سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''نہیں امی! اس وقت نہیں...''
یہ کہتے ہوئے اس نے ماں کی طرف دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ بے پروائی سے اپنا فیصلہ سنا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اس نو یافتہ خود اعتمادی کو پوری طرح سمجھ تو نہ پائی تھی مگر اندازہ لگاسکتی تھی کہ ماں بیٹی کے تعلقات اب بہت بہتر ہوچکے ہیں۔ وہ زمانہ جب طوائف اس چنگل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارتی ہے، اب ختم ہورہا تھا۔

لیلیٰ گھر کے اندرونی حصے میں گئی تو قیصرہ نے مجھ سے کہا: ”فوزیہ! واپس آؤ تو باہر سے ہی چلی نہ جانا۔ میرے پاس اوپر آنا۔ لیلیٰ کا بھائی شاہد آیا ہوا ہے۔ میری بڑی خواہش ہے کہ تم اس سے ضرور ملو۔“

میں نے اپنا اشتیاق چھپاتے ہوئے کہا: ”ضرور آؤں گی! وہ تو بڑے دن بعد آئے ہیں۔ وہ کسی کپڑے کی فیکٹری میں کام کرتے ہیں ناں؟“

”لیلیٰ تمہارا بڑا ذکر کرتی رہتی ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔“

میں تجسس سے بیتاب ہوئی جا رہی تھی۔ میں شاہد کی بیوی جمیلہ سے مل چکی تھی لیکن میں نے اُسے کبھی باتیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ گھر کے اندرونی حصوں میں کھانے پکانے اور دوسرے کام کاج میں مصروف نظر آتی تھی۔

لیلیٰ اور میں کار میں چل دیے۔ لیلیٰ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب میں پہلی بار اسے باہر لے گئی تھی۔ تب بھی وہ اتنی ہی خوش تھی۔ اِس دفعہ تو ہمارے ساتھ کوئی تیسرا بھی نہیں تھا۔ لیلیٰ بہت کھل کر بات چیت کر رہی تھی۔ اس نے کہا: ”پہلے میری دوست ثریا کے گھر چلو۔“

میں نے فوراً انکار کیا۔ ”نہیں لیلیٰ!“ میں نے کہا: ”ہم تمہاری امی سے صرف مال تک جانے کی اجازت لے کر آئے ہیں۔ میں ان کا بھروسا توڑنا نہیں چاہتی۔“

لیلیٰ نے کہا: ”اوہو فوزیہ... یہ ہمارے پیشے کی نہیں ہے۔ اسے تو خبر بھی نہیں کہ میں اس محلے میں رہتی ہوں۔ یہ تو میری کالج کی دوست ہے۔ اسے میرے بارے میں کچھ خبر نہیں۔“

میں نے تذبذب کے عالم میں کہا: ”تو تم نے اپنی امی کو بتا کیوں نہ دیا کہ تم ایک دوست سے بھی ملو گی۔“ لیلیٰ نے چمک کر کہا: ”پاگل ہوگئی ہو کیا؟ یہ لوگ تو نہیں چاہتے کہ میری کوئی بھی دوست ہو۔ کالج چھوڑنے کے بعد میں ثریا سے بس ایک بار ملی ہوں۔ وہ بیمار پڑ گئی تھی۔ اس وقت میں اس کی ماں سے بھی ملی تھی۔ وہ بہت اچھی ہیں۔ ان سے میں بس تمہارے ساتھ ہی مل سکتی ہوں۔ پلیز... مجھے لے چلو!“ وہ التجا کرنے لگی۔

”اچھا...!“ میں نے اس کی بات مان لی۔ ”مگر زیادہ دیر نہیں رکنا۔“

لیلیٰ کی دوست کا گھر ٹکسالی سے زیادہ دور نہیں تھا بلکہ مال کے راستے میں ہی پڑتا تھا۔ گاڑی میں نے ایک تنگ گلی میں کھڑی کی۔ جہاں یہ گلی ختم ہوتی تھی وہاں بارش نے ایک گندا جوہڑ سا بنا دیا تھا جہاں اپنے سینگوں پر سوار کوؤں سے بے پروا درجنوں بھینسیں نہا رہی تھیں۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر دروازے پر پہنچے اور دستک دی۔ ثریا کی ماں نے دروازہ کھولا۔ اس کی عمر پچاس برس ہوگی اور وہ معمولی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی۔ لیلیٰ کو پہچان کر اس نے ہمیں اندر بلا لیا۔ بیٹھک میں داخل

ہوئے تو ثریا آ پہنچی۔ لیلیٰ کو دیکھ کر اس نے خوشی سے چیخ ماری۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوگئی تھی۔

ہم وہاں صرف آدھ گھنٹے ٹھہرے، جو بہت کم وقت تھا۔ پاکستان میں تسلی بخش گفتگو کم از کم دو گھنٹے میں ہوتی ہے لیکن میری وجہ سے لیلیٰ جلد فارغ ہوگئی۔ اسے احساس تھا کہ یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی ہے۔ اس لیے اس نے بات چیت جلد ختم کر لی۔ ویسے یہ اس کے لیے کارآمد بھی تھا کیونکہ وہ ثریا کو درحقیقت اپنے دل کی کوئی بات نہیں بتا سکتی تھی۔ اپنی اس ''دوست'' سے لیلیٰ صرف ایک سطحی گفتگو کر سکتی تھی مثلاً یہ کہ اس کے بھائی کا کاروبار ٹھیک چل رہا ہے، مجھ جیسے اس کے کئی دوست دوسرے شہروں میں ہیں، اور یہ کہ چھٹیوں میں وہ مجھ سے ملنے اسلام آباد جانے کا ارادہ کر رہی ہے۔ متوسط طبقے کے لوگ جس قسم کی باتیں کرتے ہیں لیلیٰ پوری کوشش کر کے ان کی ہی نقل کر رہی تھی۔ اس نے نئی ہندوستانی فلموں پر بھی تبادلہ خیال کیا۔

جلد ہی گفتگو ختم کر کے ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ گاڑی میں، میں نے اس سے پوچھا:

''جب تم اسے اپنی اصلی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتیں تو پھر یہ کیسی دوستی ہوئی؟''

اس نے کہا: ''میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ ورنہ وہ پھر مجھے نہیں ملے گی۔ میں اس کے ساتھ گہری دوستی بھی نہیں کر سکتی ورنہ وہ میرے گھر آنا چاہے گی۔ پھر میں کیا کروں گی؟ اور امی کو پتا چل گیا کہ میرا ایسی لڑکیوں سے اب بھی رشتہ ہے تو وہ تو مجھے مار ہی ڈالیں گی۔''

میں نے کار کو دوبارہ بڑی والی سڑک پر ڈالتے ہوئے کہا: ''سال بھر میں تم اس سے صرف ایک بار ملی ہو۔ یہ بھی کوئی رشتہ ہوا؟'' لیلیٰ نے کہا: ''شاید تم اسے رشتہ نہ سمجھو، مگر میرے لیے تو یہ بہت اہم ہے۔ مجھے تو تسلی ہے نا کہ باہر کی دنیا میں میری کوئی سہیلی بھی ہے۔ جیسے تم ہو فوزیہ! مجھے یہ سوچ کر ہی اتنی خوشی ہوتی ہے کہ میری ایک دوست اسلام آباد میں رہتی ہے۔ یاد ہے جب ہم پہلی بار ملے تھے تو میں نے تم سے کہا تھا اسلام آباد میں میرے لیے بھی کوئی نوکری ڈھونڈ لینا۔''

''ہاں!'' میں نے ہنس کر کہا ''مگر تم اس سلسلے میں کبھی سنجیدہ تو ہوئیں نہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' لیلیٰ نے کہا ''مگر پھر بھی مجھے اچھا لگتا تھا۔ میں تم سے کہہ تو سکی۔ مجھے اچھا لگتا ہے کہ میرے اپنے بھی کوئی دوست ہوں۔ مگر میری ماں اور بھائی بس یہ بات تو برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ باہر میری اپنی کوئی جان پہچان ہوگی تو وہ مجھے قابو میں نہیں رکھ سکیں گے۔''

میں نے اسے چھیڑا ''آج کل تو اچھی جا رہی ہو!''

لیلیٰ نے اس پر کہا: ''میرا بھائی گھر آیا ہوا ہے۔ اس نے مجھ سے بیٹھ کر لمبی بات چیت کی ہے۔

''تو کیا اب تم نے اسلام آباد یا کہیں اور ملازمت کرنے کا خیال دل سے نکال دیا ہے؟ کیا

یہ بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ اوہ... میں نے اس پر بہت سوچا ہے۔ اب تم تو جانتی ہو مجھ سے زیادہ سخت محنت تو ہوتی نہیں ہے۔ میں تو دوپہر تک لمبی تان کے سوتی ہوں۔ مجھے فلمیں دیکھنے کا بھی بڑا شوق ہے۔ مجھے تو ایسی نوکری چاہیے کہ کام کچھ نہ کرنا پڑے اور پیسے خوب ملیں۔ یہ نو بجے سے پانچ بجے کی پابندی میں کیسے چل سکتی ہوں میں! امی بھی یہی کہتی ہیں کہ دفتر شفتر کا کام میرے بس کا نہیں۔ اور پھر میرے بھائی نے بتایا ہے کہ دفتروں میں تو عورتوں کی اور بھی بُری گت بنتی ہے۔ بڑے افسر انہیں چھوڑتے تھوڑا ہی ہیں! سمجھ گئی نا؟''

میں مال کے ٹریفک میں مشکل سے گاڑی چلا رہی تھی۔ پچھلے دو دن بارش کی وجہ سے ٹریفک کا برا حال تھا۔ اس کی بات کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ میں چاہتی تھی وہ کچھ اور بھی کہے۔ اور یہی ہوا۔ لیلیٰ کہنے لگی: ''میرے بھائی نے بتایا کہ دفتروں میں ملازمت ایسے ہی نہیں مل جاتی۔ عورتوں کو وہی کرنا پڑتا ہے جو افسر چاہتے ہیں۔ اور ہر بار۔ تنخواہ بڑھانے کے لیے... ترقی کے لیے... یہی کرنا پڑتا ہے۔ اس سے تو ہم اچھے کہ اپنے گاہک خود چن تو سکتے ہیں۔'' پھر اس نے کہا: ''ویسے تو اتنے سویرے میری آنکھ ہی نہیں کُھل سکتی۔ مجھے لاڈ پیار میں بگاڑ دیا گیا ہے۔''

''او ہو!'' میں نے کہا ''تم نے تو بھائی اور امّی سے ہر موضوع پر گفتگو کر لی ہے۔ انہوں نے تمہیں قائل بھی کر لیا ہے۔ مگر لیلیٰ... '' میں نے زور دے کر کہا ''اتنا میں بھی بتا دوں کہ تم اپنی زندگی کے ساتھ جو چاہو کرو، لیکن تمہارے بھائی نے جو بات کہی ہے وہ دفتروں میں کام کرنے والی ساری عورتوں کے لیے درست نہیں ہے۔ بے شک عورتیں یہ سب بھی کر سکتی ہیں۔ شاید کچھ عورتیں ایسا کرتی بھی ہوں، اور کچھ مرد یہ کوشش بھی کرتے ہیں لیکن دنیا کافی بدل گئی ہے۔ دفتروں میں مرد اور عورتیں اپنی قابلیت اور تعلیم کے بل بوتے پر کام کرتے ہیں۔ آج ان گنت اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں اپنی محنت اور لگن کی وجہ سے ہر شعبے میں کامیاب ہو رہی ہیں۔''

میری لمبی تقریر پر وہ کچھ حیران ہو گئی۔ پھر اس نے کہا: ''ویسے میرا بھی پکا ارادہ نہیں تھا۔ بس یوں ہی خیال آیا تھا کہ کہیں نوکری کر لوں۔ جب میں ان لوگوں کے دباؤ سے تنگ آ جاتی ہوں تو دل چاہتا ہے کہ کہیں بھاگ جاؤں۔'' ٹریفک میں پھنسے، تھوڑی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ پھر لیلیٰ نے کہا: ''تم نے ابھی کہا تھا نا کہ جب ایک دوسرے کو اصلی بات ہی نہ بتائی جا سکے تو پھر دوستی کیسی...''

''ہاں!'' میں نے کہا اور سوچا کہ یہ اب کیا کہنے والی ہے۔

''میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔'' لیلیٰ نے کہا۔ یہ کہتے ہوئے اس کی شوخی کہیں

کھو گئی تھی۔ وہ گلوگیر آواز میں بول رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے، کہہ ڈالے۔

''اصل میں...'' اس نے کہا ''جسے میں بھائی کہتی ہوں، وہ اصل میں میرا باپ ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں چکرا گئی۔

''جسے تم میری ماں سمجھتی ہو...'' لیلیٰ نے کہا ''وہ دراصل میری دادی ہے۔ وہ اس لیے خود کو میری ماں ظاہر کرتی ہے کیونکہ سارا کام وہ ہی سنبھالتی ہے۔ یہ بھتیجے بھتیجیاں جو گھر میں نظر آتے ہیں، یہ میرے بہن بھائی ہیں۔ میری دادی بھی اصل میں دادی نہیں ہے۔ اس کی بڑی بہن کو کہا جا سکتا ہے کہ میری دادی ہیں۔ مگر ہیں وہ بھی نہیں...''

''لیلیٰ! میری سمجھ میں اب کچھ بھی نہیں آ رہا...!'' میں نے کہا۔ ''ذرا ٹھیک سے بتاؤ۔ کون کیا ہے؟''

لیلیٰ نے کہا ''بس یہ سمجھو کہ جسے میں ماں کہتی ہوں۔ اسے ایک طرح میری دادی کہا جا سکتا ہے۔ بس اتنا کافی ہے۔''

''بالکل نہیں!'' میں نے کہا ''جب بتانے ہی لگی ہو تو پوری بات بتاؤ۔''

اتنی دیر میں سڑک کا ٹریفک دوبارہ چل پڑا اور میں بھی اس بھیڑ میں اپنا راستہ بنانے لگی۔ میں نے اسے کہا کہ ہم اتر کر کہیں بیٹھ جائیں، تب بات کریں گے۔ ایک آئس کریم کی دکان پر پہنچ کر میں نے گاڑی کھڑی کی اور ہارن بجا کر آئس کریم گاڑی ہی میں منگوا لی۔ دکان میں کام کرنے والا ایک بچہ منٹوں میں ہمارے لیے آئس کریم لے آیا۔ میں نے اپنا پیالہ تھام کر لیلیٰ سے کہا: ''اب بتاؤ۔''

لیلیٰ آئس کریم کھانے میں مگن تھی۔ اب اس نے نسبتاً پُرسکون آواز میں مجھے اپنی کہانی سنانی شروع کی۔ ''بات یہ ہے کہ دونوں بہنوں کی کوئی اولاد نہیں تھی۔''

''یعنی...'' میں نے بے چینی سے کہا ''تم اپنی ماں... یعنی قیصرہ اور اس کی لندن والی بہن کے بارے میں کہہ رہی ہونا!''

''ہاں!'' لیلیٰ نے کہا ''قیصرہ اور شمسہ... بچہ کوئی نہیں تھا اس لیے گھر والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی گود لے لیں۔ دور دراز کے ننھیالی غریب رشتہ داروں سے یہ بچے بڑی بہن کے لیے گود لیے گئے لیکن پرورش چھوٹی بہن نے کی۔ خصوصاً شروع میں...''

''جو بیٹی گود لی تھی، اس کا نام 'کرن' تھا۔ اسے گانا سکھایا گیا اور وہ اچھی گلوکارہ بن گئی۔ اور بیٹے شاہد کی نوجوانی میں ہی شادی کر دی گئی تا کہ وہ اور اس کی بیوی جمیلہ بچے پیدا کریں۔ خاندان

چلانے کے لیے کچھ اور بھی بچے چاہئیں تھے۔ شاہد کی پہلوٹھی کی بچی ہوئی 'ببلی' مگر سال بھر کی ہی ہوئی تھی کہ شمسہ اور قیصرہ میں ان بن ہوگئی۔ شمسہ لڑکے اور لڑکی اور اس کے پہلے بچے کو لے کر لندن چلی گئی۔ لڑکے کی بیوی جمیلہ قیصرہ کے پاس ہی رہ گئی۔ شاہد لندن سے آتا رہتا تھا اور اس طرح جمیلہ نے آٹھ بچوں کو جنم دیا۔ میں دوسرے نمبر پر آئی۔ قیصرہ چھوٹی بہن تھی۔ اس نے مجھے گود لے لیا۔ اس لیے وہ میری ماں کہلاتی ہے۔''

میں نے لیلیٰ کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر پوچھا: ''کیا تمہیں بچپن میں اس بات کا علم تھا؟''

''نہیں!'' اس نے فوراً کہا: ''جب تک مجھے کالج سے اٹھا کر یہ کام کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا، تب تک مجھے کچھ بھی پتا نہیں تھا۔ اس وقت مجھے کہیں جا کر معلوم ہوا کہ میری اصل ماں کون ہے؟ میں جسے بھابی سمجھتی تھی، وہ میری ماں ہے اور جسے بھائی کہتی ہوں، وہ میرا باپ ہے۔''

میں نے ہمدردی سے پوچھا: ''تمہیں دھچکا تو بڑا لگا ہوگا۔ کیا اب دل سے حقیقت کو مان لیا ہے؟''

''کیا فرق پڑتا ہے!'' لیلیٰ نے کہا ''مگر ماں تو پھر ماں ہے۔ میں نے انجانے میں اس کے ساتھ برا سلوک کیا تھا۔''

مجھے علم تھا کہ اصل حقیقت معلوم کرنے کے لیے مجھے لیلیٰ کی اصل ماں سے بات کرنی ہوگی جو اس گھر میں خاموش خاموش پھرتی رہتی تھی۔ وہ مجھ سے حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آتی تھی لیکن مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ میری تحقیق یا میرے بارے میں اس کے کیا خیالات ہیں۔

مجھے ساری حقیقت بتا کر لیلیٰ نسبتاً پُرسکون ہوگئی تھی۔ اس کی آواز میں، میں نے اس کے جذبات کا اتار چڑھاؤ محسوس کیا تھا۔ اس نے مزید آئس کریم کی فرمائش کی، جو میں نے اُسے فوراً منگا دی۔

''تم نہیں کھاؤ گی؟'' لیلیٰ نے مجھ سے پوچھا۔ میرے پیالے میں تو پہلی والی آئس کریم ہی گھل کر دودھ بن چکی تھی۔ ہم دونوں ہنس پڑے۔ میں نے یہ کہتے ہوئے وہ دودھ پی لیا کہ میرے لیے ایک آئس کریم ہی کافی تھی۔

لیلیٰ پورے انہماک کے ساتھ آئس کریم کھاتی رہی۔ کبھی کبھی، اپنی عادت کے مطابق وہ راہگیروں پر کوئی جملہ کس دیتی تھی۔ آئس کریم کا بل دے کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی: ''شمسہ اور قیصرہ... یہ دونوں تو واقعی بہنیں ہیں نا؟'' دراصل اس محلے کے باسیوں کے رشتوں ناتوں سے میرا اعتبار اب اٹھنے لگا تھا۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ ان خاندانوں کو سمجھنے کے لیے مجھے اور گہرائی میں جانا پڑے گا۔

لیلیٰ نے کہا: ''ماں تو ایک ہی تھی۔ مگر... باپ سے شادی بعد میں ہوئی۔ تم سمجھ گئی ناں؟ یعنی

یہ دونوں پہلے پیدا ہو چکی تھیں۔ وہ ان کا اصلی باپ نہیں ہے۔"

"اچھا..." میں نے کہا۔

لیلیٰ کو اب نت نئے پروگرام سوجھ رہے تھے۔ وہ مجھ سے کئی دوسری فرمائشیں بھی کرنا چاہتی تھی مگر میں قیصرہ کے اعتماد کو پہلے ہی موقعے پر مجروح نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اسے وقت پر گھر پہنچانا تھا اور صرف وہی کرنا تھا جس کی اجازت لی تھی ورنہ قیصرہ آئندہ مجھے لیلیٰ کو باہر لے جانے کا موقع نہ دیتی۔

باب ۱۷
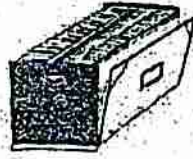
لیلیٰ کے باپ سے ملاقات

جب ہم گھر پہنچے تو لیلیٰ بہت خوش تھی۔ وہ مجھ سے پہلے ہی دوڑ کر گھر کے اندر چلی گئی۔ میں بیٹھک میں جا کر تھوڑی دیر تک اکیلی ہی بیٹھی رہی۔ پھر قیصرہ اور لیلیٰ کا ''بھائی'' کمرے میں داخل ہوئے، جن کے بارے میں اب میں جان گئی تھی کہ یہ لیلیٰ کی ماں نہیں تھی اور دوسرا لیلیٰ کا بھائی نہیں بلکہ باپ تھا۔

شاہد، تقریباً پینتیس برس کا خوبرو شخص تھا۔ صاف استری شدہ کھٹی شلوار قمیض کا سوٹ اس پر جچ رہا تھا۔ وہ میری توقع سے زیادہ کم عمر تھا۔ سر اور مونچھوں کے بال ابھی بالکل کالے تھے۔ وہ ذرا بدن کا بھاری تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے آنے سے کمرے میں تکلف کی ایک عجیب فضا قائم ہوگئی۔ قیصرہ نے مجھے بڑے تکلف سے کچھ کھانے پینے کی دعوت دی اور بعد میں جب لیلیٰ آئی تو اس کا رویہ بھی بڑا رسمی لگا۔ اس گھر میں اصل حکم کس کا چلتا ہوگا؟ اس کا صاف اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس پر مجھے تعجب ہوا کیونکہ کوٹھوں پر اختیار نائیکہ کے پاس ہوتا ہے، کسی مرد کے پاس نہیں۔ مرد دلال ہوتے ہیں اور نائیکائیں انہیں ضرورت پڑنے پر ڈانٹ ڈپٹ بھی لیتی ہیں۔

تھوڑی دیر تک ہم اسلام آباد اور لاہور کی شاہراہوں اور روایتوں کے بارے میں پر تکلف سی گفتگو کرتے رہے۔ ذرا ہی دیر میں گو با نے اعلان کیا کہ تین نئے مہمان وارد ہوئے ہیں۔ قیصرہ نے ان کا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ وہ شاہد کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ تینوں کڑک کلف دار شلوار قمیض میں بھاری بدن کے پکے لاہوری نظر آ رہے تھے۔ میں نے جب ان سے ان کے کام کے بارے میں گفتگو کرنی چاہی تو وہ کنی کترا گئے۔ قیصرہ ان کی بڑی خاطر مدارات کر رہی تھی۔ وہ شاہد سے کسی

ایسے موضوع پر گفتگو کرنے آئے تھے جو میری موجودگی میں نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ بھانپ کر میں نے قیصرہ سے بہانہ کیا کہ مجھے کسی سے ملنا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس آؤں گی۔ ملنا تو مجھے کسی سے نہ تھا لیکن میں ان چاروں بھاری بھرکم افراد کو تنہا چھوڑ دینا چاہتی تھی تاکہ جو باتیں انہیں کرنی ہوں، کھل کر کرلیں۔ وہاں سے اٹھ کر میں ایک عمر رسیدہ عورت سے ملنے چلی گئی جس نے کبھی مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔

اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ بدن کی بھاری، مگر چاق و چوبند۔ وہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن نظر آتی تھی۔ میں اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک اونچی عمارت کی دوسری منزل پر رہتی تھی۔ یہاں اس کا اپنا ایک کمرہ تھا۔ رقص کے لیے جو جگہ میسر تھی وہ زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن وہ اس بات پر مطمئن تھی کہ اس کا اپنا کوٹھا ہے اور اسے دوسروں سے کوئی جگہ کرائے پر نہیں لینی پڑتی۔

مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ میں اس کے ساتھ وہیں، فرش بچھی چاندنی پر بیٹھ گئی اور پشت گاؤ تکیے سے لگالی۔ اس کی ایک بیٹی مینا اس وقت گھر پر ہی تھی۔ دوسری بیٹی کسی گاہک سے ملنے ایک ہوٹل گئی ہوئی تھی۔ میں نے جب رسمی طور پر اس کی خیریت پوچھی تو توقع سے کہیں بڑھ کر معلومات مل گئیں۔

''اللہ تعالیٰ کی لاکھ مہربانیاں ہیں بیٹی!'' اس نے کہا۔ ''اس کا بڑا کرم ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ اس بازار میں مجھ جیسی مطمئن کوئی دوسری عورت نہیں ہوگی۔ اس عمر میں بھی...''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کہا: ''جب جوان تھی تو اچھا کما لیا۔ میرا تعلق خاص کنجر برادری سے ہے۔ خدا معاف کرے، دوسروں کی طرح میراثن یا ڈومنی نہیں ہوں۔ میں نے اپنی ماں کی خدمت کی تھی۔ خدا کے فضل سے اب میری اپنی دو بیٹیاں ہیں جو میری بات سنتی ہیں اور ان کا کاروبار اچھا جا رہا ہے۔''

اس نے پاندان کھول کر اپنے لیے پان لگانا شروع کیا اور کہا: ''تم تو جانتی ہی ہو فوزیہ! اس زمانے میں فرمانبردار اولاد کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے؟ میری بیٹیوں کی کمائی اچھی ہے۔ کل ہی ان کا استاد انہیں ایک ورائٹی شو میں لے گیا تھا۔ دونوں کو دو دو ہزار روپے ملے۔ اس پر دوسری عورتیں شکوہ کرتیں، مگر میرے جگر میں قناعت ہے۔ دو ہزار بھی کیا بُرے ہیں؟ روزی پر کبھی ناک بھوں نہیں چڑھانی چاہیے۔ روزی بھیجنے والا اللہ ہے۔''

اس نے ایک پان مجھے بھی پیش کیا، ''تسی لو ناں (آپ لیں ناں)''۔
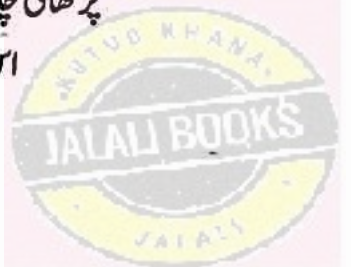
میں نے نرمی سے کہا: ''میں پان نہیں کھاتی۔''

اس نے پان منہ میں رکھا اور کہنے لگی: ''گاہکوں کے ساتھ بھی میرا رویہ ٹھیک ہی ہے۔ یہاں بڑی تُو تُو مَیں مَیں ہوتی ہے جی۔ دلالوں سے بھی گالم گلوچ ہو جاتی ہے۔ جو کچھ اللہ بھیجے، میں تو وہ سرآنکھوں پر رکھتی ہوں۔ بیٹی! لالچ کی تو کوئی حد نہیں ہوتی۔ لالچ بری بلا ہے۔ لالچ کبھی نہیں کرنی چاہیے۔''

''آپ کے ساتھ یہاں اور کون کون رہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں ہوں، دو بیٹیاں ہیں اور میرا خاوند ہے۔ میں گھر میں کوئی نوکر نہیں رکھتی۔ خدا نے مجھے ایسا خاوند دے دیا ہے جو گھر کا سب کام کرتا ہے۔ کھانا بھی پکا دیتا ہے۔ مجھے تو وہ فرش پر قدم بھی نہیں رکھنے دیتا۔''

''وہ یہیں کے ہیں یا باہر کے کسی محلے کے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ادھر ادھر کام کیا کرتا تھا۔ ایک مجرے میں مجھے دیکھ لیا اور فدا ہو گیا۔ اس زمانے میں، میں بہت خوبصورت تھی۔ خدا نے بڑا حُسن دیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے لگا۔ جب بڑی بیٹی کی شادی کی تو میں نے بھی سوچا کہ اب کسی کی ہو جاؤں۔ سچ مچ بڑا خیال رکھتا ہے وہ میرا۔ میرا سر بھی کبھی دکھنے لگے تو ساری ساری رات دباتا رہتا ہے۔ لڑکیوں کے کپڑے دھوتا ہے، سودا سلف لاتا ہے۔ میں نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ مگر یہ اللہ کا کرم بھی ہے۔''

اس بازار میں مرد کے کردار سے مجھے خاص دلچسپی تھی۔ اس لیے مین نے پوچھا: ''کیا آپ کے شوہر لڑکیوں کے گاہکوں سے سودا کرنے میں بھی آپ کی مدد کرتے ہیں؟''

''کبھی کبھار کر دیتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کسی دوسرے شہر جانا ہو تو میرے ساتھ چلا جاتا ہے۔ مگر سچ پوچھو تو اسے گھر کے کام کاج سے فرصت کم ہی ملتی ہے۔''

میں نے ایک براہ راست سوال کیا۔ ''گاہک کون لاتا ہے؟''

اس نے کہا ''خدا گاہک بھیجتا ہے بیٹی! اللہ تعالیٰ اپنی ہر مخلوق کو رزق دیتا ہے۔ گلی کے کتے کا پیٹ بھی خدا بھر دیتا ہے۔ جس نے پیدا کیا وہی پالتا ہے۔''

''سو تو ہے!'' میں نے کہا۔ ''رزق دینے والا تو اللہ ہی ہے لیکن کیا اس محلے کے لوگ گاہک لانے میں مدد کرتے ہیں؟''

اس نے کہا: ''بی بی! یہ کھلا بازار ہے جو چاہے آئے۔ کسی پر روک ٹوک نہیں۔ جب مجھے اپنی بیٹی کی نتھ اُترائی کرنی تھی تو میں نے دلال سے بات کی تھی۔ وہ اس محلے کا بڑا اچھا لڑکا ہے۔ باہر کے لوگوں کا میں بھروسا نہیں کرتی۔ یہ لڑکا میری سہیلی کا بھتیجا ہے۔ اس نے ہمارا کام کیا ہے۔ آمدنی کم

ہوئی تو گاہک بھی لایا۔ لیکن احسان اس کا بھی نہیں۔ گاہک لاتا ہے تو اس کا حصہ بھی ملتا ہے۔ اور جو گاہک اپنے پیروں سے ہماری سیڑھیاں چڑھ کر آئے تو ہم کسی دوسرے کے احسان مند کیوں بنیں۔ بس اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔''

اتنا کہہ کر اس نے ایک میٹھا پان بنا کر مجھے اصرار سے کھلا ہی دیا۔ اگال دان پاس کھسکا کر اس نے پیک تھوکی اور گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ کر کہنے لگی: ''اس محلے میں لڑکے ٹکتے نہیں ہیں۔ چلے جاتے ہیں۔ کوئی ایک آدھ دلال بھی بن جاتا ہے یا کوئی دوسرا کاروبار کر لیتا ہے۔ ویڈیو کی دکان کھول لیتا ہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کریں تو کیا کریں... '' پھر اس نے بتایا ''ہم اپنے مردوں کو سازندوں کے ساتھ زیادہ گھلنے ملنے نہیں دیتے۔ ویسے مجھے سازندوں سے کوئی شکایت نہیں۔ میں ان سے کھری رہتی ہوں تو وہ بھی میرے ساتھ ٹھیک چلتے ہیں۔ ورائٹی شو میں مجھے ساتھ نہیں لے جاتے۔ ہاں کہیں مجرا ہو تو پھر دو تین لوگ ساتھ ہو لیتے ہیں۔''

''دو تین لوگ کون؟'' میں نے پوچھا۔

''کبھی کبھار میں اپنی ایک سہیلی کو ساتھ لے جاتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''ایسے موقعے پر ایک سے دو بھلے۔ کبھی میرا خاوند بھی ساتھ چلتا ہے تا کہ تماش بین لڑکیوں کو اکیلا دیکھ کر کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کریں۔ میرا خاوند تو چھ فٹ کا لمبا گھبرو جوان ہے۔ اسے دیکھ کر ہر کوئی ڈر جاتا ہے۔''

مجھے خیال آیا کہ میں اس سے لیلیٰ کے خاندان کے بارے میں کیوں نہ پوچھوں۔ میں نے کہا ''لیلیٰ اور پمی کے خاندان والے ان کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہ مسئلہ کیا ہے؟ کسی دلال سے کیوں نہیں کہتے؟''

''میں کیا جانوں بی بی!'' اس نے کہا۔ ''لیلیٰ کی ماں اور بھائی اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ لڑکی کی شادی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ مگر میں اعتراض کرنے والی کون ہوتی ہوں؟ رہی پمی، تو وہ نچلی ذات کے لوگ ہیں۔ چاہیں تو لڑکی کو سڑک پر لے آئیں۔ ہماری بات دوسری ہے ہم تو کنجر ہیں۔ ہماری برادری کے اصول ہیں۔ ہمیں ان کے سامنے ناک کا پاس رکھنا پڑتا ہے۔ اس کام میں جو لوگ نئے نئے آتے ہیں انہیں ہماری برادری کی ریت رواج کا پتا ہی نہیں ہے۔''

اس سے گفتگو کے دوران مجھے مستقل شاہد کا خیال آ رہا تھا۔ اس کا بچپن کیسا گزرا ہوگا؟ کیا وہ سچ مچ کچھ اور کام کرتا ہے؟ وہ اتنے لمبے لمبے دوروں پر کہاں جاتا ہے؟ وہ ضرور دلالی میں ملوث ہے ورنہ لیلیٰ اس کی باتوں سے اس طرح متاثر نہ ہوتی۔ جب لیلیٰ کہتی ہے کہ ''ان کا دباؤ'' تو اس کا مطلب شاہد اور قیصرہ ہوتا ہے۔ لیلیٰ کے دھندے میں ان دونوں کی یقیناً حصہ داری ہے۔ میں نے

اپنی میزبان سے رخصت لی اور دوبارہ لیلیٰ کے گھر جا پہنچی۔

شاہد اور قیصرہ مجھے بیٹھک میں ہی مل گئے۔ میں شاہد کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ شاہد نے پوچھا: ''آپ لوک ورثہ میں کام کرتی ہیں، آپ کے پاس اپنا کارڈ ہے؟''

میں نے فوراً اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کے حوالے کیا۔ وہ بڑے غور سے کارڈ دیکھتا رہا، پھر کہنے لگا: ''عام طور پر ادارے ایک شناختی کارڈ بھی دیتے ہیں۔''

''اخاہ!'' میں نے سوچا، ''تو یہ میرے بارے میں تفتیش کرنا چاہتا ہے!'' خیر مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ میں نے لوک ورثہ کا شناختی کارڈ اسے دکھا دیا۔ شاہد نے اس کا بغور مطالعہ کیا۔ پھر مجھ سے میرے خاندان کے بارے میں سوالات کرنے لگا۔ قیصرہ بیٹھی غور سے یہ گفتگو سن رہی تھی۔

جب وہ بالآخر مطمئن ہوگیا تو میں نے اس سے سوالات کرنے شروع کیے۔ اب میں نے اس کا کارڈ مانگا۔ اس نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیا۔ لیکن اس پر اس کا پیشہ درج نہیں تھا۔ میں نے مزید پوچھ گچھ کی تو اس نے کہا کہ وہ مارکیٹنگ کے شعبے میں ہے۔ میرے بارے میں مطمئن ہوکر وہ خاصے دوستانہ انداز میں گفتگو کرنے لگا تھا۔ اس نے کہا: ''لیلیٰ کہتی ہے کہ آپ چائے نہیں پیتیں۔''

میں زیادہ بے تکلف نہیں ہونا چاہتی تھی اس لیے سنجیدگی سے جواب دیا: ''جی ہاں! میں چائے نہیں پیتی۔'' پھر میں نے قیصرہ سے پوچھا کہ ''لیلیٰ کہاں ہے۔'' اس نے بتایا کہ ''وہ سوگئی ہے۔''

شاہد کرسی پر آگے جھک کر، میرے کچھ اور قریب آکر کہنے لگا: ''او جی، آپ کو تو سب بہت پسند کرتے ہیں یہاں۔ بڑا بھروسا ہے آپ پر سب کو۔ میں آپ کے سامنے ایک بڑی اچھی تجویز رکھنے والا تھا!!''

میں نے ایک لمبی سانس لی اور تجویز سننے کے لیے تیار ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کہے گا کہ اب یہاں نہ آنا۔ یہ تحقیق ختم کرو، وغیرہ... ''کہیے... میں سن رہی ہوں۔'' میں نے کہا۔ جو کچھ اس نے کہا، وہ سننے کے لیے میرا ذہن قطعی تیار نہ تھا۔

''دیکھیے جی... میں نے کافی دنیا دیکھی ہے۔'' اس نے کہنا شروع کیا ''ہمارے کاروبار میں گاہکوں کی کچھ خواہشیں ہوتی ہیں۔ مجھے اس کا اندازہ ہے۔ دن رات ان سے واسطہ جو پڑتا ہے۔ جو ہماری لڑکیاں ہیں، وہ... اس خواہش کو پورا نہیں کرسکتیں۔ اس کاروبار میں ہمیں تعلیم یافتہ لڑکیوں کی ضرورت ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئیں ناں؟''

میں گم سُم تھی اور جی جان لڑا کر اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

شاہد نے کہا: ''ہماری بہن بیٹیاں پڑھی لکھی تو ہوتی نہیں۔ کالج بھی جائیں تب بھی وہ بات پیدا

نہیں ہوتی۔ ایسی مہذب، شائستہ نہیں ہوتیں۔ اونچے طبقے کے گاہک شائستہ لڑکیاں مانگتے ہیں اور ہم انہیں ایسی لڑکیاں مہیا نہیں کر سکتے۔ میں سوچ رہا تھا کہ... آپ... آپ ہماری کچھ مدد کر سکتی ہیں؟"

اتنا سُن کر میری آنکھیں پھٹ چکی تھیں، مگر شاہد اپنی دھن میں کہے جا رہا تھا۔

"آپ کی تو ان گنت لڑکیوں سے دوستی ہے۔ وہ تو فر فر انگریزی بولتی ہوں گی۔ ایسی لڑکیوں کی بڑی مانگ ہے۔ بڑے مختلف قسم کے گاہک ہیں جو ایسی لڑکیاں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سیاست داں... اونچے درجے کے کاروباری لوگ... وہ طبقہ ہی دوسرا ہے۔ اور پیسے کا تو پوچھئے مت... بہت پیسہ ہے۔"

میں نے لیلیٰ کی دادی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ جلدی سے گفتگو میں شامل ہوگئی۔ "ہم تم سے ایسا کرنے کو نہیں کہہ رہے ہیں۔ مگر تمہاری رشتے کی بہنیں ہوں... یا کوئی دوست... بس کبھی کبھی..."

میں نے ایک گہری سانس لے کر پُرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "دیکھئے... میں یہاں صرف ایک تحقیق کے سلسلے میں آتی ہوں۔ مجھے اس کاروبار میں دوسری کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہے۔ مہربانی سے، مجھ سے ایسی کوئی امید نہ رکھیں۔"

یہ سن کر شاہد کرسی پر دوبارہ پیچھے کھسک کر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی حیرت زدہ نگاہوں سے اپنی ماں کو دیکھا گویا کہہ رہا ہو کہ کتنی نادان لڑکی ہے! ایسی اچھی پیشکش کو ٹھکرا رہی ہے! معلوم ہو رہا تھا کہ ان لوگوں نے اس موضوع پر آپس میں کافی بات چیت کی ہے اور انہیں اُمّید تھی کہ میں راضی ہو جاؤں گی۔ شاید ان کا کاروبار مندا جا رہا تھا اور وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ ایک اچھی پیشکش کو مسترد کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ آخر شاہد نے کہا "جب تک چاہیں آپ اس پر غور کیجیے۔ ہوسکتا ہے آپ کو ایسی کوئی لڑکی مل ہی جائے... فی الحال اس ذکر کو یہیں چھوڑتے ہیں..."

باب ۱۸
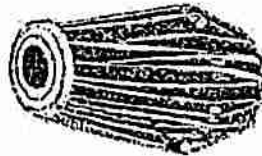
لیلیٰ کی اصلی ماں

ہفتے بھر سے زیادہ عرصے تک، لیلیٰ کی ماں کے اردگرد گھومتے رہنے کے بعد مجھے وہ معلومات ملیں جن کے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر حقیقت کی میں نے کچھ شکل بنائی۔ اس سے بات کرنے کے لیے مجھے ہر وقت گھر کے اندر والے حصے میں جانا پڑتا تھا کیونکہ جمیلہ ہمیشہ وہاں ہی رہتی تھی۔ میں بھی اب سب سے اتنی زیادہ آشنا ہوگئی تھی کہ انہیں میرا اندر کے حصے میں چلے آنا یا باورچی خانے میں جا بیٹھنا اب ذرا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس حصے کو بیٹھک سے ایک میلی کچیلی بوسیدہ چادر علیحدہ کرتی تھی۔ اس چادر کے ایک طرف مہمانوں کے لیے بیٹھک تھی اور دوسری طرف یہاں کے مکینوں کی ذاتی زندگی، جہاں چھوٹے چھوٹے کمروں میں بہت سے لوگ ٹھسے پڑے تھے۔ جہاں ہر وقت نیم اندھیرا سا رہتا تھا اور جس کے کمروں میں ایک ناخوشگوار سی گھٹن تھی۔

چادر کے پردے کے پیچھے ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کا دروازہ ایک لمبی راہداری میں کھلتا تھا۔ اس کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ ایک نئے زمانے کا ''بیڈ'' پڑا تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ ایک چارپائی رکھی تھی۔ دیواروں پر فلم ایکٹرسوں کے پوسٹر لگے تھے جو پرانے کیلنڈروں سے کاٹے گئے تھے۔ کچھ دوسری تصاویر بھی تھیں۔ ایک کونے میں ایک ٹیلی وژن اور وی سی آر پڑے تھے۔ کمرے میں حبس تھی اور گرمی...

اس کمرے کے ملحق بالکنی جو اندرونی صحن کے گرد گھوم رہی تھی، نسبتاً ہوادار تھی۔ قیصرہ نے یہ

پانچ منزلہ عمارت کئی حصوں میں تقسیم کر رکھی تھی جو اس نے مختلف کرایہ داروں کو دے رکھے تھے۔ پہلی منزل کا نصف حصہ جو سڑک کے رخ پر تھا، اس نے اپنے خاندان کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ اس طرح اسے ناچ گانے کے لیے ایک بڑا کمرہ (بیٹھک) مل گیا تھا۔ سامنے کی سڑک سے یہاں براہِ راست آیا جا سکتا تھا اور یہاں سے اوپر والی منزلوں تک جانے والی سیڑھی تک بھی براہِ راست رسائی حاصل تھی۔ باقی کے حصے میں تین چھوٹے کمرے اور ایک باورچی خانہ تھا۔

لیلیٰ کی ماں جمیلہ ایک طرح سے باورچی خانے میں ہی رہتی تھی۔ جب مجھے اس سے بات کرنے کا موقع ملا تو وہ آسانی سے میرے ساتھ کھل گئی۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کیونکہ وہ بہت خاموش رہتی تھی۔ اس نے پہلی گفتگو میں ہی خاموشی سے مجھ سے کہا: ''تم ہر ایک کی کہانی سنتی ہو۔ کبھی میری بھی سننا۔ میں بھی بتانا چاہتی ہوں کہ مجھ پر کیا گزری۔ میں نے کیا دکھ سہے۔ میرے اندر وہ اتنے گہرے دفن ہیں کہ شاید میں خود ان کو بھولتی جا رہی ہوں۔''

مختلف اوقات میں سنائے ہوئے ان قصوں سے میں یہ کہانی ترتیب دے سکی۔

جمیلہ لاہور کے ایک نواحی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ یہ ذات کی کمی تھی اور اس کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا۔ اس کا باپ جمیلہ کی ماں کو قرضوں کے بوجھ تلے دبا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ ماں کے سر پر جوان بیٹی کے بیاہ کا بوجھ بھی تھا۔ وہ جلد سے جلد اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتی تھی۔ شمسہ کی اس علاقے کے کچھ لوگوں سے واقفیت تھی۔ اس نے جمیلہ کی ماں سے اس وقت رابطہ کیا جبکہ وہ بڑے نازک وقت سے گزر رہی تھی۔ اپنے بیٹے کا پیغام لے کر وہ خود جمیلہ کی ماں سے ملی اور اس سے کہا کہ وہ ایک یتیم لڑکی سے جہیز کا مطالبہ نہیں کرے گی۔ اس ہمدردی نے فوراً جمیلہ کی ماں کا دل جیت لیا۔ وہ اپنی خوش نصیبی پر حیران تھی کہ ایسے فرشتے لوگ اسے کہاں سے مل گئے جو جہیز کے بغیر اس کی بیٹی کو قبول کرنے پر تیار تھے۔ گاؤں والے مبارکباد دیتے نہ تھکتے تھے۔ کسی کو یہ سُن گُن بھی نہ تھی کہ شہر میں رہنے والا یہ گھرانہ کس دھندے میں ملوث ہے۔ اپنی مخصوص معصومیت کے باعث وہ خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔ ایک بہت سادہ تقریب میں جمیلہ کا ہاتھ شاہد اور اس کے گھر والوں کو سونپ دیا گیا۔

اس وقت جمیلہ کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی اور اس نے کبھی گاؤں سے باہر قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ سسرال آ کر کچھ دن تک تو اس کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ جب تک وہ سمجھ پائی، بات بہت آگے نکل چکی تھی۔ جمیلہ کو تو میکے جانے کی کبھی اجازت نہ ملی لیکن چند ماہ بعد اس کی ماں اس سے ملنے آئی۔ بیٹی کی سسرال کی حقیقت جان کر غریب بیوہ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ گیا۔ وہ غم سے ہاتھ

ملتی رہ گئی۔ لیکن وہ بے بس تھی۔ اس کا اپنا کوئی والی وارث یا سہارا نہ تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکی اور اپنی قسمت کو کوستی، آنسو بہاتی واپس چلی گئی۔ وہ اس گھر میں پھر کبھی نہ آئی۔ جمیلہ کو اب صرف اپنا ہی غم نہ تھا، اس میں یہ اضافہ بھی ہو گیا تھا کہ اس کے باعث اس کی بدنصیب ماں کو کتنا دکھ پہنچا ہے۔

جمیلہ کو ماں سے مدد کی توقع تو نہ تھی کیونکہ وہ اپنے گھر کے حالات جانتی تھی لیکن ماں کے واپس جانے کے بعد اس کے وجود میں امید کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

سسرال میں جمیلہ کو دو ساسیں ملیں۔ اس کی اصل ساس تو شمسہ تھی جو شاہد کی منہ بولی ماں تھی، لیکن ساس کا رعب قیصرہ استعمال کرتی تھی۔ شمسہ نے جمیلہ سے کہا کہ وہ پردے میں رہے گی اور اس سے یہ دھندا کبھی نہیں کرایا جائے گا۔ ایک بہو کی حیثیت سے وہ گھر کی ''عزت'' ہے۔ وہ گھر داری اور بچوں کی دیکھ بھال کرے گی۔ جمیلہ کا شوہر خود اس وقت اٹھارہ برس کا تھا۔ وہ بہت کم سن تھا اور اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس گھر میں اسے شاہد نہیں، شمسہ اور قیصرہ بیاہ کر لائی تھیں۔ جمیلہ دن رات ان دونوں کی خدمت میں مصروف ہو گئی۔ جمیلہ کو ایک نند ''کرن'' بھی ملی۔ لیکن اسے شاہد اور کرن کے اصلی والدین کے بارے میں کچھ بھی علم نہ تھا۔ اس کی ساسیں اس کے ساتھ بہت سختی کا سلوک کرتیں۔ وہ یہ سمجھ گئی تھی کہ اگر اسے یہاں گزارا کرنا ہے تو اسے بہت تابعدار بن کے رہنا پڑے گا۔ اس سلوک کا اثر یہ ہوا کہ کم سن جمیلہ سہم کر رہ گئی۔ اس نے بولنا تقریباً ترک ہی کر دیا۔ وہ اس گھر میں نظر تو آتی تھی، مگر اس کی آواز کبھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ قیصرہ اور شمسہ اس گھر کی رانیاں تھیں اور جمیلہ کا خاوند شاہد ان کے حقیر ملازموں کی طرح وہاں رہتا تھا۔

جب جمیلہ نے پہلی بیٹی کو جنم دیا تو ساسوں نے بھرپور انداز سے خوشیاں منائیں۔ گھر میں چراغاں ہوا۔ ناچ گانے ہوئے۔ یوں لگتا تھا جیسے بیٹی کو شمسہ اور قیصرہ نے جنم دیا ہے۔ نوزائیدہ کی اصلی ماں، جمیلہ دو دن کی زچہ، اس دن بھی برتن دھونے اور باورچی خانے کا کام کرنے پر مجبور کی گئی۔

اس کے سال بھر بعد دونوں بہنوں میں لڑائی ہو گئی۔ شمسہ کرن اور جمیلہ کی پہلی بیٹی کو لے کر لندن چلی گئی۔ وہ کیوں چلی گئی؟ اس بارے میں بہت سی کہانیاں بتائی گئی تھیں۔ مجھے بہر حال یہ وجہ زیادہ قابلِ یقین لگتی ہے کہ شمسہ اپنے کسی گاہک کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی اور اس کے پیچھے لندن جا پہنچی۔

شاہی محلے میں یہ جائیداد شمسہ اور قیصرہ کے باپ نے ان دونوں کو دی تھی۔ لندن جانے سے پہلے شمسہ نے دیوار اٹھوا کر عمارت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ جمیلہ کی پہلی اولاد کو شمسہ اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کاروبار میں بیٹیاں بڑھاپے کا سہارا اور مستقبل کی امید ہوتی ہیں۔ شمسہ اسے کیسے چھوڑ جاتی! بچی کی ماں سے کچھ پوچھنے کی اس نے ضرورت بھی محسوس نہ کی۔

شمسہ کے جانے سے قیصرہ بے سہارا رہ گئی۔ اس کے لیے روزی کمانے والا اب کوئی نہ تھا۔ قیصرہ کی عمر اتر گئی تھی۔ اب وہ نائیکہ بن کر زندگی گزارنے کا آغاز کر رہی تھی کہ بہن نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اس نے خود دھندا کیا مگر اس طرح زیادہ عرصے تک گزارا نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اب بوڑھی ہو رہی تھی۔ قیصرہ نے شاہد کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا کہ وہ لندن سے آتا جاتا رہے۔ اس طرح جمیلہ دوبارہ امید سے ہوئی۔ قیصرہ نے صبر سے نو مہینے انتظار کیا اور جب جمیلہ نے دوسری بیٹی پیدا کی تو وہ نہال ہوگئی۔ اس بار سونے کا انڈا اس کے حصے میں آیا تھا۔ وہ جمیلہ کی پہلی بیٹی گنوا چکی تھی۔ اس بار اس نے اعلان کر دیا کہ یہ والی بچی صرف اُس کی ہوگی۔ اس بچی کا نام قیصرہ نے ''لیلیٰ'' رکھا، اب اسے مستقبل کا کچھ آسرا نظر آ رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی بیٹی کے بغیر ایک طوائف کا بڑھاپا بڑا خوفناک ہوسکتا ہے۔ اگر وہ کامیاب نائیکہ نہ بن سکے تو در در بھیک مانگنے کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔ طوائف کو تو لازماً صحیح عمر میں کسی سے شادی کرنی ہوتی ہے یا نائیکہ بن کر باقی زندگی گزارنی ہوتی ہے۔

لیلیٰ کو قیصرہ لے اڑی اور جمیلہ پھر خالی گود لیے رہ گئی۔ پہلی اولاد لندن لے جائی جا چکی تھی اور وہاں سے اس کی کبھی کوئی خیر خبر تک نہیں آتی تھی۔ وہ لیلیٰ کو پال پوس سکتی تھی لیکن اسے کبھی یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ لیلیٰ کی ماں ہے۔ لیلیٰ کے بارے میں وہ کوئی فیصلہ خود نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی حیثیت لیلیٰ کی ''ملازمہ'' سے بڑھ کر نہیں تھی۔

شاہد لندن سے آتا رہا۔ جمیلہ ہر سال حاملہ ہوتی رہی۔ جمیلہ اور اس کی اولاد کے اخراجات قیصرہ اٹھاتی تھی اور وہ ہی ان کی مالکہ تھی۔ جمیلہ صرف بچے پیدا کرنے کی مشین تھی۔ بچے قیصرہ کی ملکیت تھے۔

ابتدا میں شاہد لندن میں ویزے کا کوئی چکر چلا کر رہتا رہا۔ جب اس نے ترکِ وطن کے کاغذات داخل کیے تو اس کی درخواست کا فیصلہ ہونے میں بہت زیادہ وقت لگنے لگا۔ برطانوی قومیت حاصل کرنے کے لیے اس نے لندن میں ایک جھوٹی شادی کرنے کا ڈرامہ رچایا۔ برطانوی عملدار پہچان گئے کہ کاغذات جعلی ہیں اور شاہد کی درخواست مسترد کر کے اسے جبراً پاکستان بھیج دیا گیا۔

شاہد کے واپس آ جانے سے قیصرہ بہت خوش ہوئی کیونکہ کاروبار اچھی طرح چلانے کے لیے مرد کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ لیلیٰ کے بچپن کے زمانے کے دوران، قیصرہ اپنا کمرہ دوسری طوائفوں کو کرائے پر دے کر گزارا کرتی رہی تھی۔ شاہد نے لندن میں دلالی کا کچھ تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ ولایت پلٹ ہونے کے باعث اسے یقین تھا کہ وہ دیسی دلالوں کو اس دوڑ میں پیچھے چھوڑ جائے گا۔ قیصرہ اس بات پر بھی خوش تھی کہ شاہد گھر میں ہی رہے گا تو کئی اور بچے بھی پیدا کرے گا۔ جمیلہ کی بدنصیبی یہ تھی کہ شاہد ایک ظالم شوہر اور غیر ذمہ دار باپ نکلا۔ اب جمیلہ سوائے بڑی دو بیٹیوں کے اپنے دوسرے بچوں کو

یہ بتا سکتی تھی کہ ان کی ماں اور باپ کون ہیں۔ اس کے باوجود، یہ ظاہر تھا کہ ان کی مالکہ قیصرہ ہی تھی۔

لیلیٰ کو اسکول میں داخل کروایا گیا بلکہ دو سال تک وہ کالج بھی گئی۔ اس محلے میں یہ بہت انوکھی بات تھی۔ طوائفیں اپنی بیٹیوں کو پانچویں یا زیادہ سے زیادہ آٹھویں جماعت سے آگے تعلیم نہیں دلواتیں۔ عام طور پر یہی سوچا جاتا ہے کہ اگر انہوں نے زیادہ تعلیم حاصل کرلی تو ان کے دماغ میں کوئی دوسری ہوا سما جائے گی اور ہوسکتا ہے وہ اس نظام میں اپنا مقرر کردہ کردار ادا کرنے سے بغاوت کر بیٹھیں۔ لیکن قیصرہ اور شاہد نے سوچا کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ پڑھی لکھی، ''اسمارٹ'' طوائفوں کی اب زیادہ مانگ ہے، اس لیے انہوں نے لیلیٰ کو کالج تک تعلیم دلانے کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔

کالج میں دو برس گزارنے کے بعد لیلیٰ سے کہا گیا کہ اب اسے دھندا شروع کرنا پڑے گا۔ شروع میں لیلیٰ نے واقعی کافی مزاحمت کی۔ میں کہہ نہیں سکتی کہ اس مزاحمت کی کیا وجہ تھی۔ کیا اسکول کالج جانے کے باعث لیلیٰ معاشرے کی اخلاقی قدروں کو قبول کرچکی تھی؟ یا یہ صرف ایسی بغاوت تھی جو ہر جواں سال لڑکی یا لڑکا اپنی روایات سے کرتا ہی ہے؟

وجہ کچھ بھی ہو مگر گھر کے ''بڑوں'' نے لیلیٰ کا دماغ درست کرنے کی پُرزور کوشش کی۔ اس زمانے میں لندن سے شمسہ بھی آئی ہوئی تھی۔ اس کے خیال میں قیصرہ نے نرمی اور لاڈ پیار سے لیلیٰ کو بگاڑ دیا تھا اور لیلیٰ خودسر ہوگئی تھی۔ وہ برادری پر یہ بھی ثابت کرنا چاہتی تھی کہ ایسے معاملات میں وہ کتنی ہوشیاری سے کام لے سکتی ہے۔ اس نے وقتی طور پر معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور لیلیٰ کو بغاوت کا مزا چکھانے کا اعلان کردیا۔ پہلے اس نے جمیلہ کی خبر لی کہ اس نے لیلیٰ کے دماغ میں بغاوت کا بیج بویا ہے۔ جمیلہ نے لاکھ قسمیں کھائیں کہ اس سلسلے میں اس نے لیلیٰ سے کبھی بات تک نہیں کی ہے لیکن شمسہ نے اس کی ایک نہ سنی۔ طیش کے عالم میں شمسہ نے جمیلہ، اس کے دوسرے بچوں اور لیلیٰ کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ ''جاؤ! اپنی ماں کے گھر چلی جاؤ۔'' اس نے جمیلہ سے کہا۔

ان تمام واقعات نے لیلیٰ کی بغاوت کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اس زمانے میں لیلیٰ کو یہ بھی پتا چل گیا کہ جمیلہ اس کی ماں ہے۔ لیلیٰ کو لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنی ماں کے ساتھ دھوکا کیا ہو۔ گھر میں سب لوگ جمیلہ کے ساتھ نوکرانیوں کا سا سلوک ہی کرتے تھے اور لیلیٰ نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ یہ سب یاد کرکے وہ شرمندگی سے پانی پانی ہورہی تھی۔ اس کے بعد سے وہ اپنی ماں کے بہت نزدیک آگئی۔

جب وہ اپنی نانی کے گھر پہنچی تو انہیں معلوم ہوا کہ اس کا اب کوئی گھر نہیں رہا ہے۔ وہ جہاں جھاڑو برتن کا کام کرتی ہے، وہیں برآمدے کے ایک کونے میں سورہتی ہے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کے پاس تو اپنا پیٹ پالنے کو بھی پیسے کبھی نہیں ہوتے تھے۔ وہ گاؤں میں اس بدنامی کا

سامنا بھی نہیں کرسکتی تھی کہ بیٹی اور اس کے بچوں کو سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا ہے۔

لیلیٰ، جمیلہ اور دوسرے بچوں نے ایک رات ایک دور کے رشتہ دار کے گھر بتائی اور دوسرے دن واپس لاہور قیصرہ اور شمسہ کے گھر آ گئے۔ جمیلہ نے لیلیٰ سے کہا کہ قیصرہ اور شمسہ کا حکم مان لینے کے سوا ان کے پاس دوسرا کوئی بھی راستہ نہیں ہے۔ لیلیٰ کو ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ وہ واقعی طوائف بننا نہیں چاہتی یا اس بات پر اسے غصہ آتا ہے کہ اس کا باپ اور قیصرہ اسے اپنی انگلیوں پر نچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ 'شاید اصل وجہ یہی ہے!' اس نے سوچا۔ لیکن اسے جسم فروشی بھی پسند نہ تھی کیونکہ دراصل اسے اُس کلنک کی فکر تھی جو اس کام کے ساتھ منسوب ہے۔ وہ اس خیال سے پریشان تھی کہ باقی کی دنیا کے سامنے اسے تاعمر اپنا پس منظر چھپانا پڑے گا۔ وہ کالج میں اپنے دوستوں کو کبھی نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کہاں رہتی ہے اور اس کا خاندان کیا کرتا ہے۔

جمیلہ اور بچوں کے واپس آ جانے اور اپنی ترکیب کی کامیابی پر شمسہ فخر سے پھولے نہ سمائی۔ اس نے قیصرہ سے کہا، ''نائیکہ اس طرح بنا جاتا ہے۔ یہ ایک فن ہے۔'' شمسہ نے قیصرہ کو نیچا دکھاتے ہوئے اسے زیادہ محنت اور ہوشیاری کی تلقین کی۔ اس نے کہا: ''روزی کے لیے محنت کرنی ہوتی ہے۔ کچھ ہاتھ پاؤں مارنے ہوتے ہیں۔ یوں بیٹھے بیٹھے کوئی روزی نہیں دے جاتا۔ محنت سے پیسہ ملتا ہے۔ محنت کرو اور حق حلال کی روزی کھاؤ۔'' شمسہ لندن واپس چلی گئی۔ لیلیٰ کی زندگی کے اپنے اتار چڑھاؤ آتے رہے۔ مگر اب وہ اپنی ماں کے ساتھ ماں جیسا برتاؤ کرنے لگی۔ وہ اس کی حمایت میں اٹھ کھڑی ہوتی۔ اس نے دوسرے بچوں کو بھی قائل کر لیا کہ وہ ماں کے ساتھ عزت کا برتاؤ کریں۔

جمیلہ کو اپنے مستقبل سے کوئی امید نہیں تھی۔ اس کی زندگی اس خاندان کے ساتھ ایک پیچیدہ انداز میں گُندھی ہوئی تھی۔ اسے ان سے علیحدہ زندہ رہنے کا کوئی طریقہ نہیں آتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اسے حیرت ضرور ہوتی تھی کہ خدا نے اس کو کس گناہ کی سزا دی ہے؟ اس نے تو کبھی کسی کو جان بوجھ کر دکھ نہیں پہنچایا۔ اس نے تو صرف خدمت کی تھی۔ یہ گھر، اس کی چار دیواری، یہی اس کی کُل کائنات تھی۔ یہاں اسے ذلت، گالیوں اور طمانچوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ اس کی زندگی گھر کے پچھلے تین کمروں میں محدود تھی۔ یہی اس کی زندگی کی حدیں تھیں۔ اور شاید، قبر میں اتارے جانے تک اسے ان حدوں سے باہر نہیں نکلنا تھا۔

باب ۱۹

محلّے کے مرد

شاہد، قیصرہ کے مشیر کی طرح تھا، لیکن سیاہ وسفید کی مالک بہرحال قیصرہ ہی تھی۔ جب شاہد نے مجھ سے انگریزی بولنے والی لڑکیوں کا مطالبہ کیا تھا، اسکے بعد سے وہ پھر غائب ہو گیا تھا۔ وہ کہاں گیا؟ یا کہاں جاتا رہتا ہے؟ اس کے بارے میں کوئی بھی مجھے صحیح جواب نہیں دیتا تھا۔ لیکن اس گفتگو کے بعد قیصرہ کے برتاؤ میں واضح تبدیلی آئی۔ وہ اب میرے ساتھ کہیں زیادہ شفقت اور محبت کا سلوک کرنے لگی۔ نہ جانے یہ احساسِ جرم تھا یا یہ امید کہ میرے ساتھ دوستی کا بالآخر اسے کچھ پھل ملے گا!

اس کے بعد میں محلے کے مردوں کا زیادہ غور سے مشاہدہ کرنے لگی۔ کنجر خاندانوں میں تو خصوصاً ان کی حیثیت دوسرے درجے کے شہریوں جیسی نظر آ رہی تھی۔ جہاں تک کاروبار اور محلے کے روایتی نظام کا تعلق تھا، سربراہی کردار عورتیں ہی ادا کرتی تھیں۔ لیکن غور سے دیکھنے پر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس محلے میں جو سیاسی سرگرمیاں پروان چڑھ رہی تھیں ان میں عورتیں بالکل شامل نہیں تھیں۔ مودا کنجر جیسے کچھ مرد ہی تھے جو محلے سے باہر تک پہنچنے والے مسائل اٹھا رہے تھے۔ اس محلے کے لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور غیر منصفانہ رویّے کے بارے میں مودا کنجر نے ہی آواز اٹھائی تھی اور جدوجہد کی تھی۔

محلے کے میراثی کم وبیش سارے ہی مرد تھے تاہم ان میں شاذ ہی کوئی وہاں اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ حالانکہ میراثی مردوں کا درجہ میراثی عورتوں سے بلند تھا لیکن ذاتوں کے حساب سے وہ کنجر مردوں سے کم تر درجے کے سمجھے جاتے تھے لیکن یہ درجہ بندی محلے تک محدود تھی۔ محلے سے باہر میراثی دنیا کا چلن تیزی سے سیکھ گئے تھے اور ''ورائٹی شو'' جیسے پروگرام کرانے میں خودکفیل ہو چکے تھے۔

ایک دن قیصرہ بڑے اچھے موڈ میں تھی۔ پچھلی رات لیلیٰ نے کسی گاہک سے معقول رقم ماری تھی۔ اس نے مجھے ایک نہیں بلکہ دو بار گلے لگایا۔ وہ بڑی لگن سے میری خاطر بھی کر رہی تھی۔ موقع غنیمت جان کر میں نے اس سے ان تبدیلیوں کے بارے میں پوچھا جو بدلتے ہوئے حالات میں کاروبار کو چلانے کے سلسلے میں آ رہی تھیں۔ سب سے پہلے میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس کاروبار سے متعلق اہم فیصلے کون کرتا ہے۔ میں نے اس سے ''ورائٹی شو'' کے بارے میں پوچھا۔

قیصرہ نے کہا: ''یہ تو نئے نئے شروع ہوئے ہیں۔ پہلے باقاعدہ مجرے ہوتے تھے۔ اس کی شان ہی دوسری تھی۔ اب تو بس یہ پھکڑپن رہ گیا ہے۔''

میں نے پوچھا: ''پہلے کیا ہوتا تھا؟''

دیوار پر لگی سفید و سیاہ تصویروں کو دیکھتے دیکھتے، بیتے دنوں کی یاد قیصرہ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ بن کر پھیل گئی۔ اس نے کہا: ''وہ بڑے ادب آداب کا زمانہ تھا جی۔ کسی شادی وادی پر مجرا کرایا جاتا تھا تو وہاں سے کوئی آ کر نائیکہ سے بات چیت کرتا تھا۔ رقم طے کی جاتی تھی مگر اس میں بھی تمیز اور ادب سے کام لیا جاتا تھا۔ رقم پر آجکل کے چھوکروں کی طرح بدتمیزی سے نہیں جھگڑتے تھے۔''

''یہ کام کون کرتا تھا؟'' میں نے پوچھا ''میراثی؟... یا دلال؟''

''اونہہ'' قیصرہ نے کہا۔ ''میراثی ورائٹی شو کے ٹھیکیدار بنتے جا رہے ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں ''ہم نے تو اتنے پیسے دینے ہیں۔ لیتی ہو تو لو ورنہ تمہاری مرضی۔ اور بہت سی ہیں جو ہماری منتیں کر رہی ہیں۔ بات یوں کرتے ہیں جیسے ہمارے باپ دادا کی جان پر بڑا احسان کر رہے ہوں۔'' قیصرہ نے منہ بنا کے ان کی نقل اتاری: ''دسّو کی کہندے او، دسّو! (بتاؤ کیا کہتے ہو، بتاؤ!)'' پھر نفرت سے کہنے لگی: ''حرامی!! ہمارے ٹکڑوں پر تو پلے ہیں۔ اب ہمیں ہی آنکھیں دکھاتے ہیں!'' میں اندازہ لگا سکتی تھی کہ قیصرہ کو بڑا غصہ آ رہا ہے۔ کاروبار کی باگ ڈور کنجریوں کے ہاتھ سے نکل کر میراثیوں کے ہاتھ میں جا رہی ہے۔ قیصرہ نے کہا: ''پتوکی کے پروگرام میں لیلیٰ کے استاد جی نے اسے کیا دیا؟ جانتی ہو؟ نرے دو ہزار روپے۔ اور یہ حرامزادے پیسوں پر بات بھی نہیں کرتے۔ یہ ہمیں جتنا بھی دیں ہمیں منظور کرنا پڑتا ہے۔''

پھر چھاتی پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے سر فخر سے بلند کر کے بولی، ''اسیں خاندانی کنجر آں... خاندانی (ہم خاندانی کنجر ہیں... خاندانی)! ہم ان پیسے کے پتروں کی طرح اس کاروبار میں صرف کمائی کے لیے نہیں بیٹھے، ہماری تو یہ صدیوں سے روایت ہے۔ ہمارا تو یہ جدی پشتی پیشہ ہے!'' اپنے خاندانی پیشے پر اُس کا فخر بڑا متاثر کن تھا۔ میں نے ادب سے پوچھا: ''تو پہلے زمانے

میں رقم کیسے طے کی جاتی تھی؟''

''بیچ میں کوئی پڑتا تھا۔'' قیصرہ نے کہا'' یا تو دلال بات کرتا تھا یا کوئی دوسرا۔ جیسے اگر مجرا لیلیٰ کا ہوتا تو میری جگہ میری بہن بات چیت چلاتی۔ وہ کہتی نہیں جی میری بہن لاہور سے اتنی دور لڑکی کو بھیجتی ہی نہیں ہیں۔ پھر جب آنے والے منت سماجت کرتے، تو وہ کہتی، خیر ہے، میں اپنی بہن سے بات کر کے دیکھوں گی۔ پھر وہ مجھے بتاتی کہ کیا باتیں ہوئی ہیں۔ اور جا کر ان لوگوں سے کہتی، میری بہن راضی نہیں ہو رہی ہے، ہاں اگر رقم اتنی کر دو تو شاید میں سمجھا بجھا کر اسے راضی کر لوں۔ پھر وہ لیلیٰ کی تعریفیں کرتی، کچھ مجروں کی کہانیاں سنا کر گاہکوں کو اور بے تاب کرتی۔ ان پر یہ ظاہر کرتی کہ وہ انکی طرف سے وکالت کر رہی ہے۔ اس طرح بات قاعدے قرینے سے چلتی۔ کسی کی بے عزتی بھی نہ ہوتی۔ اور ایک یہ میراثی ہیں منہ در منہ وہ ہم سے کہتے ہیں: 'بس اتنے پر کرنا ہے تو کر لو ورنہ ہم کوئی دوسرے دیکھتے ہیں'، ان چھوکروں کو بس اپنے سازوں کے ساتھ ٹوں ٹاں کرنا آتا ہے۔ سودا ایسے کرتے ہیں جیسے سر پر ہتھوڑا مار رہے ہوں۔ بدتمیز کہیں کے!'' قیصرہ نے میراثی سازندوں کی ایسی نقل اتاری کہ میں ہنس پڑی۔ قیصرہ نے کہا: ''آج تمہارے ساتھ سارا حال کھول رہی ہوں۔ میں تو اور کسی کو نہ بتاؤں یہ ساری باتیں... ہم ایسی باتیں کسی سے نہیں کہتے۔''

میں نے مسکرا کر پوچھا: ''تو سودا مرد لوگ طے کرتے ہیں؟''

''ہاں! وہ بھی طے کرتے ہیں۔ جو بھی بیچ میں پڑے اس کو اس کا حصہ مل جاتا ہے۔''

میں نے کہا: ''تو اب باہر سے دعوت نامے سازندوں کو کیسے ملتے ہیں؟''

قیصرہ نے کہا: ''اب مجرے تو ہوتے ہی کہاں ہیں؟ وہ تو لوگ ورائٹی شو چاہتے ہیں، جیسے وہ ٹی وی پر دیکھتے ہیں۔ ان کو گانا اور رقص بھی چاہیے اور مزاحیہ خاکے بھی۔ روایتی مجرے کے دن اب گئے۔ آپ کو پورا ایک ماحول ملتا تھا اور آپ ایک کے بعد دوسرے گانے سے پورا ایک جادو کا نقشہ کھینچتے تھے۔ اپنے پرستاروں سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا کچھ نہیں کہتے تھے۔ اپنے گاہکوں کو کبھی اٹھا کر آسمان پر لے جاتے تھے، کبھی نیچے لے آتے تھے۔ پھر ان کا دل ہاتھ میں لے کر مٹھی بند کر لیتے تھے۔ اب آپ ہی کہو کہ یہ سب کچھ ورائٹی شو کے تین منٹ کے گانے میں کہیں ہو سکتا ہے؟ ہم گھنٹوں گاہکوں کا دل بہلاتے تھے اور جب ہم مُجرا ختم کرتے تھے تو کتنوں کے دل گھائل ہو چکے ہوتے تھے، کچھ نہ پوچھو! اب یہ سب اس قدر تیز رفتار شو میں کیسے ہو سکتا ہے جہاں ہر فنکار اپنا 'آئٹم' اس طرح پیش کرتا ہے کہ دوسرے کو نیچا دکھائے۔ یہ آجکل کے شو تو بالکل فضول ہیں۔'' اس نے آہ بھر کر بات ختم کی۔

''اور دلال؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔ ''کیا مطلب؟'' قیصرہ نے حیران ہو کر سوال کیا۔
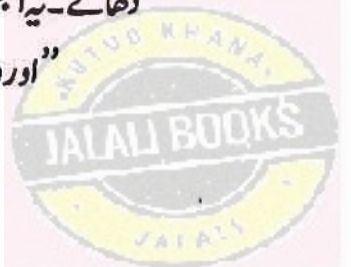
''میرا مطلب ہے... '' میں نے کہا'' اگر مجروں کی دعوت دلالوں کو نہیں ملتی تو پھر... وہ کیا کرتے ہیں؟''

''ہائے! وہ تو کہانی ہی دوسری ہے۔'' قیصرہ نے کہا۔ ''یہ میراثی لڑکے اپنا ہی کاروبار چلا رہے ہیں۔ ہمیں تو مزدوروں کی طرح اجرت دے دیتے ہیں، زمانہ ہی الٹا ہو گیا ہے۔''

''تو آپ یہ قبول کیوں کرتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''قبول نہ کریں تو کھائیں کہاں سے؟'' قیصرہ نے کہا۔ ''مجرے اب ہوتے نہیں۔ ورائٹی شو ہی کا آسرا ہے۔ یہاں جاتے ہیں تو کوئی گاہک بھی مل جاتا ہے۔ ہم نہ جائیں گے تو فوراً کوئی دوسری جھپٹ لے گی۔ میراثی بھی جانتے ہیں کہ اب ہمارے برے دن آگئے ہیں۔''

''کیا اب مجرے بالکل نہیں ہوتے؟'' میں نے پوچھا۔

''کبھی کبھار ہو جاتے ہیں۔ پر اس پر روزگار کا بھروسا تو نہیں کیا جا سکتا۔ اور گاہک بھی بس مریل سے رہ گئے ہیں۔ موٹی اسامیاں تو گلبرگ میں رہنے والیاں اڑانے لگی ہیں۔''

''کیا آپ... میرا مطلب ہے، آپ دلالوں سے رابطہ رکھتی ہیں؟'' میں نے پوچھ ہی لیا۔

قیصرہ منہ پھیر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کہا: ''نہیں! میں تو بس اللہ کی ذات پر بھروسا کرتی ہوں۔ جو اللہ بھیج دیتا ہے وہی ہماری روزی ہے۔ اسی لیے میں نے یہ گھر بھی نہیں چھوڑا۔ کسی دوسرے علاقے میں جا کر رہنا شروع نہیں کیا۔ گھر کو کرائے پر اٹھاؤں گی تو لوگ قبضہ کر لیں گے۔ اس سہارے سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ دنیا سے ایمانداری تو اٹھ ہی گئی ہے۔ میں کہیں جا بھی نہیں سکتی۔ بس خدا کا ہی آسرا ہے۔ وہی مجھے اور میرے گھر والوں کو رزق دے گا... یا اللہ!''

قیصرہ نے جس طرح اچانک گفتگو کو ایک بالکل نیا موڑ دے دیا، اس پر میں چکرا گئی۔ ظاہر تھا کہ وہ دلال کے بارے میں بات چیت نہیں کرنا چاہتی۔ قیصرہ اندر سے کچھ پرانی تصویریں لے کر آئی۔ وہ تصویریں قیصرہ نے میرے سامنے رکھ دیں اور دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ذرا ان تصویروں کو دیکھو!'' اس نے کہا'' کیسے سلیقے سے رہتے تھے ہم۔ تمیزدار، شائستہ... اور اب؟ بھونڈی، گنوار لڑکیاں رہ گئی ہیں یہاں۔ جو فلموں میں نکل گئی ہیں ان کو ہی دیکھ لو۔ تہذیب تو کسی کو چھو کر بھی نہیں گئی ہے۔ توبہ توبہ!!'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا'' ہمیں کیا پتا تھا کہ یہ دن بھی دیکھنے پڑیں گے... یہ کلمویاں ان فلم والوں کو خوش کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتیں... تب کہیں جا کر فلم میں کام ملتا ہے۔ ایسے ہی نہیں مل جاتا...''

''لیکن...'' میں نے کہا۔'' کیا آپ نہیں چاہتیں کہ لیلیٰ بھی فلم میں کام کرے؟''

قیصرہ نے کہا ''میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ اس گھر کی چھت تلے، عزت کی روٹی ملتی رہے۔''

میں دلالوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہ رہی تھی مگر قیصرہ کچھ بتا نہیں رہی تھی۔ اس لیے میں نے سوال کو گھما پھرا کر پھر پوچھا: ''یہ دوسرے خاندان جو یہاں رہتے ہیں، وہ گاہک حاصل کرنے کے لیے دلالوں سے کس طرح رابطہ کرتے ہیں؟''

قیصرہ نے کہا: ''ہائے! میں کیا جانوں؟ میں تو کسی کے گھر آتی جاتی نہیں۔ دوسرے لوگ جانیں اور ان کا کام۔ ہماری ایسی تربیت ہی نہیں ہوئی کہ کسی کے پھڈے میں ٹانگ اڑاتے پھریں۔ تم یہاں کتنے دنوں سے آ رہی ہو۔ کبھی مجھے کسی کے گھر جاتے دیکھا؟ بیٹا! میں کہیں آتی جاتی ہی نہیں جو دوسروں کے بارے میں کچھ جانوں۔''

میں پوچھنا چاہتی تھی کہ شاہد اس دھندے میں کیا کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ زیادہ ٹٹولنے کی کوشش سے کہیں قیصرہ کھل کر بات کرنا بند ہی نہ کر دے۔ ویسے قیصرہ نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا وہ سچ تھا۔ قیصرہ واقعی اس محلے میں زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ اس کے خاندان جیسے کئی خاندان یہاں پولیس سے ہراساں ہو کر، یا دوسری وجوہات کے باعث، یہ محلہ چھوڑ کر گلبرگ جیسے مہنگے اور پُرکشش علاقے میں جا بسے تھے جہاں شہر لاہور کے امیر لوگ رہتے تھے۔

محلے کی جن لڑکیوں کو فلم میں کام مل جاتا ہے۔ ان کے خاندان اس محلے سے اپنا رشتہ فوراً ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اُن کی تمام تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ نئی فلم ایکٹریس کو کسی باعزت گھرانے کا فرد ثابت کریں۔ فلمی صنعت کے کرتا دھرتا اُن سے یہ مطالبہ نہیں کرتے لیکن عوام میں اُن کے ''پرستاروں'' کا جو طبقہ جنم لے لیتا ہے ان کے لیے یہ ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ میں نے ایسے کچھ خاندانوں کو قریب سے دیکھا جو محلّہ چھوڑ کر لاہور کے مہنگے علاقوں مین جا بسے تھے۔ بعض خاندان اس لیے بھی محلہ چھوڑ دیتے ہیں کہ ناچ گانے کے ساتھ دھندہ جاری رکھنے سے بہت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس محلے کے گھرانوں کی نسبت، ان کا دلالوں سے تعلق کہیں زیادہ سودمند اور نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ دلالوں کی بہرحال انہیں بھی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ ہمارے معاشرے میں عورتوں کا براہِ راست گاہک کو راغب کرنا ایک تو محفوظ نہیں، کیونکہ پولیس کا خطرہ رہتا ہے اور دوسرا کاروباری لحاظ سے بھی اچھا نہیں۔

گلبرگ سے دھندا کرنے والے خاندانوں کا کاروبار کافی حد تک دلال کی مرضی کے مطابق چلتا ہے۔ اگر طوائف تعلیم یافتہ ہو تو دلال سے اس کی بہتر سانجھے داری ہو جاتی ہے، لیکن اگر وہ سب کچھ دلال پر ہی چھوڑ دے تو ایسی صورت میں وہ بالکل دلال کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ نائیکہ اور دلال کا باہمی رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ یہاں طاقت اور اختیار کا توازن اکثر بدلتا رہتا ہے۔ اکثر یہ

تعلق کارآمد ساجھے داری نظر آتا ہے لیکن زیریں سطح پر اصل اختیار حاصل کرنے کی پرزور کشمکش جاری ہوسکتی ہے۔ اس تعلق کی نوعیت نائیکہ اور دلال کی منفرد شخصیت پر منحصر ہوتی ہے۔

دلال ایک یا ایک سے زیادہ خاندانوں کو گاہک فراہم کرتا ہے۔ گلبرگ میں رہنے والے کنجر خاندانوں کے دلال ان کے گھر کے ایسے افراد کی طرح ہوتے ہیں، جن کی نیت پر پورا اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ لاہور کے کئی علاقوں میں اب ایسے چکلے وجود میں آ گئے ہیں جہاں بسنے والے گھرانوں میں دلال کاروبار پر پوری طرح قابض ہیں۔

ان طوائفوں کے گاہک ہر طبقے سے آتے ہیں۔ ان میں سیاست داں سے لے کر عام دکاندار تک شامل ہیں۔ یہ گاہک لاہور کے نواحی علاقوں میں ایسی جگہوں پر جاتے ہیں جہاں انہیں کسی دلال سے مڈھ بھیڑ ہونے کی توقع ہوتی ہے۔ (اس مقصد کے لیے ان مقامات کی شہرت شہر میں موجود ہے)۔ بعض بس اسٹاپ یا بازار اس بات کے لیے جانے پہچانے اور مشہور ہیں۔ لیکن طوائفوں کا گاہک کو خود پٹانا اتنا کھلے بندوں نہیں ہوتا جیسا کہ مغربی ممالک میں عام دستور ہے۔

شاہی محلے میں گاہک دوست احباب کو ساتھ لے کر آتے ہیں۔ اگر گاہک کو کوئی طوائف بھا جائے تو اکثر وہ وقت طے کر کے دوبارہ اکیلا آتا ہے۔ بعض اوقات اس کے دوست اسے کچھ دیر کے لیے کوٹھے پر چھوڑ کر کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ دھندے کے لیے اکثر کوٹھے پر ایک علیٰحدہ کمرہ دستیاب ہوتا ہے۔ یہاں صرف مرد آتے ہیں۔ کوئی عورت کبھی یہاں نہیں آتی۔ غیر ملکی سیّاح عورتیں البتہ کبھی کبھی یہاں تجسس کے باعث گھومتی پھرتی نظر آجاتی ہیں۔ (یا پھر ایسی کوئی دیوانی... جو یہاں تحقیق کرنے کی ٹھان لے!)

قیصرہ نے اپنے ملازم گوبا سے پاندان منگوایا۔ گوبا عجب طرح لہراتا ہوا چلتا تھا۔ اس کا بدن ایک سمت جھکا رہتا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا، اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے چلتا۔ چلتے ہوئے اس کا سر سامنے کی طرف جھکا ہوا، ہاتھی کی سونڈ کی طرح جھومتا رہتا تھا۔ وہ پاندان لایا تو قیصرہ نے ایک پان اپنے لیے بنایا اور دوسرا مجھے پیش کیا۔ میں نے قیصرہ سے پوچھا: ''یہ گوبا کون ہے؟ یہ ایسا کیوں ہے؟''

قیصرہ نے پوچھا: ''ایسا؟ کیا مطلب؟''

میں نے دروازے کی طرف دیکھ کر اطمینان کیا کہ وہ جا چکا ہے۔ پھر کہا: ''ایسا... آپ سمجھ گئیں نا... یہ نارمل تو نہیں لگتا؟''

''ہمارا دور کا رشتے دار ہے۔'' قیصرہ نے کہا ''جن آتا ہے اس پر۔ جن دا سایہ اے ایدے تے... (جن کا سایہ ہے اس پر) یہ بچپن سے ہی ایسا ہے۔ اس کو دوسرے بچے مارتے تھے تو یہ ہنستا

رہتا تھا۔ جھلا ہے۔ میری ماں کی ایک دور کی رشتہ دار کنجری تھی، یہ اُسی کا بیٹا ہے۔ اس نے ایک میراثی سے شادی کر لی تھی۔ اب تم جانو، یہ کتنے شرم کی بات ہے۔ خاندان کی تو ناک کٹ جاتی ہے... مٹی میں مل جاتی ہے آبرو۔ اس کے گھر والے اسے زبردستی واپس لے آئے، مگر تب تک وہ پیٹ سے ہوگئی تھی۔ تب یہ گوبا پیدا ہوا۔ مگر اس کی ماں نہیں بچی۔ اللہ جانے آپ ہی مرگئی کہ گھر والوں نے مار کر جان چھڑائی۔ خاندان والوں نے کچھ برس تو پالا مگر سب اس پر پھٹکار بھیجتے تھے۔ کہتے تھے ماں کی بدچلنی کی نشانی ہے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ اس نے کام ہی ایسا برا کیا تھا جس کی سزا میں بچہ ایسا پیدا ہوا۔ میرے ابا جی کا دل اچھا تھا۔ ایک بار اُن کے گھر گئے تو گوبا کو ساتھ لیتے آئے۔ میری اماں بڑی ناراض ہوئی کہ ایک اور بندے کو مفت میں کھلانا پڑے گا۔ مگر ابا جی نے کہا کہ نیک بخت! تیری بیٹیوں کا کام کاج کر دے گا۔ ابا جی ہم سے بڑا پیار کرتے تھے۔ بس تب سے یہ ہمارے ہی گھر میں ہے۔ گھر میں کام کرتا رہتا ہے۔ اس کا دماغ شاغ نہیں ہے، مگر گھر کا کام کاج جانتا ہے۔ کسی کو پیغام بھیجنا ہو تو جا کر کہہ دے گا۔ سبزی کاٹ دیتا ہے، جمیلہ کے لیے بازار سے سودا لے آتا ہے۔ یہ کام ٹھیک کر لیتا ہے کیونکہ چار برس کی عمر سے کر رہا ہے۔ اتنی ہی عمر میں آیا تھا ہمارے گھر...''

سو اس محلے میں مردوں کا ایک الگ ہی کردار تھا۔ گاہک، سازندے اور دلالوں کے زیادہ مخصوص کردار تھے، مگر دوسرے مرد بس گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے تھے یا پھر فارغ پھرتے رہتے تھے۔ جن کی سمجھ بُوجھ کم تھی وہ گوبا کی طرح ساری عمر گھر کے کام کاج کرتے اور جن میں سمجھ بوجھ ہوتی وہ جیسے ہی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوتے گھر سے بھاگ جاتے۔

باب ۲۰

کوٹھے اور کوٹھی خانے

شاہی محلے کے روایتی پیشے میں اب جو تبدیلیاں آ رہی تھیں اُنکو سمجھنے کے لیے مجھے مزید معلومات کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے محمود کنجر سے رابطہ کیا اور اس کے ساتھ چند کوٹھوں پر جانے کا منصوبہ بنایا۔ محمود نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے ساتھ اپنا ایک دوست بھی لائے گا۔ میں نے ہامی بھرلی۔

مقررّہ روز وہ دونوں سفید کلف لگے، کڑکڑاتے کپڑوں میں آ پہنچے اور میں ان کے ساتھ چل دی۔ محمود کا یہ دوست بھی محلے کا دلال تھا۔ لیکن اس دن وہ دونوں میرے دائیں بائیں اس طرح سینہ پھلائے شان سے جا رہے تھے جیسے دو حاکم اپنے علاقے کے معائنے پر نکلے ہوں۔ ''دو لمبے تڑنگے جوانوں کے بیچ کیا میں بالکل حقیر، چھوٹی سی چیز لگ رہی ہوں؟'' میں نے سوچا اور خود بھی تن کر چلنے لگی تا کہ میرا پانچ فٹ دو انچ کا قد کچھ تو دراز نظر آئے۔

محمود نے مجھے بتایا کہ اس کا دوست مجھے نچلی منزل کے ایک ''کوٹھے'' پر لے جا رہا ہے جو بازار کی وسطی سڑک پر ہے اور جہاں کچھ نوجوان رقاصائیں رہتی ہیں۔ چند کشادہ سیڑھیاں طے کرتے ہوئے ہم کافی کشادہ دروازوں تک جا پہنچے جو کوئی پانچ فٹ چوڑے ہونگے۔ ہم اندر داخل ہونے لگے تو ایک کم سن لڑکے نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس کے ہاتھ میں پتلی سی ڈنڈی تھی جس پر بہت خوبصورت پھولوں کے ہار ٹنگے ہوئے تھے۔ محمود کا دامن کھینچ کر اُس نے التجا کی۔ ''آج مجھ سے ہار خرید لونا!''

محمود نے مسکرا کر کہا۔ ''اچھا۔ اندر بھیج دینا۔'' ہم اندر داخل ہو گئے۔ میری نظر ایک چھوٹے سے لڑکے پر پڑی جو ایک شیشے کا ڈھکنے والا ڈبہ لیے بیٹھا تھا جس میں روپے روپے کے نوٹوں کی گڈیاں رکھی تھیں۔ گاہک کو بڑے نوٹ بھنانا اس طرح آسان ہو جاتا ہے۔ لڑکے کی عمر کوئی بارہ برس رہی ہوگی۔ گاہک کم مالیت کے نوٹ نچھاور کرنا پسند کرتے ہیں تاکہ مال آہستہ آہستہ نکلے اور ناچنے والیوں کو بھی ادائیں دِکھا دِکھا کر پیسے نکلوانا بہت اچھا لگتا ہے۔

اندر ایک تیسرے آدمی نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ مونچھیں تو اس کی بھی بڑی بڑی تھیں مگر وہ میرے ساتھیوں جتنا لمبا چوڑا نہ تھا۔ اس نے ہمیں صوفوں پر بٹھایا اور اندر سے کسی گانے والی کو بلانے کے لیے چلا گیا۔ کمرے میں قالین پر چاندنیوں کا فرش لگا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک آٹھ برس کا بچہ ہمارے لیے باہر کی دکان سے ٹھنڈے مشروب لے آیا۔ پھولوں والا بچہ چپکے چپکے اندر جھانک رہا تھا جیسے اندر آنے میں جھجک رہا ہو۔ محمود نے جب مجھے اس کی طرف دیکھتے پایا تو اس نے مسکرا کر لڑکے کو اندر بلا لیا اور اس سے دس ہار خرید لیے۔ دو ہار اس نے مجھے پیش کیے اور باقی اپنی کلائی پر لپیٹ لیے۔ لڑکے نے تشکر بھری مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور پھر ایک کونے میں بیٹھ کر ناچ گانا شروع ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہمارا میزبان ایک دبلی پتلی، نازک سی لڑکی کو لے کر واپس آیا۔ لڑکی کی عمر بہ مشکل تیرہ برس کی ہوگی۔ اس نے ضرورت سے زیادہ میک اپ تھوپ رکھا تھا۔ وہ اسکول کی ایسی لڑکی لگ رہی تھی جو بڑے ہونے کا بہروپ بھر رہی ہو۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اس کے چہرے کو اور بھی معصوم بنا رہی تھیں۔ اس نے ہمیں آداب کیا مگر کسی سے نظر نہ ملائی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ لڑکی اس محلے کی پلی بڑھی نہیں ہے۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی شلوار اور قمیض پہنے تھی اور دوپٹہ دونوں شانوں پر پھیلا تھا۔ وہ آ کر چاندنی پر بیٹھ گئی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ میری طرف دیکھے، تاکہ میں مسکرا کر اس کی گھبراہٹ دور کرنے کی کوشش کرسکوں۔ لڑکی کے پیچھے پیچھے تین سازندے بھی آ گئے۔ ان میں ایک ہارمونیم نواز، ایک طبلچی اور تیسرا نال بجانے والا تھا۔

جب میزبان مرد نے اسے گانے کے لیے کہا تو اس نے دبی ہوئی آواز میں پوچھا ''کیا سناؤں؟''

اس پر مرد نے کرخت آواز میں زور سے کہا ''مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو۔ مہمانوں سے پوچھو۔''

لڑکی نے ہماری طرف رخ کر کے اسی آواز میں ہماری طرف دیکھے بغیر اپنا سوال دہرایا۔

محمود نے کہا: ''کوئی اچھی سی غزل ہو جائے۔'' پھر اس نے میزبان سے کہا: ''ہماری مہمان اسلام آباد سے آئی ہیں۔ موسیقی کا بڑا ذوق رکھتی ہیں۔'' میزبان یہ سن کر ہنسا۔

لڑکی نے نگاہ اٹھائے بغیر گانا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ گاہے گاہے وہ مصنوعی انداز میں مسکرانے لگتی تھی، جیسے اپنا خوف چھپانا چاہتی ہو۔ محمود نے کچھ رقم اس کے آگے ڈال دی، لیکن میری ہمت نہ پڑی کہ اس کے آگے پیسے رکھوں۔ اس نے گانا ختم کیا تو میں اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھی۔ اس نے میری جانب تجسس بھری نگاہوں سے دیکھا۔ شاید اسے صرف موٹے تازے مردوں کی بوالہوس قربت ملتی رہی تھی۔ شاید میں وہ پہلی عورت تھی جو اس کا گانا سننے آئی تھی۔ میں نے پیار سے کہا: ''تم بہت اچھا گاتی ہو۔'' اس نے اتنی دھیمی آواز میں میرا شکریہ ادا کیا کہ مجھے ٹھیک سے سنائی بھی نہ دیا۔ ''کیا خوب ریاض کرتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

لڑکی نے نفی میں سر کو جنبش دی مگر مرد بیچ میں بول پڑا: ''ہاں جی! خوب ریاض کرتی ہے۔ میں کرواتا ہوں ریاض۔ محنت سے ہی ہنر حاصل ہوتا ہے جی۔ ہم نے اس کے لیے ایک استاد بھی رکھا ہوا ہے۔'' میں نے محسوس کیا کہ لڑکی سے میرے براہِ راست مخاطب ہونے پر وہ اکھڑ سا گیا۔ اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں بعد میں کبھی اس لڑکی سے بات چیت کر سکتی ہوں؟

یہ سن کر وہ اور بھی چکرایا۔ معاملہ سمجھنے کے لیے اس نے محمود کنجر کی طرف دیکھا۔ محمود سپاٹ چہرہ لیے بیٹھا آنکھیں جھپکاتا رہا، گویا کہہ رہا ہو۔ ''جو تمہاری مرضی۔ فیصلہ خود کرو۔'' اس پر وہ فوراً کہنے لگا: ''یہ جی دیر سے اٹھتی ہے۔ پھر اسے ریاض کرنا ہوتا ہے۔ بڑی تنگی ہے وقت کی۔ ویسے آپ آ جائیں۔ دیکھیں گے۔''

اس کا جواب دوٹوک تھا۔ یہی انکار کا تہذیب سے نزدیک ترین طریقہ ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد جب محمود نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کچھ اور سننا پسند کروں گی تو میں نفی میں سر ہلا کر کھڑی ہو گئی۔

''نہیں اب چلنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

میں نے شاہی محلے میں ''کوٹھی خانوں'' کے بارے میں سن رکھا تھا، جہاں دلال نوجوان لڑکیاں لاتے اور ان سے پیشہ کرواتے تھے۔ نائیکاؤں نے مجھے بتایا تھا کہ روایتی طریقے میں تو لڑکی اپنے رشتے داروں کے ساتھ رہتی ہے اور اگر لے کر پالی ہو تو تب بھی اس کے ساتھ سارے رشتے جوڑے جاتے ہیں۔ گھر والے اُسکی تعلیم کا بندوبست کرتے ہیں۔ اسے ناچ گانا سکھاتے ہیں اور وہ بچپن سے ہی اس پیشے کے اتار چڑھاؤ سے واقف ہوتی ہے۔ روایتی کوٹھے میں ایک نائیکہ کاروبار سنبھالتی ہے جبکہ جس کوٹھی خانے پر میں محمود کے ساتھ گئی تھی وہاں دلال یہ کاروبار بہت مختلف طریقے سے کرتے ہیں۔ وہ کئی جگہ سے لڑکیاں اکٹھی کر لیتے ہیں اور خود کوٹھا چلاتے ہیں۔ یہ لڑکیاں دلال پال

پوس کر بڑی نہیں کرتے بلکہ تیرہ چودہ برس کی لڑکی لائی جاتی ہے اور فوراً کام سے لگا دی جاتی ہے۔ یہ میرا مشاہدہ بھی تھا کہ روایتی کوٹھوں میں بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور بچے بھی اور ایک طرح بالکل گھریلو ماحول ہوتا ہے۔ جبکہ جن ''کوٹھی خانوں'' کو مرد چلاتے ہیں وہاں ایک سنگین بے حسی طاری نظر آتی ہے۔

کوٹھے کا روایتی ماحول قائم کرنے کے لیے یہ دلال بعض اوقات کسی بڑی عمر کی عورت کو بھی رکھ لیتے ہیں لیکن اس کا تعلق صرف کاروباری ہوتا ہے۔ وہ رقاصہ کو کسی قسم کا پیار یا سہارا نہیں دے سکتی۔ نائیکاؤں کے کہنے کے مطابق، جو ''کوٹھی خانے'' مرد چلاتے ہیں وہاں رقص و موسیقی کا تکلف شاذ ہی کیا جاتا ہے اور تمام سرگرمیاں جسم فروشی تک محدود رہتی ہیں۔

روایتی پیشہ کرانے والی خواتین ''کوٹھی خانوں'' سے نفرت کرتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حکومت کے کارندے شاہی محلے کے قدیم، وضع دار باسیوں کو ہراساں کر کے ایک طرح ان ''کوٹھی خانوں'' کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ مرد دلال سارا انتظام اس طرح کرتے ہیں کہ اگر پولیس پریشان کرے تو کوٹھے کو فوراً بند کر کے کہیں اور یہی سلسلہ قائم کیا جاسکے۔ ان کے کہنے کے مطابق، اس رویے کے باعث سفاک دلالوں کی بن آئی ہے جن کو روایتوں کا قطعی پاس نہیں۔ وہ بالکل کم اخراجات کے ساتھ خوب پیسہ بناتے ہیں۔ وہ عورت کو کسی خاطر میں نہیں لاتے اور نہ اس کا کسی طرح خیال رکھتے ہیں۔ کسی بھی عورت سے اچھی طرح پیسہ نچوڑ کر وہ اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکتے ہیں۔ جبکہ روایتی کوٹھوں میں طوائف کو جوانی ڈھلنے پر رفتہ رفتہ نائیکہ بننے کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ اس کا بڑھاپا خوار نہ ہو۔

ان خاندانوں میں نوجوان لڑکیوں پر کاروبار شروع کرنے کے لیے دباؤ تو ضرور ڈالا جاتا ہے لیکن یہ بھی ان کی تربیت کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ ان گھرانوں میں ایک عمر رسیدہ طوائف کو بھی وہ سارے انسانی وسائل مہیا ہوتے ہیں جن کی مدد سے پُرسکون زندگی گزاری جاسکتی ہے۔

شاہی محلے کے روایتی نظام کی بقا چاہنے والوں کا دعویٰ ہے کہ ان گھرانوں میں ہر بیٹی کا طوائف بننا لازمی نہیں۔ بعض لڑکیوں کی شادیاں کر دی جاتی ہیں اور وہ کہیں اور جا بستی ہیں، جبکہ بعض محلے میں ہی رہتی ہیں اور صرف خاندان چلانے کا کام کرتی ہیں یعنی گھرانے کے لیے اولاد پیدا کرتی ہیں۔ یہاں طوائف کو رشتہ داروں کی محبت اور گرمجوشی میسر ہوتی ہے۔ صرف خاندان ہی نہیں، پوری برادری اس کی مدد کے لیے موجود ہوتی ہے۔

ایک دن قیصرہ سے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے میں طوائفوں کو درپیش مسائل کا ذکر چھیڑ بیٹھی۔ میں نے کہا: ''نائیکاؤں اور ماؤں کے ساتھ نوجوان طوائفوں کی نہیں بنتی۔ میں نے جتنی

طوائفوں سے باتیں کیں ان میں کچھ بہت ناخوش ہیں۔ انہیں اپنا آپ اس پیشے میں جکڑا ہوا محسوس ہوتا ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ انہیں اُنکی مرضی کے خلاف اس کام میں دھکیلا گیا ہے۔"

قیصرہ جانے کب کی بھری بیٹھی تھی کہ پھٹ پڑی۔ کہنے لگی: "بی بی! سارے عیب آپ لوگوں کو ہمارے نظام میں ہی نظر آتے ہیں؟ شریفوں کے خاندانوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا! تم اپنے نظام کی تو پہلے بات کرو! کیا ہم جانتے نہیں؟ وہاں عورت کی کون سی وقعت ہے؟ کسی لڑکی کی شادی اُس کی مرضی سے کی جاتی ہے؟ یہاں لڑکی کو زبردستی گاہک کے حوالے کیا جاتا ہے تو وہاں زبردستی شوہر کے حوالے نہیں کیا جاتا؟ لمبی لمبی داڑھیوں والے بڈھے، کیا سگی بیٹیوں کو خراب نہیں کرتے؟ ان شریف گھرانوں کے گھر کی بہو بیٹیاں نہیں بھاگتیں؟ طلاقیں نہیں لیتیں اور کتنی ہی تو بے چاریاں خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے زہر کھا لیتی ہیں۔ بس! اب میرا منہ نہ کھلواؤ۔ مگر ہم تو نہیں کہتے کہ آپ لوگ شادی بیاہ کر کے گھر بسانا چھوڑ دیں۔ آپ شرفا کے نظام میں اتنے مسئلے ہیں تو کیا میں یہ کہوں کہ آپ کا نظام ختم ہو جانا چاہیے۔"

پھر کچھ رک کر کہنے لگی: "جنہیں تم مسائل کہتی ہو بی بی فوزیہ! وہ تو ہر جگہ ہیں کیونکہ دنیا میں ہر طرح کا آدمی ہے۔ مسئلے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ نظام ہی غلط ہے۔ ماں پیو تو ہر جگہ بچوں کے بھلے کی ہی سوچتے ہیں۔ مگر اولاد ہمیشہ یہی سمجھتی ہے کہ ہمارے اوپر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔"

میں گم سم بیٹھی اس کی باتیں سُن رہی تھی۔ پھر میں نے سنبھل کر کہا: "اس میں کیا شک ہے۔ ہمارے معاشرے میں، خاندانوں میں زبردستی سے کام بے شک لیا جاتا ہے لیکن ان خامیوں کو دور کرنے کی کوششیں بھی کی جاتی ہیں۔ جتنی برائیوں کا آپ نے ذکر کیا، انہیں ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اولاد اور والدین ایک دوسرے کی بات اور نکتۂ نظر سمجھیں... کاروکاری جیسی غلط روایات کا خاتمہ ہو، یہ سب کوششیں جاری ہیں..."

قیصرہ بولی "تو ہم بھی خامیاں دور کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں جی! مگر آپ تو کہتے ہیں کہ بند کرو جی اس محلے کو۔ نتیجہ کیا ہے؟ کام تو وہی چلتا ہے مگر حرامخور دلالوں کے ہاتھوں میں پڑ جاتی ہیں لڑکیاں... ہمارے یہاں تو عورت کی گھر بار میں بڑی حیثیت ہے۔ اس کی مرضی سے سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر سرکار تو ہمارے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ دلالوں کا راج ہو گیا ہے یہاں... میں پوچھتی ہوں کہ رنڈی کی عمر ڈھل جائے تو کوئی دلال اُلٹ کر خبر بھی لیتا ہے اُس کی؟"

"لیکن کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "روایتی کوٹھوں کی جگہ یہ کوٹھی خانے کیوں قائم ہوتے جا رہے ہیں؟"
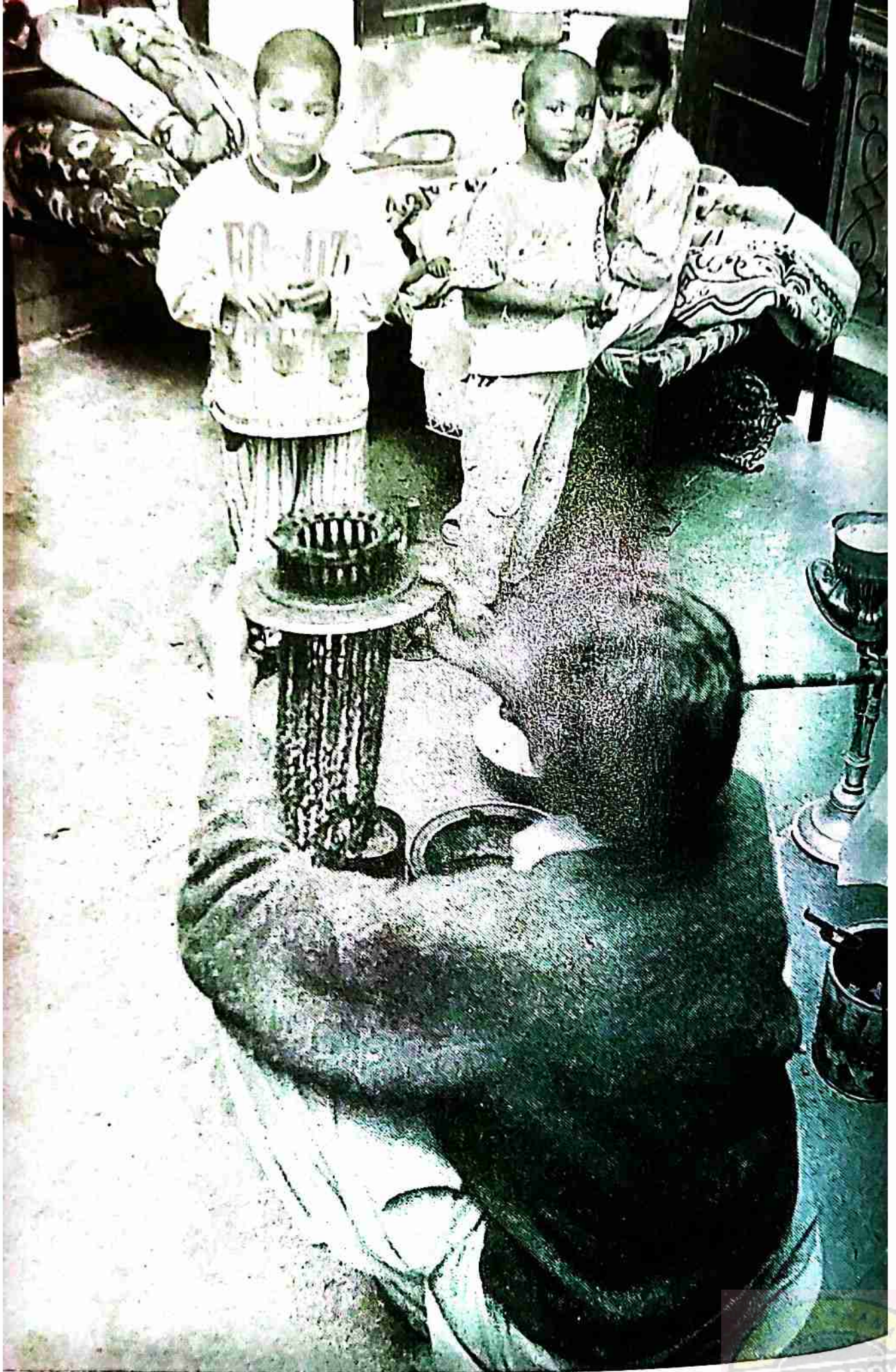
گھر کا بیشتر کام کاج مردوں کی ذمہ داری ہے۔ ایک مرد تیل کے چولہے میں بتیاں ڈالتے ہوئے۔

بچوں کی دیکھ بھال گھروں میں عموماً مردوں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

کھانا پکانا اور دیگر گھریلو کام کاج عموماً گھر کے مرد یا بہوئیں کرتی ہیں۔

اس محلے میں مردوں کے لیے روزگار کے بہت تھوڑے مواقع ہیں جن میں پھول، سگریٹ اور کپڑا بیچنا شامل ہیں۔
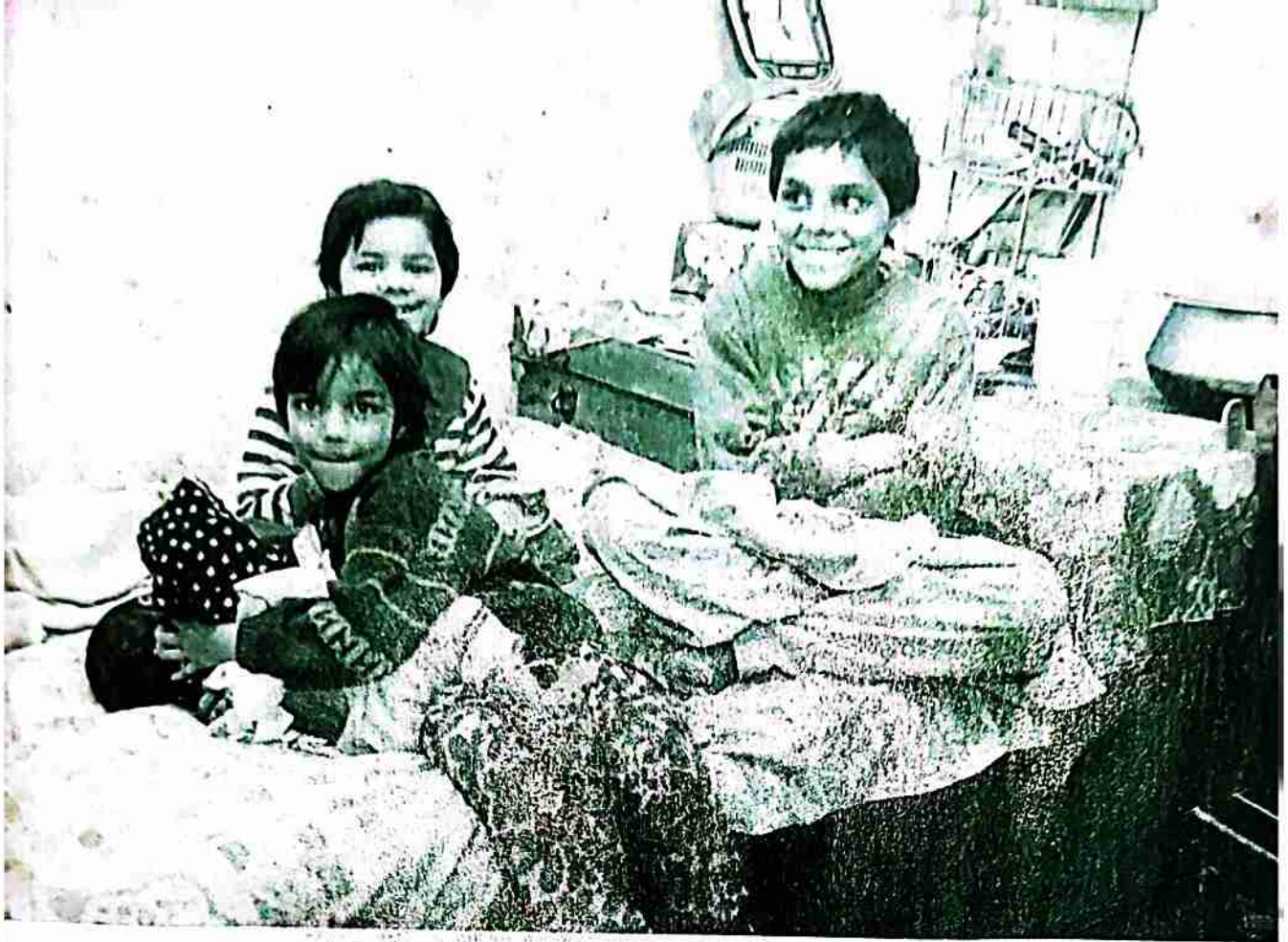
محلے میں بیٹوں کی نسبت بیٹیوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

کنجر (طوائف) خاندانوں کی نسبت میراثی (موسیقار) خاندانوں میں مردوں کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔

قیصرہ نے کہا: ''کنجروں کی برادری ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کی سب مدد کرتے ہیں۔ ہمیں پریشان کر کے محلے سے نکالا جاتا ہے۔ پھر جدھر جس کا سر سمائے وہیں جا بستا ہے۔ جدی پشتی ساتھ چھوٹ جاتا ہے۔ دوسرے علاقوں میں جا کر رہنا شروع کرتے ہیں تو گانے ناچنے کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر گاہک کو کیسے لبھائیں؟ لے دے کر وہی دلال رہ جاتے ہیں۔ محلے میں بھی ہماری جگہ یہ لے رہے ہیں اور باہر بھی ہمیں ان کے ذریعے ہی دو وقت کی روٹی مل سکتی ہے۔ بعض خاندانی طوائفیں کشتیاں بن کر گلی گلی گھومنے پر مجبور ہوگئی ہیں۔ میں کہتی ہوں یہ کس قسم کا سماج سدھار ہے؟ جب یہ پیشہ ہم کرتی تھیں تو بس یہ ہمارا ہی کام تھا۔ اب تو ہر خاندان اور ہر گھرانے کا دلاّ کاروبار میں گھس بیٹھا ہے۔ یہ تو اتنی دولت کماتے ہیں کہ کسی کنجر نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔''

''اوہ!'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ بھی... یہ محلہ کبھی چھوڑ دیں گی؟''

قیصرہ نے کہا: ''اُس دن سے پہلے مجھے موت آ جائے تو اچھا ہوگا...۔'' پھر بولی: ''بات صرف جائیداد کی نہیں ہے۔ یہاں سے نکل کر سب کی بربادی ہوگی۔ میں تو بھوکی مر جاؤں گی مگر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ ایہہ بھیڑے یزید کِنّے وی ظلم کرن! (یہ ظالم یزید کتنے بھی ظلم کریں!)''

کوٹھی خانوں کا رواج جنگل کی آگ کی طرح واقعی پھیل رہا ہے۔ جب کاروباریوں بھی چل سکتا ہے تو روایتی کوٹھوں کے تکلفات میں کون پڑے جس میں وقت بھی درکار ہے اور محنت بھی زیادہ لگتی ہے۔ اس نئے طریقۂ کار میں صرف دو باتوں پر زور دیا جاتا ہے۔ عورتوں کو بھرتی کرنا اور گاہک پکڑنا... دونوں مقاصد کے لیے رابطوں کا وسیع سلسلہ درکار ہوتا ہے۔

یہ بات واضح نہیں ہے کہ عورتیں اور لڑکیاں کس طرح لائی جاتی ہیں۔ اس کے بارے میں جو داستانیں مشہور ہیں وہ اس پیشے سے منسلک افسانوی باتیں لگتی ہیں۔ دلال یا ان کے ہرکارے کسی گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو پھنسا لیتے ہیں۔ کوئی بھی مصیبت زدہ لڑکی جو مدد لینے سے انکار نہ کر سکے ان کے جال میں آسانی سے پھنس جاتی ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ چکلوں میں لے آتے ہیں۔ رکشا والوں کو پیسے دے دلا کر بھی یہ کام کروایا جاتا ہے جو نوجوان لڑکیوں کو زبردستی یہاں لے آتے ہیں۔ بعض مرد گاؤں کی لڑکیوں سے شادی ہی اس مقصد سے کرتے ہیں کہ انہیں شہر میں لا کر دلالوں کے ہاتھ بیچ دیں۔ ہماری فلموں وغیرہ میں یہی کہانیاں دہرائی جاتی ہیں۔ ان میں کوٹھی خانوں کے طریقۂ کار کا عکس جھلک سکتا ہے لیکن شاہی محلے میں ایسا شاذ ہی ہوتا ہے۔

کوٹھی خانوں میں عورتوں کو لانے کے چار بنیادی طریقوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے:

سب سے عام طریقہ تو یہ ہے کہ شادی کر کے عورت کو سوات یا علاقہ غیر سے لایا جائے۔ اس

علاقے میں رقم دے کر دلہن حاصل کرنے کا رواج ہے لیکن یہ عام غلط فہمی ہے کہ لڑکیاں فروخت کی جاتی ہیں۔ درحقیقت دولہا شادی کے اخراجات اٹھاتا ہے اور خاندان کو ایک کارآمد فرد سے محروم کرنے کا تھوڑا بہت عوضانہ دیتا ہے۔ شادی کے بعد وہ دلہن کے نان نفقے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس رواج کی جڑیں مشرقِ وسطیٰ میں ہیں۔ پاکستان کے شمالی سرحدی علاقوں اور بلوچستان کا قبائلی نظام مشرقِ وسطیٰ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اس کے برعکس پنجاب اور سندھ کی تہذیب برصغیر سے منسلک ہے اور یہاں لڑکی کے ساتھ جہیز دینے کا رواج ہے جس میں زیور کپڑے کے ساتھ ساتھ گھر بسانے کی تمام اشیائے ضرورت، بستر، برتن بھانڈے، فرنیچر، سب کچھ شامل ہوتا ہے۔ بعض اوقات دولہا کے کاروبار کے لیے نقد رقم بھی دی جاتی ہے۔

پاکستان میں کیونکہ پنجابیوں اور ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کی ثقافتی بالادستی قائم ہے، اس لیے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ جہیز کا رواج مہذب ہونے کی علامت ہے۔ لڑکی کے خاندان کو عوضانہ دینا شرم کی بات سمجھی جاتی ہے۔ اب تو صوبہ سرحد میں بھی تعلیم یافتہ خاندان اصرار کرتے ہیں کہ وہ بیٹی کے عوض ہرگز کوئی رقم نہیں لیتے۔ اس طرح وہ بالادست سماج کے دباؤ میں آ کر اپنا صدیوں پرانا رواج ختم کر کے جہیز دینے کی اس سے بدتر رسم اپنا رہے ہیں۔

مگر پنجاب کے مرد سرحدی اور قبائلی رواج کا بالکل غلط مطلب سمجھتے ہوئے اسے قابلِ مذمت طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ سوات جیسے علاقوں میں جا کر دلہن ڈھونڈنے کا سوانگ رچاتے ہیں۔ یہ ناٹک اکثر کامیاب ہو جاتا ہے۔ سوات میں یہ طریقہ اور بھی کارگر رہتا ہے کیونکہ وہاں شادی کے بعد بیٹی سے خیر خبر کا زیادہ رواج نہیں ہے۔ اس طرح حاصل کی جانے والی عورتوں کو خفیہ مقامات پر رکھا جاتا ہے اور انہیں اپنے خاندان سے رابطہ نہیں کرنے دیا جاتا۔

دوسرا طریقہ ایجنٹوں کے ذریعے عورتیں پھنسانے کا ہے۔ یہ ایجنٹ عورتوں کے ہاسٹلز، بے سہارا عورتوں کے اداروں اور غریب علاقوں میں عورتیں تلاش کر کے ان سے رابطہ کر لیتے ہیں۔ وہ ان علاقوں میں گشت کرتے ہیں اور بعض صورتوں میں عورت سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ کسی ادارے کی انتظامیہ کا کوئی فرد ان سے گٹھ جوڑ کر لیتا ہے۔

یہ ایجنٹ کسی ایک بااثر گاہک یا گاہکوں کے گروہ سے رابطہ رکھتے ہیں۔ سیاسی حیثیت رکھنے والے گاہکوں کو خدمات اسی طرح فراہم کی جاتی ہیں۔ اس طرح ایجنٹ پولیس کے پنجے سے بھی محفوظ رہ سکتا ہے کیونکہ سماج میں اثر و رسوخ رکھنے والا گاہک پولیس سے خود نمٹ لیتا ہے۔ اس طریقۂ کار میں کوئی صاحبِ حیثیت شخص ایجنٹ سے کہہ سکتا ہے کہ مثلاً فلاں ایئر ہوسٹس یا کالج کی طالبہ کو حاصل

کیا جائے۔ اس طرح ایجنٹ سرکاری نظام کو پوری طرح استعمال کرتے ہوئے مقصد برآوری کی کوشش کرتا ہے۔ پاکستان میں ستر کی دہائی میں یہ قاعدہ نمودار ہوا اور بعد میں سیاست داں اور ان کے عزیز واقارب سرکاری ذرائع استعمال کر کے اپنی ہر خواہش پوری کرتے رہے۔

تیسرا طریقہ عورت کو محبت کا فریب دے کر پٹانا ہے۔اس طریقۂ کار کے بارے میں اور محققین نے بھی لکھا ہے۔ ایجنٹ یا دلال کسی لڑکی کو محبت کا فریب دے کر اسے اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے اور اسے اپنے ہی خاندان کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔عام طور پر وہ اسے محبت کی خاطر گھر سے بھاگ جانے کو کہتا ہے۔اس طرح لڑکی خود اپنے قریبی رشتوں کو اپنا دشمن بنا لیتی ہے اور ایجنٹ کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اس ''محبوبہ'' سے جنسی تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر وہ لڑکی اپنے آپ کو سماجی طور پر کمزور سمجھنے لگتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بکارت پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ کنوار پن گنوانے کے بعد لڑکی محسوس کرتی ہے کہ اب اس کے لیے معاشرے کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں اور اس کی موت و زندگی صرف اس مرد کے ہاتھ میں ہے جس کے ساتھ وہ جنسی تعلق قائم کر بیٹھی ہے۔ یہ ''سانحہ'' اکثر ہماری فلموں میں بھی دکھایا جاتا ہے۔

ایجنٹ لڑکی کی نفسیاتی حالت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے ''بھگا'' لے جاتا ہے۔لڑکی پوری طرح ایجنٹ کے قابو میں آ چکی ہوتی ہے اور وہ اس سے پیشہ کروانا شروع کر دیتا ہے۔

لڑکیاں چکلوں میں لانے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ ایجنٹ ہمیشہ کسی سماوی یا انسان کی لائی ہوئی آفت سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب زندگی کے تانے بانے بکھر جاتے ہیں تو یہ گھبرائی ہوئی اور جان بچاتی ہوئی لڑکیوں کا شکار کرتے ہیں۔ میری تحقیق کے آغاز کے زمانے میں، راولپنڈی کے اوجھڑی کیمپ والا سانحہ ہوا تھا جب بارود کے ڈپو میں آگ بھڑک اٹھی تھی اور اسلام آباد اور راولپنڈی کے باسیوں پر اچانک میزائلوں کی بارش ہوگئی تھی۔ اس دن میں لوک ورثہ کے دفتر میں بیٹھی تھی۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا تھا کہ جنگ شروع ہوگئی ہے۔کوئی گھنٹے بھر تک ہمارے چاروں طرف دھماکے ہوتے رہے تھے۔ اسلام آباد اور راولپنڈی میں بے حد بحرانی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ یہ ایسی ناگہانی آفت تھی کہ لوگ حواس باختہ ہوگئے تھے۔ والدین دفاتر سے فوراً اپنے بچوں کے اسکولوں اور کالجوں کی طرف روانہ ہوگئے تھے تاکہ بچوں کو ان عمارتوں سے نکالا جا سکے۔

اسکولوں کے دروازے عام طور اسی وقت کھولے جاتے ہیں جب والدین طلبا اور خصوصاً طالبات کو لینے کے لیے آ جائیں لیکن اس دن اسکولوں کے گیٹ کھول دیے گئے تھے۔ گھبرائی ہوئی لڑکیوں نے کسی بھی گاڑی میں بیٹھ کر ان دھماکوں سے دور جانا قبول کر لیا تھا۔ چکلے کے ایجنٹوں کے

لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اس سانحے کے بعد اسلام آباد اور راولپنڈی کی کئی لڑکیاں لاپتا ہوگئی تھیں۔

مجھے کراچی سے بھی اسی طرح کے واقعات کی خبر ملی۔ وہاں بم پھٹنے کے بعد افراتفری کے عالم میں ایک عورت پر طبی امداد کی گاڑی کے اندر جنسی حملہ کیا گیا۔ باہر شور وغل میں اس کی چیخ و پکار کوئی نہ سن سکا۔ اسی طرح قومی شاہراہوں پر بسوں کے یا ریل کے حادثوں کے بعد بھی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے کہ بے سہارا، گھبرائی ہوئی عورتوں کو مغلوب کرنا ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

زیادہ تجربہ کار دلال یوں لڑکیاں پھنسانے کی بجائے ایک مافیا کی صورت میں بڑے پیمانے پر کھیل کھیلتے ہیں۔ وہ ملکی سطح پر کوٹھی خانوں کا کاروبار سنبھالتے ہیں۔ ان کا طریقۂ کار ہے کہ یہ جسم فروش عورتوں کو مسلسل ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کے قائم کردہ جسم فروشی کے اڈے محفوظ رہتے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد پھر کسی نئے شہر بھیجے جانے کے باعث یہ بات بھی یقینی ہو جاتی ہے کہ یہ عورتیں ایسا کوئی بھی رشتہ اور رابطہ قائم نہیں کر سکیں گی جس کے ذریعہ وہ ایجنٹوں کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ ہر نئے مقام پر یہ عورتیں اپنے آپ کو ایک بار پھر تنہا اور بے سہارا پاتی ہیں۔ اس طریقے سے یہ ایجنٹ اپنے گاہکوں کو ہر بار نئی لڑکیاں پیش کرنے میں بھی کامیاب رہتے ہیں۔

اپنی تحقیق کے دوران میرے علم میں یہ بات بھی آئی کہ نچلے درجے کے ایجنٹ اور دلال نئے گاہکوں کی تلاش میں بس اسٹاپ، ریلوے اسٹیشن اور بڑے بازاروں میں وقت گزارتے رہتے ہیں۔ وہ مردوں کو دیکھ کر پہلے اندازہ لگاتے ہیں کہ آیا وہ اُن کی خدمات حاصل کرنے پر راضی ہوں گے یا نہیں۔ جس کے بعد وہ گول مول گفتگو کے ذریعے اپنا پیغام ان کو پہنچاتے ہیں۔ نچلے درجے کے کوٹھی خانوں کے لیے یہی طریقہ زیادہ رائج ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی مقام پر جسم فروشی کا اڈہ قائم کر کے یہ خبر پھیلا دی جاتی ہے۔ اس صورت میں گاہک از خود آتے ہیں لیکن دلال انہیں کچھ اس طرح پھانستے ہیں کہ ان کا بار بار وہیں آنا یقینی بن جائے۔ اسلام آباد کے ''کراچی کمپنی'' نامی علاقے میں دلال خود گاہکوں کو جسم فروشی کے اڈے تک لے جاتے ہیں۔ زیادہ منظم اڈے جسم فروش عورتوں کی تصاویر کے البم بھی بناتے ہیں۔ مثلاً لاہور کی لبرٹی مارکیٹ میں ایک چاٹ والے کی دکان پر ایسا البم موجود رہا ہے۔ وہ اپنے گاہکوں کے پیغامات ان لڑکیوں تک پہنچا دیا کرتا تھا۔

کسی عام بازار میں اس نوعیت کا ''مرکز رابطہ'' رکھنے کے لیے پولیس کی اعانت لازمی ہے۔ پولیس ایسے کاروبار میں اپنا کمیشن وصول کرتی ہے جس کی رقم کا انحصار کاروبار کی وسعت اور کامیابی پر

ہوتا ہے۔ ایسے دلال جو بارسوخ گاہکوں مثلاً سیاسی شخصیتوں کو اپنی خدمات پیش کرتے ہیں یا خود سیاست کی دنیا میں داخل ہونا چاہتے ہیں وہ پولیس کے صرف اعلیٰ افسران سے لین دین رکھتے ہیں۔

رفتہ رفتہ یہ طریقہ بھی عام ہوتا جا رہا ہے جس کے تحت عورتیں سڑک پر گاہک سے براہِ راست رابطہ کرتی ہیں۔ میں نے اس طریقۂ کار پر زیادہ تحقیق نہیں کی ہے۔ میں اس حد تک معلومات اکٹھا کرنا چاہتی تھی جو شاہی محلے کے روایتی طریقہ کار اور موجودہ طریقوں کا تقابل کرنے میں مدد دے سکے۔ نیز اس تبدیلی کے عمل کو سمجھنے میں مدد دے جو شاہی محلے کے قدیم باسیوں کے گلبرگ جیسے علاقوں میں منتقل ہونے کے باعث جاری ہے۔

اس تحقیق کا ایک تو نتیجہ یہ سامنے آیا کہ شاہی محلے میں روایتی نائیکائیں روز بروز دلالوں کی خدمات پر انحصار کرنے پر مجبور ہوتی جا رہی ہیں۔ ہیرا منڈی کے روایتی نظام میں طاقت اور اختیار کا تناسب کافی بدلتا جا رہا ہے۔ پولیس کے رویّے کی وجہ سے گاہک اب خود سے اس محلے میں کم آتے ہیں جس کی وجہ سے نائیکہ کو دلالوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ دلال اب بہت طاقتور ہوتے جا رہے ہیں اور اب وہ خود اس سارے کاروبار کو چلانا چاہتے ہیں۔ وہ اس کام کو صرف ہیرا منڈی تک محدود نہیں رکھنا چاہتے جہاں پہلے ہی بے شمار پابندیاں ہوں بلکہ ہر بڑے شہر کے کونے کونے میں پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ حکومت کی سخت پالیسیاں اس کاروبار کی شکل بدل کر اسے ایک طرح سے زیادہ عام کر رہی ہیں مگر اسے ختم نہیں کر سکیں۔

باب ۲۱

لیلیٰ کی شادی

لیلیٰ کی ''شادی'' دوسروں کے لیے اب مذاق بن گئی تھی۔ کوئی مناسب ''رشتہ'' آیا نہیں تھا اور اس کا خاندان یہ طعن و تشنیع اب مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لیلیٰ بھی سازندوں کے طعنوں سے تنگ آ چکی تھی۔ ان کا ایک ہی سوال ہوتا، ''کیا یوں ہی بڈھی ہو جاؤ گی؟'' لیلیٰ کے گھر والوں نے بھی اس پر دباؤ بڑھا دیا تھا۔ وہ بھی اٹھتے بیٹھتے کہتے رہتے ''وزن کم کرو، ناچ گانے کا ریاض زیادہ کرو۔''

سال بھر کی تلاش کے بعد بالآخر قیصرہ اور شاہد کو ایک گاہک پسند آ ہی گیا جو لمبے عرصے کا رشتہ کرنے پر راضی تھا۔ یہ موقع اتنی تاخیر سے آیا تھا اور رقم بھی ایسی نہ تھی جس پر فخر کیا جاتا، اس لیے دھوم دھام سے گریز کیا گیا۔ لیلیٰ اب تک پوری طرح سدھائی جا چکی تھی۔ اس نے بخوشی یہ تجویز مان لی۔ محلے میں ''شادی'' کی خبر ایک نائی نے گھر گھر پہنچا دی۔

نائی ہمارے شہروں اور قصبوں کے معاشرے میں ایک اہم روائتی حیثیت رکھتا ہے اور وہی کردار وہ طوائفوں کے اس محلے میں بھی ادا کرتا ہے۔ شادی بیاہ اور زچگی کے موقعے پر نائی کھانا پکاتا ہے۔ وہ برادری کے سب لوگوں کو جانتا ہے اور پیغام رسانی کا کام بھی کرتا ہے۔ برادری کے لوگ اور گھر والے اسے تحفے تحائف سے نوازتے رہتے ہیں۔

قیصرہ اور شاہد نے لیلیٰ کی نتھ اترائی کے لیے واجبی سی رقم اس لیے قبول کر لی کیونکہ گاہک ماہانہ رقم دینے پر راضی تھا۔ لیکن اس سودے میں مجھے کہیں کوئی گڑبڑ معلوم ہوتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ

کہیں کوئی داؤ پیچ ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا گیا ہے۔

لیلیٰ کے اس ''شوہر'' سے میری ملاقات بھی عجیب تھی۔ میں اس کے گھر گئی تو وہ بڑے اشتیاق اور محبت سے ملی۔ مجھے بیٹھک میں چھوڑ کر وہ اسے بلانے چلی گئی مگر دس منٹ بعد ہی واپس آ گئی۔ ''وہ بڑا شرمیلا ہے۔ باہر نہیں آئے گا۔'' اس نے کہا۔ پھر ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ میں ان کی خواب گاہ میں جا کر اس سے ملوں۔

پردہ ہٹا کر میں اندر گئی تو دیکھا کہ چارپائی پر کمبل میں منہ چھپائے کوئی لیٹا ہوا ہے۔ لیلیٰ نے کئی بار آواز دی مگر وہ کچھ نہ بولا۔ آخر دو تین بار جھنجھوڑنے کے بعد اس نے کمبل سے منہ نکالا اور مجھ سے نظر ملائے بغیر سلام کر کے کمبل سے برآمد ہوا اور باہر بھاگ گیا۔ میرا تو منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ تو یہ تھا لیلیٰ کا ''شوہر''؟ وہ دبلا پتلا، کوئی چار فٹ دس انچ کا انیس بیس برس کا لڑکا تھا۔ چھوٹا سا چہرہ، تیکھے نقوش، مسیں بھیگ رہی تھیں۔ اس بچگانی حرکت پر پاس کھڑی لیلیٰ اور اس کی ماں ٹھٹھے لگانے لگیں۔

لیلیٰ سے اس کے بارے میں، میں نے سوال پوچھے مگر کوئی صاف جواب نہ ملا۔ بس اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ اب وہ یہیں رہے گا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اتنی کم عمری میں وہ اپنے کاروبار کے سیاہ و سفید کا مالک نہیں ہو سکتا۔ یا تو لڑکا گھر سے بھاگا ہوا ہے، یا اس کا خاندان کہیں اور رہتا ہے۔

اس کا نام سلیم تھا۔ وہ کسی سنار کا بیٹا تھا جس کی دکان سُوا بازار میں تھی جو لاہور میں زیورات کا بڑا بازار ہے۔ وہ اس دکان میں کام کرتا تھا مگر کوئی چیز بھی اس کے نام نہیں تھی۔ میرے خیال کے مطابق اس کے گھر والے دوسرے شہر میں رہتے تھے جہاں ان کی زیادہ بڑی دکان تھی۔ لاہور والی دکان پر ایک ملازم بیٹھتا تھا۔ سلیم کو اس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ دکان کی آمدنی اس کے ہاتھ میں جاتی تھی اور گھر والوں کو اس کی دیگر ''سرگرمیوں'' کا کچھ علم نہ تھا۔

ایک رات ''پہلا تجربہ'' حاصل کرنے وہ دوستوں کے ساتھ اس محلے میں آیا تھا۔ یہاں اسے اس ''سودے'' میں پھنسا لیا گیا تھا۔ دوست احباب نے اسے قائل کر لیا تھا کہ لمبا سودا بہتر رہے گا۔ شاہد کے ایجنٹ خوب جانتے تھے کہ کس گاہک کو کون سی حکمتِ عملی کے ذریعے زیر کیا جا سکتا ہے۔ سلیم میں ذرا بھی خود اعتمادی نہ تھی اور وہ کوئی فیصلہ از خود نہیں کر سکتا تھا۔ ایجنٹوں کے اصرار پر وہ آسانی سے لیلیٰ سے رشتہ باندھنے اور ماہانہ رقم دیتے رہنے پر راضی ہو گیا۔ گاہکوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ اس طرح ان کی ''عزت'' پر کسی دوسرے کا ہاتھ نہیں پڑے گا۔ طوائف بس اس کی ہی ہو کر رہے گی۔ ناتجربہ کار گاہک، یا ایسے گاہک جن کو اپنے پر کچھ زیادہ ہی مان ہو، عموماً ان

باتوں میں آجاتے ہیں۔ سلیم کو یقین تھا کہ لیلیٰ کنواری ہے۔ وہ ابتدا میں بیس ہزار اور پھر ماہانہ دس ہزار روپے دینے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ یہ رقم معمولی تھی اس لیے قیصرہ اور شاہد برادری میں اس کا ذکر نہیں کرتے تھے۔

قیصرہ نے لیلیٰ کو مشورہ دیا کہ بچہ پیدا کرنے میں ذرا بھی دیر نہ کرے۔ کسی بھی گاہک کو باندھے رکھنے کا یہ آزمودہ حربہ ہوتا ہے۔ لیلیٰ دوسرے گاہکوں کے ساتھ نہیں جائے گی تو اپنا وقت اولاد پیدا کرنے میں صرف کرے۔ سلیم زچگی کے اخراجات بھی اٹھالے گا اور بچہ ہو جانے پر ماہانہ رقم میں اضافہ کروانے کا بھی بہترین بہانہ مل جائے گا۔

سلیم اس گھرانے میں ایسے رہتا تھا جیسے نیولا اپنے بل میں رہتا ہو۔ گھر میں داخل ہوتے ہی، بغیر کچھ کہے وہ سیدھا اندر اپنی چارپائی یا باورچی خانے کی طرف چلا جاتا۔ میں نے لاکھ کوشش کی مگر اس نے مجھ سے کبھی بات نہیں کی۔ وہ باتیں کر ہی نہیں سکتا تھا۔ گھر کے اندرونی کونوں کھدروں میں وہ ٹوٹے پھوٹے سامان کی طرح کہیں گھسا رہتا۔ وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتا تھا۔ یہاں اس کی حیثیت، میرے اندازے کے مطابق، گویا سے ایک دو درجے ہی زیادہ تھی۔ وہ دن کا زیادہ حصہ، اور ہر رات، اب یہیں گزارنے لگا تھا۔ لیلیٰ اسے چھیڑتی رہتی اور وہ شرم سے سرخ ہو جاتا۔ ہر مہینے ایک بار وہ اپنے گھر دوسرے شہر بھی جاتا تھا ورنہ وہیں پڑا ٹی وی پر ہندوستانی فلمیں دیکھتا رہتا تھا۔

سازندوں کو مذاق اڑانے کا دوسرا بہانہ مل گیا تھا۔ ''لوگ مرغا پھنساتے ہیں مگر جی لیلیٰ کے گھر والوں نے چوزہ پھنسایا ہے۔'' انہوں نے سلیم کا نام ''چڑا'' رکھ دیا تھا۔ لیلیٰ کہتی تھی کہ لوگ اس سے جلتے ہیں۔ سازندوں کا کہنا تھا کہ لیلیٰ دوسرے گاہکوں کی تواضع بھی کرتی ہے مگر سلیم کو معلوم نہیں اور اگر اسے معلوم ہو بھی جائے اور وہ احتجاج کرے تو اس سے ماہانہ رقم بڑھانے کا مطالبہ کیا جائے گا۔

لیلیٰ نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ میرے گھر اسلام آباد آنا چاہتی ہے۔ گھر جانے پر میں نے اپنی والدہ سے لیلیٰ کی اس خواہش کا ذکر کیا۔ میری والدہ نے کہا کہ انہیں کسی بھی ممنوع موضوع پر میری تحقیق پر اعتراض نہیں لیکن اپنے اس ''موضوع'' کو اپنے گھر نہ بلاؤں تو بہتر ہے۔

''پورے خاندان کو اس میں مت گھسیٹو۔'' انہوں نے کہا۔

لیکن میں مُصر رہی کہ ہمیں ان لوگوں کو انسان سمجھنا چاہیے۔ میری کتاب کا مقصد ہی یہ ہے۔ ''اگر میرے اپنے گھر والے تعصب ختم نہیں کرتے تو پھر بھلا میرے موقف میں کیا وزن رہ جائے گا!''

امی نے کہا: ''میں تمہارے ساتھ پورا تعاون کر رہی ہوں۔ تم کتنا سارا وقت وہاں گزارتی ہو۔ چھٹی کے دن بھی گھر پر نہیں رہتیں۔ وہیں چلی جاتی ہو۔ میں نے کبھی اعتراض کیا؟''

اور اس طرح یہ گفتگو ختم ہوگئی تھی۔ ایک بار مجھے کسی کام کے سلسلے میں مردان جانا پڑا۔ وہاں مجھے میری والدہ نے ٹیلی فون کر کے بتایا کہ لیلیٰ اور اُس کا شوہر میرے گھر آ پہنچے ہیں۔ میں اس سے ایک ہفتہ پہلے ہی لیلیٰ سے ملی تھی لیکن اس نے اپنے اس منصوبے کے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے امی سے معذرت چاہی مگر امی نے کہا: ''اب آ ہی گئے ہیں تو میں اُن کی دیکھ بھال کروں گی ہی!''

وہ لوگ دو دن میرے گھر ٹھہرے۔ میری واپسی تک وہ مری کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ جب میں لوٹی تو امّی تھک کر چُور ہو چکی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ لیلیٰ کے مطالبوں کو رد کرنا مشکل کام تھا۔ وہ ہر وقت کار اور ڈرائیور کو اپنے استعمال میں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ گھومنے جانا چاہتی تھی۔ وہ میرے کپڑے لے لینا چاہتی تھی وغیرہ وغیرہ... یہ سب سن کر میں ہنس پڑی کیونکہ میں پورے منظر کا تصور کر سکتی تھی۔ میں نے امی کو سمجھایا کہ ان عورتوں کی بچپن سے ہی یہ تربیت کی جاتی ہے کہ دوسروں سے جو کچھ ممکن ہو سکے، ہتھیا لیں۔ پھر وہ غیر شعوری طور پر ایسا ہی کرنے لگتی ہیں۔ امی نے بتایا کہ منع کرنے کے باوجود لیلیٰ میرے دو شلوار قمیض کے جوڑے اور میرے بھائی کا سوٹ کیس لے گئی ہے۔

لیلیٰ اور سلیم مری میں دو دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکے۔ اتنے دنوں میں سلیم کے پاس جتنی رقم تھی وہ ختم ہوگئی تھی۔ موقعے کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے لیلیٰ نے جی بھر کر خریداری کی تھی۔ یہ اخراجات ماہانہ رقم کے علاوہ تھے اور لیلیٰ اس کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ مری میں وہ ایک معمولی ہوٹل میں ٹھہرے تھے جس پر لیلیٰ مسلسل ناک بھوں چڑھائے شکایت کرتی رہی تھی۔

دو بڑے سوٹ کیسوں سمیت وہ لاہور واپس لوٹے۔ لیلیٰ کے گھر والوں نے اس سخاوت پر سلیم کا شکریہ ادا کیا۔ حالانکہ وہ خوب سمجھتے تھے کہ بے چارے کے پاس لیلیٰ کی فرمائشیں پوری کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کے بعد جب میں لیلیٰ سے لاہور میں ملی تو اس نے کہا کہ اسے میرے خاندان والے، خصوصاً میری امی بہت اچھی لگیں۔ ''میں پھر تمہارے گھر آؤں گی۔'' اس نے اعلان کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگلی بار اسے پہلے مجھ کو اطلاع دینی ہوگی تا کہ میں اپنے گھر والوں کو اس کے لیے تیار کر سکوں۔

میرا گھر اور اس کا ساز و سامان لیلیٰ کے لیے شیخیاں مارنے کا نیا بہانہ بن گیا۔ ٹیلی فون پر

سہیلیوں اور گاہکوں سے وہ لگاتار ایک ایک چیز گنوانے لگی۔ ڈیپ فریزر، دو فریج، تین ٹیلی وژن اور کمپیوٹر کا ذکر وہ سب سے پہلے کرتی تھی۔ وہ ان چیزوں سے بہت مرعوب ہوئی تھی اور اسے مجھ پر بہت فخر ہونے لگا تھا۔

لیلیٰ کی محفل ہر شام سجتی رہی۔ ''شوہر'' سے کہہ دیا گیا کہ گھر کے اخراجات اٹھانے کے لیے لیلیٰ کے لیے یہ کام جاری رکھنا ضروری ہے۔

باب ۲۲

نرگس شادی کیوں کرے؟

میں لیلیٰ سے ملتی رہتی تھی مگر محلے کی دوسری طوائفوں سے بھی ملاقاتیں کرتی رہتی تھی۔ میں اس محلے میں بسنے والی ان عورتوں کی زندگی، ان کے دکھ سکھ، ان کے خوابوں اور امنگوں کا ایک جامع ادراک حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر، میں ایک عورت کی حیثیت سے، ان کے حوالے سے خود اپنی اور اپنی جیسی دوسری عورتوں کی حیثیت سمجھنا چاہتی تھی۔ یہ محلّہ گو معتوب تھا، مگر پورے معاشرے کا ہی ایک اٹوٹ انگ تھا۔ یہاں کے رسم و رواج اور سماجی رویّے پورے معاشرے کا ہی ایک عکس تھے۔

سو اس طرح میری ملاقات نرگس سے ہوئی۔ اسی محلے میں اس نے جنم لیا تھا اور انہی گلی کوچوں میں پلی بڑھی تھی۔ تماش بینوں کو خوش کرنے کے سارے طریقے اس کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے۔ ابتدا میں اس کی تربیت ماں اور بڑی بہن نے کی تھی۔ اس نے کم سنی ہی میں ناچ گانا سیکھ لیا تھا۔

نرگس کے گھر والے بہت غریب تھے۔ دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کے لیے وہ کسی کام میں بھی عار نہ سمجھتے تھے۔ نرگس بچپن سے ہی روزی حاصل کرنے کے لیے کام کرنے لگی تھی۔ کھیل تماشوں اور سرکس وغیرہ میں کھیل شروع ہونے سے پہلے یا درمیان میں اس کا رقص پیش کیا جاتا تھا۔ یہ کام وہ بارہ برس کی عمر سے کر رہی تھی۔ وہ اتنے لاچار تھے کہ اسے جو کام بھی دیا جاتا، نرگس وہی کرتی اور جو رقم دی جاتی، اس کی ماں قبول کر لیتی۔ اس طرح نرگس نے تھیٹروں میں، ''جادو'' کے

کھیلوں میں، ورائٹی شو میں، موت کے کنویں میں، غرض ہر طرح کے تماشے میں حصہ لیا تھا۔ اس نے پاکستان کے مشہور لکی ایرانی سرکس اور جوبلی سرکس میں بھی کام کیا تھا۔ ہمارے میلوں ٹھیلوں اور کسی پیر کے عرس پر یہ لوک تماشے عام ہوتے ہیں اور نرگس کے خاندان کو ان سے روزی روٹی مل جاتی تھی۔ وہ دوپہر سے رات گئے تک کام کرتی رہتی۔ اس طرح کے تماشے رات کے ایک دو بجے تک، اور بعض اوقات صبح کے چار بجے تک جاری رہتے تھے۔

نرگس نے بتایا ''پندرہ برس کی عمر میں میری 'شادی' ہوئی تھی۔ ماں باپ نے نتھ اترائی کے پندرہ ہزار روپے لیے تھے۔ کوئی سیالکوٹیا تھا وہ آدمی۔ اس زمانے میں پندرہ ہزار بڑی بات تھی۔ دو لاکھ روپے میں تو پورا مکان بن جاتا تھا۔ اس کے بعد میں باقاعدہ دھندے سے لگ گئی۔ میلوں میں ہم مردوں کو اپنا پتا بتا دیتے تھے۔ گاہک گھر پہنچ جاتے تھے۔'' وہ ہنسی۔ ''تماشہ دکھانے اور ناچنے کے علاوہ مجھے لوگوں سے باتیں کرنے میں بھی مزا آتا تھا۔ پھر جب کوئی اچھا سودا پٹتا اور میری ماں منظور کر لیتی تو میں گاہک کے ساتھ چلی جاتی۔''

''اب میں ماں کے ساتھ رہتی ہوں۔ اس گھر میں چار کمرے ہیں۔ دو کمروں میں ہم رہتے ہیں اور دو کمروں میں 'آفس' ہے۔ اب تو ہماری برادری کی لڑکیاں، ایسی کاہل ہوگئی ہیں کہ دو دن کام کریں گی تو دو دن چھٹی کریں گی۔ پہلے ایسا نہ تھا۔ سب کو بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔ میری زندگی میں اب بھی بڑی مشکلات ہیں۔ بہت محنت کرتی ہوں پھر بھی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ خرچہ بہت بڑھ گیا ہے۔ چار ہزار روپے کرایہ ہے اور تین ہزار روپے بجلی کا بل!! مہنگائی اتنی ہے کہ بچوں کا پیٹ بھر جائے اور تن ڈھک جائے تو اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ میرے چار بھائی ہیں۔ دو بھائی تو مشہور ڈانسر سلمٰی اور ستارہ کے ساتھ کام کرتے ہیں اور دوسرے دو کنجروں کے دوسرے لڑکوں کی طرح یونہی آوارہ پھرتے رہتے ہیں۔ میں اوپر والی منزل میں اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہوں۔ نیچے میری ماں اور بہن رہتی ہیں۔''

''اللہ کے فضل سے میں اپنے اور بچوں کے گزارے بھر کما لیتی ہوں۔'' اس نے کہا ''کبھی کبھی شور شرابہ کرنے والے گاہک سے پالا پڑ جاتا ہے۔ کوئی مجھے جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا ہے، دھکے مکے پر اترنے لگتا ہے۔ انہیں بڑی سختی سے قابو میں لانا پڑتا ہے۔ میں ان سے کہتی ہوں۔ 'خبردار! جو ہاتھ اٹھایا! میں تیرے نکاح وچ نئیں (میں تمہارے نکاح میں نہیں ہوں)۔ میرے ساتھ مار پیٹ تم نہیں کر سکتے!' میں گاہکوں کو بتا دیتی ہوں کہ یہ میرا گھر ہے جہاں وہ آئے ہیں۔ ناچ گانا شوق سے دیکھیں مگر تشدد کی اجازت نہیں دوں گی۔ اگر وہ نہ مانیں تو میں گانا بند کر دیتی ہوں۔ اور ان سے کہتی ہوں کہ

اپنا راستہ ناپیں۔ یہاں گانے کا ریٹ تین سو سے پانچ سو تک ہے۔ ساتھ سونے کے لیے اس محلے میں میری سہیلیاں پانچ ہزار تک بھی مانگ لیتی ہیں۔ لیکن میں بس ہزار پانچ سو سے کم نہیں لیتی۔ جو کوئی گاہک اس سے کم دینے لگے تو میں کہتی ہوں کہ وہ ٹبی گلی چلے جائیں۔ وہاں بیچاری غریب عورتیں تو سو دو سو میں ہی مان جاتی ہیں۔''

نرگس نے مجھے بتایا: ''دیکھیں جی میں صفائی کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ بیمار شیمار نہیں پڑنا چاہتی۔ مرد کے ساتھ جانے سے پہلے صفائی کرتی ہوں، صابن سے ہاتھ دھوتی ہوں۔ ٹبی گلی کی عورتیں، 'جہڑیاں دن وچ کئی بٹھاندیاں نیں' (جو دن میں کئی بٹھاتی ہیں)، وہ بڑی گندی رہتی ہیں۔ وہ تو کپڑے سے بھی صفائی نہیں کرتیں۔ بس ایک کے بعد ایک لیتی جاتی ہیں۔ اسی لیے تو ان کو اتنے روگ لگ جاتے ہیں۔''

''کیسے روگ؟'' میں نے پوچھا۔

''کئی طرح کے روگ ہیں۔ یہی پانی وانی جانے لگتا ہے۔'' نرگس نے کہا۔ ''وہ گاہکوں کو بتاتی بھی نہیں ہیں۔ کوئی بڑی اوکھی بیماری ہو جائے تو دائی سے علاج کرا لیتی ہیں۔''

میں نے پوچھا: ''ایک مرض ایڈز بھی ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں تم کو کچھ پتا ہے؟''

''نہیں جی!'' نرگس نے کہا۔ ''مرض تو بہت سے ہوتے ہیں۔ بس میں تو صفائی رکھتی ہوں۔''

میں نے ایڈز پر اس سے تفصیلی گفتگو کی اور اسے بتایا کہ اس جیسی عورتوں کو یہ بیماری لاحق ہو سکتی ہے۔ پھر میں نے اس سے 'فرنچ لیدر' کے بارے میں پوچھا۔ ربر کے مانع حمل غلافوں کے بارے میں وہ جانتی تھی اور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔ پھر بولی: ''کیوں اُنہاں دی مردانگی نوں ہتھ پاون لگے او! (کیوں ان کی مردانگی پر ہاتھ ڈالنے لگے ہو!)''

وہ جانتی تھی کہ مرد اس طریقے کو بالکل پسند نہیں کرتے بلکہ اسے اپنی مردانگی کی توہین سمجھتے ہیں۔

میں نے اس سے بچوں کے بارے میں پوچھا۔ نرگس نے بتایا: ''یہاں میری جاننے والی عورتیں دو طرح کی ہیں۔ کچھ تو ایسی ہیں جو بچے پیدا کرنے سے پہلے کچھ رقم جمع کر لینا چاہتی ہیں۔ پہلے زیور بن جائیں، گھر بن جائے پھر بچے پیدا کرنے کا وقت نکالیں۔ دوسری وہ ہیں جو کہتی ہیں کہ بچے پہلے پیدا کر لیں، کمائی بعد میں کریں گے۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں نے شروع ہی میں بچے پیدا کر لیے ہیں۔ میں سولہ برس کی تھی جب پہلی بیٹی پیدا ہوئی، مگر وہ بچی نہیں۔ پہلا بیٹا بھی نہیں بچا۔ تیسرا بیٹا زندہ رہا، مگر مجھے اس کا بڑا غم تھا۔ میں بیٹی چاہتی تھی۔ میں کوشش کرتی رہی، آخر بیٹی پیدا ہوئی۔ اللہ کے فضل سے اب وہ چار برس کی ہے۔''
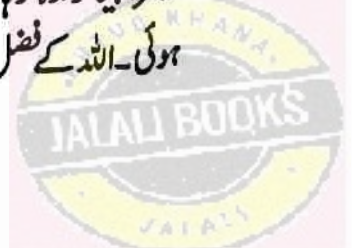
نرگس نے بڑے وثوق سے کہا: ''نہیں جی! میں منصوبہ بندی نہیں کرتی۔ یہ تو اللہ کی دین ہوتی ہے۔ انسان کو دخل ہی نہیں دینا چاہیے۔ یہاں کچھ عورتیں بچہ گرا دیتی ہیں۔ مگر میرے تو یوں ہی مشکل سے بچہ ٹھہرتا ہے۔ اس لیے میں ان باتوں میں نہیں پڑتی۔ یہاں عورتوں کو اگر بچے پالنے میں مصیبت لگ رہی ہو تو بچہ گروا دیتی ہیں۔ تم راجو کو جانتی ہو، بڑی اچھی عورت ہے مگر پانچ مرتبہ اسقاط کروایا ہے۔ میں نے تو اسے کہا کہ تو پاگل ہوگئی ہے۔ ایسے کرتی رہے گی تو جب چاہے گی کہ بچہ ہو جائے، اس وقت نہیں ٹھہرے گا حمل...''

''اسقاط کہاں کرواتی ہیں یہ عورتیں؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے تو محلے کی دائی کو ہی بلا لیتی تھیں، مگر اب ہسپتال جانے لگی ہیں۔ وہاں کی ڈاکٹرنیاں چپکے سے کر دیتی ہیں۔ دو تین سو روپے میں کام ہو جاتا ہے۔''

میں نے نرگس سے پوچھا ''کیا تم اپنی مرضی سے فیصلہ کرتی ہو کہ بچے کا باپ کون ہو؟''

نرگس نے کہا ''ایسے بندے کا بچہ پیدا کرنا چاہیے جو آتا جاتا رہے۔ ایک رات کے ساتھ پر تو کسی کا بچہ نہیں جنا جا سکتا۔ ہم ایسی غلطی نہیں کر سکتے۔ بندہ ایسا تو ہو جو زچگی کا خرچہ اٹھائے۔ بعض مرد تو سنتے ہی گھبرا جاتے ہیں کہ ہمیں اُن کا بچہ ہونے والا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان کی اولاد اس محلے میں پلے بڑھے گی۔ اگر بندہ بھاگ جائے تو ہمیں سارا خرچ خود کرنا پڑتا ہے۔ چلو پھر بھی بچہ تو مل ہی جاتا ہے ہمیں۔ اور لڑکی ہو جائے تو پھر کیا کہنا!!''

میں نے پوچھا ''کبھی کسی گاہک سے پیار تو نہیں ہو جاتا؟''

نرگس ہنسنے لگی۔ اس نے کہا: ''نہیں جی! اس چکر میں ہم پڑ نہیں سکتیں۔ ہمارے اپنے بچے ہیں، خاندان ہے۔ ان کی روزی روٹی کی فکر کرتے ہیں ہم۔''

پھر اس نے کہا ''بارہ برس کی عمر سے کام شروع کیا تھا۔ آج چھبیس کی ہو رہی ہوں۔ میری ماں اور بہن نے مجھے کبھی کسی کام سے نہیں روکا۔ لیکن اگر کسی گاہک سے زیادہ ملنے لگوں تو پھر وہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ مجھے روکتی ہیں۔''

وہ کہتی ہیں: ''جے منہ کالا کروانا وی اے تے بندا تے کوئی خرچہ چکن والا ہوئے۔ جینوں بٹھایا اے او تے تیرے بچیاں نوں روٹی وی نئیں کھوا سکدا۔ جے ایس کم وچ پئی ایں تے فیر اپنا کچھ بنا۔ (اگر منہ کالا کروانا ہی ہے تو بندا تو کوئی خرچہ اٹھانے والا ہو۔ جسے بٹھایا ہے وہ تو تیرے بچوں کو روٹی بھی نہیں کھلا سکتا۔ اگر اس کام میں پڑی ہو تو پھر اپنا کچھ بناؤ)'' ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ پہلے کچھ رقم جوڑنی ضروری ہے کہ پیچھے سے مضبوطی رہے۔ پھر جس سے چاہیں شادی کر لیں، پروا نہیں۔ آپ

لوگوں کی عورتوں کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شادی کے بیس برس بعد بھی خاوند لات مار کر نکال دے تو عورت خالی ہاتھ در در کی ٹھوکریں کھاتی ہے۔"

یہ سن کر میں ہنس پڑی۔ مجھے خیال آیا کہ ہمارے معاشرے میں عورتیں ان طوائفوں پر ترس کھاتی ہیں اور یہ طوائف باقی معاشرے کی عورتوں پر ترس کھا رہی ہے۔

میں نے اس سے پوچھا: "کیا تم شادی کر کے گھر بسانا چاہتی ہو؟"

نرگس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا: "ناں بھئی! میری توبہ... خدا نہ کرے۔ شادی میں کیا رکھا ہے جی؟ خاوند جوتے مارتا ہے اور بیویاں سہتی ہیں۔ میری دو سہیلیوں نے شادی کی ہے۔ بے چاریاں سارا دن اتنی محنت کرتی ہیں اور شام کو خاوندوں کی گالیاں کھاتی ہیں۔ سسرال والے تو انہیں نالی کا کیڑا سمجھتے ہیں۔ ان کی بیٹیوں کو انہوں نے اسی محلے میں بھجوا دیا کہ کنجروں کی اولاد کنجروں میں ہی رہنے کے لائق ہے۔ میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔ اپنی محنت کی روزی سے خود اپنے بچے پالوں گی ......اور بس!" نرگس نے زیادہ رقم جمع نہیں کی۔ اس کا قصور وار وہ مہنگائی کو ٹھہراتی ہے۔

"حکومت کو شرم نہیں آتی۔ ہر چیز کا دام بڑھائے چلی جاتی ہے۔ ہم جیسے غریب کیسے بچے پالیں!" اس نے کہا: "لیکن میں تو جی محنت اور ایمانداری سے اپنی روٹی خود ہی کماؤں گی۔ شادی وادی کے جنجال میں پڑے میری بلا!"

تاثرات

پاکیزہ بیگم (ایک گھریلو خاتون)

انہوں نے میرے سامنے اِس موضوع پر اپنے خیالات کا بر ملا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"میں شروع شروع میں فلموں کے توسط سے ہی طوائف کے پیشے کے متعلق جانتی تھی اور میں یہ سوچتی تھی کہ یہ دنیا کا سب سے بُرا کام ہے جو ایک عورت کر سکتی ہے۔ لیکن کبھی کبھار فلموں میں طوائف کو بہت مظلوم بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جو کسی ہیرو کی محبت میں مبتلا ہوجاتی ہے اور بعد میں اس کی خاطر جان دے دیتی ہے... یہ سب بکواس ہے۔

اب اس بارے میں میری جانکاری پہلے سے کہیں بہتر ہے۔ یہاں ہمسایوں میں ایک عورت ہے، یہیں اِسی کالونی میں جو اُس محلے سے تعلق رکھتی ہے۔ اُس نے اپنے ایک گاہک سے شادی کر لی ہے اور اب وہ تین بچوں کی ماں ہے۔ سب سے بڑا بچہ ۱۲ سال کا ہے۔ وہ یہاں دو سال پہلے منتقل ہوئے تھے۔ میں اس کے گھر بالکل نہیں جاتی البتہ کالونی کی دوسری عورتیں ازراہِ تجسس اُس کے گھر جاتی ہیں اور واپس آ کر اُس کے بارے میں باتیں کرتی ہیں۔ وہ اُس کے بات کرنے کے انداز اور طور طریقے بغور دیکھتی ہیں اور پھر آکر اُس کا مذاق اڑاتی ہیں۔"

(جاری)

"کیا اُس کا بات کرنے کا انداز آپ تمام لوگوں سے ہٹ کر ہے؟" میں نے پوچھا۔
"میرا یہ خیال نہیں، وہ ہماری طرح پنجابی ہے۔" انہوں نے جواب دیا، " لیکن یہ عورتیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی اُس کا مذاق اڑاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایسی عورت کا سماجی بائیکاٹ کیا جانا چاہیے۔ میں اُس کے گھرکبھی محرم میں کُونڈوں پر بھی نہیں گئی۔ میں اُس کے گھر کا کچھ بھی کھانا نہیں چاہتی۔"
"آپ کے خیال میں اُس نے شادی کیوں کی اور اپنا کوٹھا کیوں چھوڑا؟" میں نے ان کی رائے جاننا چاہی۔
انہوں نے کہا، "وہ یقیناً اُس گاہک کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہو گی۔"
"اور آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ اتنے لمبے عرصے سے اس کے ساتھ کیوں رہ رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔
"شاید اپنے بچوں کی خاطر، لیکن مجھے یہ بتانے کی کوشش مت کریں کہ وہ ایک اچھی عورت ہے! وہ شادی سے پہلے ایک طوائف تھی اور میں نے سنا ہے کہ وہ بسا اوقات اپنے خاندان سے ملنے محلے جاتی ہے اور اپنی بھانجیوں کے مجروں میں بیٹھتی ہے۔ وہ نائیکہ کی حیثیت سے اُن سے اپنا حصہ لیتی ہے ۔"
"تو کیا وہ ابھی تک وہاں کام کر رہی ہے۔" میں نے پوچھا۔
"نہیں، میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ وہ کافی بڑی عمر کی ہو چکی ہے اور اس کا جسم بھی اتنا خوبصورت نہیں رہا۔"
انہیں اپنے کہے پر خود ہی ہنسی آگئی اور انہوں نے دوپٹے کا پلّو ہونٹوں میں دبا لیا۔ پھر کہنے لگیں: "لیکن وہ اب بھی کبھی کبھار وہاں جاتی ہے۔ دوسری عورتیں کہتی ہیں کہ وہ اپنی بہنوں کے ساتھ بیٹھتی ہے اور ان کی کسی ایک شام کی کمائی سے اسے حصہ بھی ملتا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ وہ کیا کرتی ہے۔ لیکن میں اپنا ایمان خراب نہیں کرنا چاہتی۔ اس لئے میں ایسی بُری عورت سے دور رہتی ہوں۔"
بعد میں، میں اس زیرِبحث عورت سے ملی جس نے محلہ چھوڑ کراپنے ایک گاہک سے شادی کر لی تھی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ شروع میں اسے کافی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے اپنا پس منظر چھپانے کی بڑی کوشش کی، لیکن جب آس پاس کے لوگوں کو اس کا علم ہو گیا تو انہوں نے اس کا بہت تمسخر اڑایا۔ اُس نے کہا کہ شروع میں اُس میں خود اعتمادی نہیں تھی اس لئے اپنے ماضی کے حوالے سے ملنے والے ہر طعنے پر اسے رونا آ جاتا تھا، لیکن اب ایسا نہیں ہے۔
وہ بڑے اعتماد سے بولی، "اب مجھے کسی کی پروا نہیں ہے! میں اپنے گھر میں خوش ہوں۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اگر میں خود پروا نہ کروں تو کوئی اور بھی پروا نہیں کرتا۔ جو میرے دوست بننا چاہتے ہیں وہ بنیں، جو نہیں بننا چاہتے وہ بھاڑ میں جائیں۔ میں نے ان کے سماج میں شامل ہونے کے لیے بازار چھوڑا ہے۔ ایسی لڑکیوں کے بارے میں وہ کیا کہیں گی جو ان کے گھروں میں پیدا ہوتی ہیں مگر سڑکوں پہ دھندا کرتی ہیں۔"

باب ۲۳
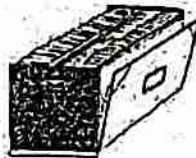
خوابوں کی کرچیاں

شالو انیس برس کی تھی۔ چودہ برس کی عمر میں پہلا گاہک اس کے پاس آیا تھا اور تب سے وہ اسی دھندے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کی دو بڑی بہنیں تھیں اور اس پیشے میں اس کی تربیت انہوں نے ہی کی تھی۔ وہ بچپن سے ہی اپنی بڑی بہن کا مشاہدہ کرتی رہی تھی کہ گاہک سے پیسے کیسے کھینچے جاتے ہیں۔ شالو اپنی بڑی بہن کو "گرو" مانتی تھی اور اس کی بہت عزت کرتی تھی۔

گھر والوں کے خیال میں شالو خوبصورت نہیں تھی۔ اس کے نین نقش تیکھے مگر رنگ سانولا تھا۔ لیکن مجھے اس کی ملاحت اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک بہت اچھی لگی۔ شالو نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ محلے والوں پر ثابت کر دے گی کہ کامیابی کے لیے حسن ضروری نہیں، وہ محنت کر کے کامیاب ہوگی۔ وہ بڑی محنت سے موسیقی کا ریاض کرتی تھی اور اپنے استاد کی تعظیم کرتی تھی۔

محلے کی دوسری لڑکیوں کی طرح شالو بھی ایک بڑی فلم اسٹار بننا چاہتی تھی۔ اس کی بڑی بہن کو فلموں میں ایکسٹرا کا رول کبھی کبھی مل جاتا تھا۔ شاہ نور اسٹوڈیوز میں اس کے خاندان کی جان پہچان کا ایک آدمی کام کرتا تھا۔ شالو کی رشتے کی ایک بہن کو فلموں میں رقص پیش کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔ اپنی بہن کے ساتھ وہ کبھی کبھی فلم اسٹوڈیو جاتی تھی مگر وہاں ہدایت کار اور دوسرے لوگ ان خواتین کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے اس پر اس کا دل جل جل کر رہ جاتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر کبھی وہ فلم اسٹار بنی تو ان کو مزا چکھا دے گی۔ وہ جانتی تھی کہ محنت کے ساتھ اس میدان میں قسمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

دس برس کی عمر میں ہی وہ سنگھار کرنے میں ماہر ہوگئی۔ بسنت کے تہوار پر وہ سولہ سنگھار کرتی اور خوب بھڑک دار کپڑے پہنتی۔ جب یہ تہوار فلم ایکٹریسیس بھی اپنے پرانے محلے میں مناتی تھیں تو شالو کا دل کھِل اٹھتا تھا۔ ”ایک دن، میں بھی ان کی طرح اسٹار بنوں گی“۔ وہ سوچتی۔

چودہ برس کی عمر میں، سانولے رنگ کے باوجود، اس کی نتھ اترائی کی معقول رقم ملی تھی۔ اس کی سہیلیاں حسد سے کہتی تھیں کہ اس کی قسمت اچھی ہے۔ مگر شالو کو معلوم تھا کہ یہ اس کی اپنی محنت کا پھل ہے۔ ایک مجرے میں جہاں یہ تینوں بہنیں گئی تھیں، شالو نے اپنے پہلے گاہک کو خود رجھایا تھا۔ یہ ایک رات کا سودا تھا۔ اس کے بعد شالو باقاعدہ دھندا کرنے لگی۔

شالو، فلم میں کام ملنے کی منتظر رہی مگر وہاں مقابلہ بہت سخت تھا۔ ان گنت لڑکیاں اور ان کی مائیں فلمی ایجنٹوں کے گرد پروانوں کی طرح گھومتی رہتی تھیں۔ خود شالو کی ماں اس کی بڑی بہنوں کی تصویریں لیے اسٹوڈیو کے چکر کاٹتی تھی۔ شالو کا تو اسے دھیان ہی نہ تھا جبکہ شالو اداکاری کے جوہر دکھانے کے لیے بے تاب تھی۔

بدنصیبی سے شالو کی ماں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کی دو بڑی بہنیں کمائیں اور شالو خاندان بڑھانے کے لیے اولاد پیدا کرے۔ وہ دونوں گوری جو تھیں۔ بھلا وہ اولاد پیدا کرنے میں اپنا حسن اور وقت کیوں ضائع کرتیں۔ شالو امید سے ہوئی تو بڑی بہن نے کہا: ”اگر لڑکی پیدا ہوئی تو وہ میری ہوگی“۔

لیکن شالو نے بیٹے کو جنم دیا اور اس کا بچہ لینے کا کسی نے ذکر بھی نہ کیا۔

ایک سال تک شالو اپنا دھندا دوبارہ کرتی رہی۔ ایک خوش شکل گاہک ملنے پر شالو کی ماں نے اُس پر دباؤ ڈالا کہ وہ اس گاہک سے حاملہ ہو جائے۔ شالو نے بہت احتجاج کیا، مگر اُسکی ماں کہنے لگی، ”تیری بہنوں کو فلم میں کام نہ بھی ملا تو کوئی وڈیرا یا رئیس انہیں ملازمت میں لے لے گا۔ ان کی صورت تو اچھی ہے۔ لیکن تُو کیا کرے گی؟“

اپنی مرضی کے خلاف، ٹوٹے ہوئے دل سے، شالو نے خاندان کے لیے پھر ہار مان لی۔

جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو وہ نویں مہینے کی حاملہ تھی۔ وہ خوش تھی کہ یہ مرحلہ اب طے ہونے والا تھا اور اسے اُس کی آزادی دوبارہ مل جائے گی مگر دکھی تھی کہ اسے ایک اور بچہ پالنا ہوگا۔ وہ دل شکستہ تھی کہ اسے اپنی مرضی کا کام نہیں کرنے دیا جا رہا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اسے موقع ملتا تو وہ ایک بڑی فلم اسٹار بن کر اپنے خاندان کی تقدیر بدل سکتی تھی۔

مجھے یہ خبر اسلام آباد میں ملی کہ شالو نے دوبارہ بیٹے کو جنم دیا ہے اور اس کے خاندان والے اس بات پر بہت ناراض ہیں۔ شالو کو پہلے ہی ڈر تھا کہ اگر دوبارہ بیٹا پیدا ہوا تو گھر والے اس سے بہت برا

سلوک کریں گے۔ اسی لیے وہ مزار پر کئی بار منت مان کر آئی تھی۔ وہ داتا صاحب کے دربار بھی جمعرات کو جا کر چراغ جلا کر آئی اور سوا گیارہ روپے کی منت بھی مانی۔ مگر خدا نے اس کی کوئی دعا قبول نہیں کی۔

میں اسلام آباد سے تین ہفتے بعد لاہور جا سکی۔ شالو کے بیٹے کے لیے میں نے کچھ رنگ برنگے کپڑے خریدے تھے۔

جب میں شالو کے گھر پہنچی تو وہ کہیں گئی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے انتظار کی ٹھانی اور اس کی ماں سے باتیں کرنے بیٹھ گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بچہ تو ایک ہفتہ ہوا فوت ہو گیا۔ میں یہ سُن کر حیران رہ گئی۔ اسکے گھر والوں کو بچے کی موت کا کوئی افسوس نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے اسکی زیادہ بات کی البتہ شالو کی ماں بولی: ''خدا کرے جلد دوسرا بچہ ہو جائے تو شالو کا غم غلط ہو۔''

''اور اگر پھر سے بیٹا ہوا تب؟'' میں نے پوچھا۔

''خدا نہ کرے۔ اب کی بار تو بیٹی ہونی چاہیے۔ اللہ پاک ہمارے ساتھ ایسی ناانصافی نہیں کر سکتا۔''

شالو واپس لوٹی تو اس نے اپنا سب دکھڑا مجھے سنایا۔ اس کے بچے کو نمونیہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس کا علاج کرانے پر بھی کوئی راضی نہ تھا۔ وہ مرض سے نہیں، لاپروائی کے باعث مر گیا تھا۔ شالو بہت دکھی تھی اور اپنے گھر والوں سے ناراض بھی۔

شالو کو زبردستی دوبارہ حاملہ ہونا پڑا۔ اس کے بچے کی موت کو دو مہینے بھی نہیں گزرے تھے۔ شالو بیمار رہنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے۔ وہ برسوں کی بیمار معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے مجھ سے یا اپنی دوسری سہیلیوں سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ وہ پُرکشش، سانولی ذہین لڑکی اب ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔

ایک بار سڑک پر میری اس سے ملاقات ہوئی تو اسے دیکھ کر مجھے بہت صدمہ ہوا۔ کیا شالو نے ہار مان لی تھی؟ مجھے ایسے لگا جیسے شالو کے خواب چکنا چُور ہو گئے ہیں۔

شالو نے تیسری بار بھی بیٹے کو ہی جنم دیا۔ کچھ عرصے بعد مجھے پتا چلا کہ اس نے خودکشی کر لی۔ میں تفصیلات معلوم کرنا چاہتی تھی مگر اس کے خاندان نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہی۔ ایک ذہین لڑکی امنگوں بھرا دل لیے دنیا میں آئی اور خوابوں کی کرچیاں لے کر رخصت ہو گئی۔

باب ۲۴
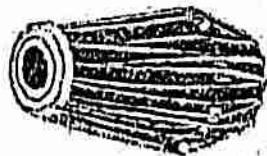
میرا ناکام منصوبہ

آہستہ آہستہ اس محلے کے باسیوں کی زندگی اور ان کے شب و روز سے میری واقفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اسلام آباد سے لاہور صرف ہفتے میں دو دن کے لیے چھٹی پر جاتی تھی لیکن میرے تعلقات یہاں رہنے والوں سے گہرے ہو گئے تھے۔ میرے واقف کاروں کی تعداد روز افزوں تھی اور ان میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ اب وہ مجھ سے اپنے دل کی گہرائی سے گفتگو کرنے لگے تھے۔

یہ چند مہینے جو میں نے تحقیقی دورے کرتے ہوئے گزارے تھے، خود میرے لیے بہت قیمتی اور معنی خیز تھے۔ اس محلے کے اسرار و رموز سمجھتے ہوئے مجھ پر پورے معاشرے کی درپردہ اقدار کا انکشاف ہو رہا تھا۔

میرے واقف کاروں میں طوائفیں اور سازندے، دونوں ہی شامل تھے۔ صرف وہ ہی مجھے قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے تھے، میں خود ان کو اچھی طرح جان لینے کے بعد ان پر بھروسا کرنے لگی تھی۔ اس موڑ پر میں نے سوچا کہ محلے کے شب و روز کا پوری طرح جائزہ لینے کے لیے کیوں نہ میں کچھ عرصے کے لیے وہاں خود رہائش اختیار کر لوں۔ بطور محقق مجھے یہی تربیت ملی تھی کہ جس گروپ کے بارے میں تحقیق کی جائے ان کی جائے رہائش میں کچھ عرصہ خود رہائش اختیار کرنے سے ان کی زندگی اور شخصیتوں کے متعدد روپوش پہلو سامنے آ جاتے ہیں اور تحقیق زیادہ جامع ہو جاتی ہے۔

ایک بار یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے شاہی محلے میں کمرہ کرائے پر لینے کی کوشش شروع کر

دی۔ میں چاہتی تھی کہ کمرہ میرے لیے محفوظ ہو اور مرکزی علاقے میں ہو۔ قیصرہ کے پڑوس میں ایک کمرہ خالی تھا۔ میں کرائے کی بات کرنے وہاں جا پہنچی۔

مالکہٴ مکان ایک ۳۵ سالہ خوش مزاج عورت تھی۔ اس نے مجھے محلے میں آتے جاتے دیکھا تھا لیکن وہ میرے کام کی نوعیت سے واقف نہ تھی۔ بات کرنے پر پتا چلا کہ شاید وہ منشیات کی عادی تھی۔ اس نے لڑکھڑاتی زبان سے میرا نام پوچھا اور کہا: ''تم یہاں رہو گی یا صرف کام کرنے کے لیے کمرہ چاہیے؟''

میں نے فوراً کہا: ''رہوں گی بھی اور کام بھی کروں گی۔''

''تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''اسلام آباد میں۔'' میں نے کہا۔

وہ فوراً بولی ''یعنی پنڈی میں۔ وہاں تو میری بھی ایک رشتہ دار قصائی گلی میں رہتی ہے (یہ پنڈی کی ہیرامنڈی ہے)۔ ہاں جی او تھے دھندا نئیں چلدا ہُن۔ پولیس والے بڑے بھیڑے نیں۔ (جی وہاں اب دھندا چل نہیں سکتا۔ پولیس والے بہت برے ہیں)''

میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے کیا سمجھ بیٹھی ہے مگر میں نے خاموشی مناسب سمجھی۔ مجھے اس گفتگو میں مزا آرہا تھا۔ یہ بھی معلوم ہو رہا تھا کہ ایک طوائف کو ایسے موقع پر کس قسم کے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس نے کہا: ''تم بھی میری طرح لاہور آ گئی ہو۔ میں بھی پنڈی کی رہنے والی ہوں۔ مگر میں لاہور میں قسمت آزمانا چاہتی تھی۔ وہ تو میرے پھوٹے نصیب کہ ایک جونک ساتھ چمٹی چلی آئی۔ تمہارے ساتھ تو کوئی جونک نہیں ہے جو خون ہی پی جائے؟'' ''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''دَلاّ!!'' اس نے چیخ کر کہا۔ پھر اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ اس کی توجہ مجھ پر سے بالکل ہٹ گئی۔ وہ دھیرے دھیرے بڑبڑاتی ہوئی کہیں کھو گئی۔

میں نے آس پاس کے کمرے دیکھے جہاں دوسرے لوگ رہ رہے تھے۔ یہ سب خاندان ایک ہی غسل خانہ استعمال کرتے تھے۔ میں نے سوچا یہ ذرا مشکل ہے مگر پھر خیال آیا کہ جب میں کئی بار گاؤں میں اپنی تحقیق کے دوران بغیر غسل خانے کے رہتی رہی ہوں، یہ تو پھر بھی غنیمت ہے۔

میری تلاش جاری رہی۔ میں ایک اور کمرہ دیکھنے گئی جس کے ساتھ ایک غسل خانہ تھا اور اس کا دروازہ سیدھا گلی میں نکلتا تھا۔ مجھے اس کمرے کے بارے میں چندا نے بتایا تھا۔ پچھلے کچھ مہینوں سے میں چندا کے بہت قریب آ گئی تھی۔ میں نے اس کو بہت ذہین پایا تھا۔ اُس پر اس کے خاندان کا دباؤ رہتا تھا مگر وہ پوری کوشش کرتی رہتی تھی کہ وہ دھندا بہترین طریقے سے کرے اور ایک دن اپنے گھر والوں اور برادری پر یہ ثابت کرے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کی طوائف ہے۔

چندا کا خاندان ایک بڑی عمارت کی پہلی منزل پر رہائش پذیر تھا۔ دو بہنیں جن کی عمریں چوبیس، پچیس کے قریب ہوں گی بطور رقاصہ اپنے پیشے کے آخری چند سال گزار رہی تھیں۔ ایک کے بچے تھے جن کے جوان ہونے کا وہ بہت بیتابی سے انتظار کر رہی تھی اور دوسری ابھی ان آخری سالوں میں اپنے دھندے پر پوری توجہ دے رہی تھی۔

یہ کمرہ اسی عمارت میں چندا کے گھر کے قریب ہی تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ پہلے وہ لوگ کہیں اور رہتے تھے لیکن مالک مکان نے انہیں یہاں اٹھ آنے کی دعوت دی اور کرایہ بھی بہت مناسب مانگا۔ چندا نے آنکھ مار کر کہا ''بڑا دیالو بندہ ہے۔ اپنے سیاسی اور کاروباری شریکوں کو بھی ہمارے ہاں بھیج دیتا ہے۔ ہم بھی ان کے ساتھ خصوصی سلوک کرتے ہیں۔ دونوں ہی فائدے میں رہتے ہیں۔''

چندا نے مجھے اپنا گھر اندر سے دکھایا۔ اندر وہی حال تھا جو بہت معمولی حیثیت کے لوگوں کے گھروں کا ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے کمرے، چارپائیاں، ایک پر ایک چڑھے سوٹ کیس، مگر مجھے اس کی خواب گاہ دلچسپ لگی۔ مغربی طرز کا ''بیڈ'' تھا جس کے بہت لمبے چوڑے سرہانے پر کندہ کاری کی ہوئی تھی۔ الماری بھی بہت بڑی تھی جو بیرونی ملکوں کے قیمتی میک اپ کے سامان اور عطریات سے اٹی پڑی تھی۔ چندا کی ایک بہن اس کمرے میں اس کے ساتھ رہتی تھی۔

میں نے چندا سے کہا: ''تم تو ساری کمائی میک اپ پر اڑا دیتی ہو گی!''

''نہیں تو'' چندا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تو ان چیزوں پر دھیلا بھی خرچ نہیں کرتی۔ یہ سب گاہکوں کے تحفے ہیں۔ لو جی!'' اس نے اضافہ کیا، ''خود ہی سب کچھ خریدنا ہوا تو یہ پیشہ کرنے کا کیا فائدہ؟ اس سے تو بندہ پھل وَل نہ بیچے؟'' ''ٹھیک کہتی ہو'' میں نے فوراً سر ہلا کر کہا۔

''میرے بہت سے گاہک نوکر شاہی کے لوگ ہیں۔ یہ لوگ زیادہ پیسے نہیں دیتے، ہاں تحفے دینے میں بہت اچھے ہیں اور پھر ان کا ذوق بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔ میری ایسی فرمائشیں خوشی سے پوری کرتے ہیں۔ جو میرے گاہک کاروباری ہیں ان کا ذوق تو بہت بُرا ہے۔''

''کاروباری''، میں نے کہا۔

''ہاں ہاں جو کاروبار کرتے ہیں''، چندا بولی۔ ''پیسے کے معاملے میں ان سے دیالو کوئی نہیں، مگر نا بابا، میں تو ان سے کبھی انکی پسند کا تحفہ نہ منگواؤں۔ وہ دوسرے گاہک تو انگریزی بھی مارتے ہیں اور اکثر سرکاری دوروں پر بیرونِ ملک بھی جاتے رہتے ہیں۔''

''کیا تم اپنی سہیلی کو چائے کے لیے نہیں کہو گی؟ کیا یہیں کھڑی رہو گی، اسے بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گی؟'' ایک بھاری سی آواز آئی۔ یہ چندا کی ماں تھی۔ بھاری جسم اور صاف رنگ کی ایک

عورت۔ میں نے ان کو سلام کیا۔ ہم دونوں چندا کے کمرے میں بیٹھ گئے۔ وہ اوپر سے نیچے تک مجھے کچھ دیر دیکھتی رہیں اور پھر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ چندا اپنی دھن میں مگن بولی: ''جانتی ہو مجھے مجرے کرنا بہت پسند ہے۔ مجھے طرح طرح کے لوگوں سے ملنا بہت اچھا لگتا ہے۔''

میں نے پوچھا: ''تمہیں سب سے اچھے گاہک کونسے لگتے ہیں؟''

''سب سے اچھے مجھے سُنار لگتے ہیں۔ میں بچپن سے ان کی کنجوسی کے محاورے سنتی آئی ہوں مگر یقین کرو ہم کنجریوں کے ساتھ وہ بڑے فراخدل ہیں۔ اپنا دل نکال کر ہماری طرف پھینکتے ہیں۔ اور ایک باران کا انکے دوست سے مقابلہ کرادو تو بس پھر نشہ ہے نشہ۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ ویلوں کی بارش کا کیا نشہ ہوتا ہے۔ مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا جب لوگ پانچ پانچ یا دس دس کے نوٹ پھینکتے ہیں پھر رقم بڑھوانا ایک مشکل ہو جاتی ہے۔ ہاں بات تو سو سو کے نوٹوں کی ہوتی ہے۔ اور پھر ہزار کے نوٹوں کی تو کیا بات ہے؟ بس وہ نشہ تو... کیا بات ہے؟ پھر تو میں بس ایک اور ہی جوش سے ناچتی ہوں۔''

چندا کی ماں کمرے میں دوبارہ آئی اور کہنے لگی، چندا کو باتیں کرنے کی بہت عادت ہے۔ تم اس کی باتیں سنتی رہی تو بھوکی رہ جاؤ گی!''

میں نے کہا: ''مجھے بھوک نہیں اور مجھے چندا کی باتیں سن کر بہت مزا آتا ہے۔'' ان کے کمرے سے باہر جاتے ہی چندا پھر شروع ہو گئی، ''صرف ایک گاہک کے ساتھ باہر جانے کی بجائے مجھے مجرے میں سب کے سامنے ناچنا بہت اچھا لگتا ہے۔ تبھی تو مجھے پتا چلتا ہے کہ میں اپنے کام میں اچھی ہوں۔''

''کیا تمھارے مجروں میں صرف مرد ہی آتے ہیں؟'' میں نے چندا کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں!'' چندا نے جواب دیا، ''مگر آجکل کچھ امیر، فیشن والے لوگ مرد اور عورتیں دونوں بھی بلا لیتے ہیں۔ میں ایسے ایک مجرے میں گئی تھی مگر مجھے ذرا مزا نہیں آیا۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ہمیں کسی چیز کی طرح دیکھتے ہیں، انسان کی طرح نہیں۔ مرد جیب سے پیسے اس لیے نہیں نکالتے کیونکہ اُنکی بغلوں میں ان کی بیویاں ہوتی ہیں اور عورتیں اس لیے پیسے نہیں نکالتیں کیونکہ ابھی عورتوں کو اس طرح کی محفلوں کی رِیت کا پتا ہی نہیں۔'' چندا نے ایک لمبی سانس لی اور پھر بولی: ''یہ رقص تو رقاصہ اور گاہک کے بیچ بات چیت ہے۔ گاہک رقاصہ کے ہر بھاؤ سے اثر قبول کرتا ہے۔ تمہیں دیکھنے میں شاید لگے کہ گاہک ویل دے رہا ہے، مگر اصل میں وہ میرے کسی خاص بھاؤ، نرت یا ادا کے جواب میں جیب سے پیسے نکالتا ہے۔ میری کوئی بات اس کا دل چھوتی ہے تو اس کا ہاتھ

جیب تک جاتا ہے۔ اور مجھے، اس بات کی زیادہ خوشی نہیں ہوتی کہ مجھے پیسے ملے بلکہ اس بات کی کہ میری ادا نے اس کے دل کو چُھوا اور میں کامیاب ہوئی۔ اگر میں اپنے کام میں اچھی نہ ہوں تو اس کا کوئی بھی ردِعمل نہ ہو۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟''

میں نے مسکرا کر کہا: ''لگتا ہے تمہیں اپنا کام بہت پسند ہے۔'' اس نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ مجھے یہ بات سمجھانے میں بہت محو تھی کہ اسے انسانوں کو سمجھنا، ان سے ربط پیدا کرنا اور پھر ان کو اپنی اداؤں سے پاگل کرنا ایسے ہی پسند تھا جیسے کسی مصور کو مصوری۔ وہ بولی، ''کبھی کبھی یہ خاندان میں گھس گھس کر بیٹھنے والے ہمیں مجرے کے لیے بلا لیتے ہیں اور ہماری رقم پہلے سے طے کر دیتے ہیں۔ پھر ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ویلوں کی ضرورت نہیں۔ چند لوگ یونہی اپنے شغل کے لیے اٹھ کر کچھ پیسے پھینک دیتے ہیں۔ میرے لیے اس سے زیادہ بور کام کوئی نہیں۔ اب تم خود ہی بتاؤ اگر مجھے ایک مخصوص رقم ہی ملنی ہے تو میں اچھا رقص کروں یا برا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب تک ویل نہ ملے مجھے کیسے پتا چلے کہ میرے رقص کے بھاؤ میرے دیکھنے والے کے دل کو چھو رہے ہیں یا نہیں۔ اور اسی کے سہارے میں آگے سے آگے بڑھتی ہوں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ ایسے مردہ دل تماش بینوں سے کیا لطف حاصل ہوگا جو رقص ختم ہونے پر ہاتھ اٹھا کر تالی بجا دیں اور پھر پہلے کی طرح ساکت ہو کر بیٹھ جائیں۔''

چندا اپنی باتوں میں گم تھی۔ اس نے پاؤں اوپر کیے اور آلتی پالتی مار کر زیادہ آرام سے بیٹھ گئی۔ کہنے لگی، ''میرے سب سے اچھے گاہک مجھے مجروں سے ہی ملتے ہیں جو میرے ساتھ لمبا چلتے ہیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں جو جادو جگایا جاتا ہے اس کی کیا بات ہے؟''

چندا کی ماں ہاتھ میں شربت کا گلاس لیے کمرے میں آئی اور وہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر اپنی بھاری سی آواز میں بولی: ''یہ چندا تمہیں کچھ نہیں کرنے دے گی۔ بہت باتیں کرتی ہے یہ۔''

میں نے کہا، ''جی نہیں، مجھے اس کی باتیں اچھی لگتی ہیں۔'' یہ کہہ کر میں چندا کی طرف مڑ گئی اور اُسے اپنی بات جاری رکھنے کو کہا۔ چندا کی ماں پاس ہی کھڑی رہی اور پھر ہماری باتوں میں مخل ہوتے ہوئے کہنے لگی، ''تمہیں کمرہ کیسا لگا؟''

''اچھا ہے، مگر ابھی میں نے ایک دو جگہیں اور بھی دیکھنی ہیں۔ ابھی تو میں چندا سے باتیں کرنا چاہتی ہوں''، میں نے یہ کہہ کر ایک دفعہ پھر منہ چندا کی طرف پھیر لیا۔

چندا کی ماں تھوڑی دیر مجھے گھورتی رہی اور یونہی گھورتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ شاید وہ کچھ پریشان ہے کہ چندا مجھ سے اتنی باتیں کیوں کر رہی ہے۔ مجھے

جمعرات کے دن درگاہوں پہ دیے جلانا اور پھول اور دیگیں چڑھانا طوائفوں کی روحانی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔
وہ بیٹی کی پیدائش کے لیے، امیر گاہکوں کے لیے اور فلموں میں کام حاصل کرنے کے لیے منتیں مانتی ہیں۔
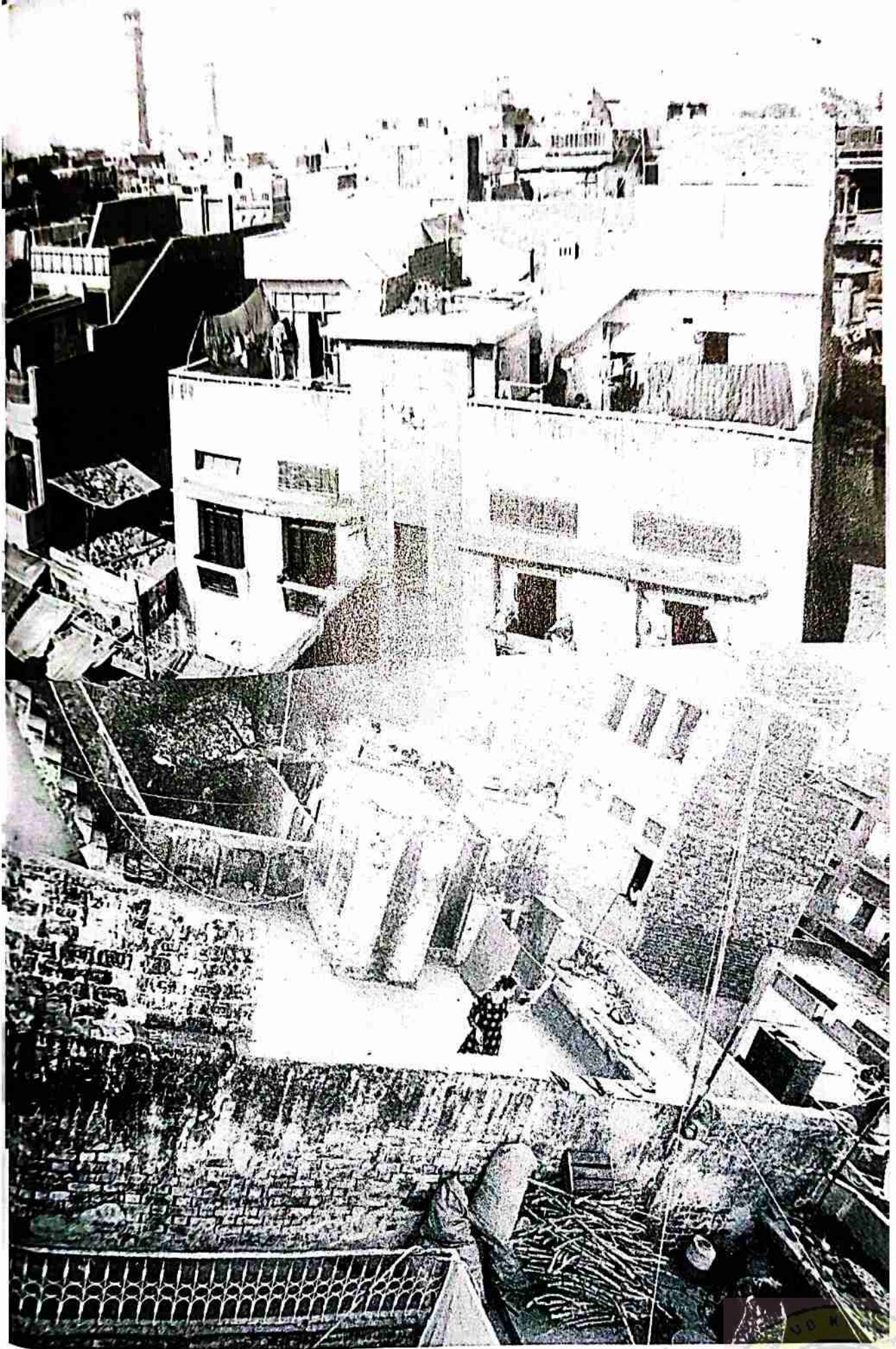
گھروں کے کوٹھے کاٹھ کباڑ سنبھالنے، کپڑے سکھانے، پتنگیں اڑانے اور ہمسائیوں کے ساتھ "آنکھ مٹکا لڑانے" کے کام آتے ہیں۔

اردگرد لوہے کے جنگلے کی مدد سے یہ کھلی جگہ بالکونی کا کام دیتی ہے۔

ہر منزل پر درمیان میں تازہ ہوا اور روشنی کے لیے چوکور شکل کی کھلی جگہ ہوتی ہے۔ (چھت کے اوپر سے منظر)
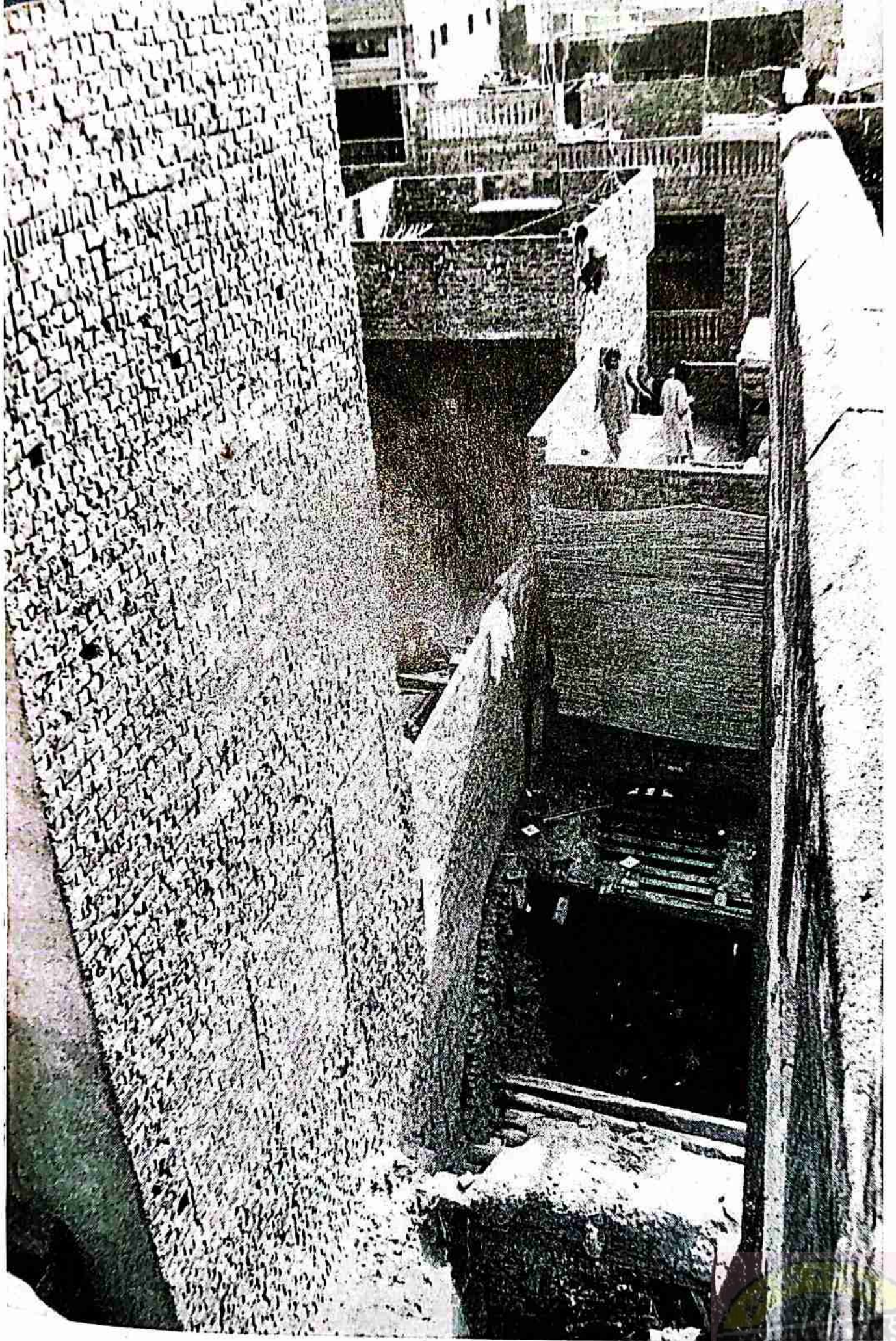
اونچے نیچے جڑے ہوئے کوٹھوں کی طرح ان لوگوں کی زندگیاں بھی آپس میں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔

خیال آیا کہ مجھے اور چندا کو باتیں کرنے کے مواقع اس کے گھر سے باہر ہی ملتے رہے ہیں، اس لیے اسکی ماں کو یہ اندازہ نہیں کہ میں چندا کی اچھی دوست ہوں۔شاید یہ معلوم بھی ہوتا تب بھی وہ فکر مند ہوتی۔اس ڈر سے کہ کہیں میں انکی بیٹی کے ذہن میں کوئی غلط قسم کا خیال نہ ڈال دوں۔ان کے ہاں ایسی دوستیاں پسند نہیں کی جاتیں۔بہر حال چندا کوئی ایسی بچی بھی نہیں تھی کہ اس کی ماں اب بھی اسکی پہریداری کرتی۔وہ تو خود اب آہستہ آہستہ نائیکہ بننے کی تربیت لے رہی تھی۔

میرا خیال چندا کی ماں کی بے اطمینانی کے بارے میں کچھ صحیح تھا۔اس نے کچھ دیر بعد چندا کو زور سے آواز دے کر باہر بلایا اور کہا ذرا جا کر کسی کے گھر سے ایک قمیض لے آئے جو اس نے نمونے کے لیے درزی کو دینی تھی۔وہ کہنے لگی کہ اس قمیض کا ڈیزائن اسے بڑا پسند آیا تھا۔چندا نے فوراً اسے کسی نوکر کو بھیجنے کو کہا مگر اس کی ماں نے اسے اونچی آواز میں ڈانٹنا شروع کر دیا اور اصرار کیا کہ وہ اسی وقت جائے۔یہ بات چیت اچھے خاصے جھگڑے میں بدل گئی۔دونوں کی آوازیں ماشااللہ محلے کی باقی عورتوں کی طرح کافی بھاری اور بلند تھیں۔

چندا تھوڑی دیر بعد واپس کمرے میں آئی جہاں میں اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔وہ جل کر بولی، ''میں اتنی بڑی ہوں مگر میری امی ابھی بھی مجھے بچہ ہی سمجھتی ہیں۔ابھی تمھیں زیادہ جانتی نہیں نا۔جب جان جائیں گی تب تنگ نہیں کریں گی۔خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔تماشہ تو وہ دیکھنے والا ہوتا ہے جب میں کسی مرد سے بار بار ملنے لگوں اور اس سے لمبی لمبی باتیں کروں۔''

''تمہارا مطلب کسی گاہک سے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بھی اور نہیں بھی!'' وہ سر کو ایک طرف جھکا کر ہنسی۔''میری امی کو بالکل اندازہ نہیں کہ کسی کو پسند کرنا کیا ہوتا ہے؟ پیار کیا ہے؟ بس ان سب باتوں سے انہیں بڑا خوف آتا ہے''۔

''کیا تم کافی دل پھینک ہو؟'' میں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔''نہیں!'' اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

''میں ایک اچھی طوائف ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔اگر تم سمجھتی ہو کہ میں دل پھینک ہوں تو ایسا بالکل نہیں ہے۔مگر میں ایک انسان ضرور ہوں۔دیکھو جب میں گاہکوں کے ساتھ ہوتی ہوں تو وہ بات اور ہے اور وہ تو ایک کھیل کی طرح ہوتا ہے جو دونوں کو معلوم ہوتا ہے۔دل لگانے کی باتیں تو الگ ہیں۔چھوڑو انہیں!''

مجھے اس بات پر ذرا حیرت تھی کہ ماں کے ساتھ اتنی تُو تُو میں میں کے بعد بھی چندا نہایت پُرسکون تھی۔مجھے البتہ ہر گھڑی اس بات کا احساس تھا کہ اس کی ماں ابھی بھی پریشان ہو رہی ہوگی۔

میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں وہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے اور پھر آئندہ چندا کو مجھ سے ملنے نہ دے، چندا سے اجازت چاہی۔

چندا نے بہت اصرار کیا کہ میں کچھ اور وقت اس کے ساتھ گزاروں مگر میں نے کہا: ''مجھے ابھی ہیرا منڈی میں ایک اور کمرہ دیکھنے جانا ہے جو کرائے کے لیے خالی ہے۔ پھر تم سے شام کو بیٹھک میں ملوں گی۔''

چندا کہنے لگی، ''فوزیہ، اگر تم برا نہ مناؤ تو مجھے تمھاری تحقیق کے نتائج میں بہت دلچسپی ہے۔ کیا تم مجھے بتاؤ گی تمہیں یہاں کیا ملا۔ میرا مطلب ہے تمھاری دریافتیں... یا جو کچھ بھی اسے کہتے ہیں جو کچھ تم تحقیق والے ڈھونڈتے ہو۔ مجھے تو یہی سوچ سوچ کر بہت مزا آتا ہے کہ کوئی باہر سے آ کر ہماری زندگیوں پر تحقیق کر رہا ہے۔ میرے لیے یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔ میں ضرور جاننا چاہوں گی کہ تمہیں کیا پتا چلا؟''

''چلو پھر پہلی گپ شپ آج بیٹھک میں لگے گی!'' میں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا اور چلی آئی۔ واپسی پر میں ہیرا منڈی گلی میں ایک کمرہ دیکھنے گئی مگر معلوم ہوا کہ جس نائیکہ نے مجھ سے بات کرنی تھی وہ داتا صاحب گئی ہوئی ہے۔

میں اپنے اس ''عظیم'' فیصلے پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی کہ میں خود شاہی محلے میں رہائش اختیار کرنے والی ہوں۔ میں نے بڑی محنت سے سارے ضروری اقدامات کیے تھے اور ایک سے زیادہ کمرے دیکھ رکھے تھے۔ اسلام آباد واپس لوٹتے ہوئے میں نے طے کر لیا تھا کہ کچھ عرصے بلا تنخواہ چھٹی لے کر پوری توجہ سے محلے میں تحقیق کروں گی۔ بلکہ میں نے تو دل ہی دل میں اس سامان کی فہرست بھی بنالی تھی جو مجھے اسلام آباد سے لانا تھا۔

مگر جب میرے خاندان والوں کو میرے ارادے کا علم ہوا تو ان پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ میری والدہ نے کہا: ''ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ تم اس تحقیق کے پیچھے بالکل دیوانی ہوتی جا رہی ہو۔'' لوک ورثہ کے دفتر میں میرے ساتھیوں کا بھی بالکل یہی ردِّ عمل تھا۔ میرے دوست حیرت زدہ رہ گئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ میں اس ارادے سے باز رہوں۔

اتنی شدید مخالفت نے مجھے چکرا دیا۔ آخر وہاں رہنے میں کیا خرابی تھی؟ میں وہاں آتی جاتی رہی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اگر کوئی عورت اس محلے میں رہنے لگی تو اسے زبردستی طوائف بنا دیا جائے گا۔ یا اس کو کوئی نہ کوئی نقصان ضرور پہنچے گا۔ مجھے یہ بات بالکل مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ میں اپنے فیصلے پر قائم تھی اور سوچ رہی تھی کہ ایک بار جب میں وہاں رہنے لگوں گی تو لوگ عادی

ہو جائیں گے اور پھر کچھ نہ کہیں گے۔

لیکن چند دن بعد میری ملاقات اپنے پرانے دوست امجد شاہ سے ہوئی جو پولیس کے اعلیٰ عہدیدار ہیں۔ جب میں نے ان کو اپنا ارادہ بتایا تو ان کی آنکھوں میں اچانک خوف کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ ''تمھیں خبر بھی ہے کہ کیا خطرہ مول لے رہی ہو؟'' انھوں نے پوچھا۔

''کیسا خطرہ؟'' میں نے کہا۔ ''میں اب ان لوگوں کو خوب جان پہچان گئی ہوں۔ میں بالکل محفوظ رہوں گی۔'' ''فوزیہ! تم میری بات پر یقین تو کرتی ہو نا؟'' ''جی ہاں! بالکل یقین کرتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہاں... تمہارا پولیس سے کبھی واسطہ پڑا؟'' ''ایک دو بار... انہیں میرا وہاں ہونا ناگوار لگتا ہے۔''

امجد شاہ نے مضبوطی سے کہا ''تمہارے ٹکڑے کر کے نالے میں بہا دیں گے اور کسی کو پتا بھی نہ چلے گا۔ بہادری اور بیوقوفی میں بہت فرق ہے۔ وہاں جو لوگ رہتے ہیں جنہیں تم اپنا دوست کہہ رہی ہو اُن کو خود بھی اندازہ نہیں کہ کس قدر منظم جرائم پیشہ طبقہ اس علاقے میں موجود ہے۔ مجھے یہ مت کہو کہ وہ جگہ ٹھیک ہے اور لوگ بڑے اچھے ہیں۔ میری بات غور سے سنو۔ کئی لوگوں کو تمہارا وہاں گھومنا پھرنا، لوگوں سے سوال پوچھنا اچھا نہیں لگ رہا۔ وہ اسے جاسوسی سمجھتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہی ہو یا نہیں؟'' میں نے سہم کر سر ہلایا۔

''لیکن وہ تمہیں ابھی ٹھیک سے جانتے نہیں، نہ ہی اس بات سے واقف ہیں کہ تم انہیں کتنا نقصان پہنچا سکتی ہو۔ پھر تم اُس علاقے سے باہر ہو، ان کا تم پر بس نہیں۔ ان کو یہ بھی اندازہ نہیں کہ تمھارا اثر و رسوخ کتنا ہے۔ اس لیے تم پر ہاتھ ڈالتے وہ گھبرائیں گے مگر ایکبار تم وہاں رہنے لگیں تو تم پھر دوسرے لوگوں کی طرح ہو جو وہاں رہتے ہیں اور وہ ان کا علاقہ ہے، اور وہ تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ یہ بہادری نہیں، اوّل درجے کی حماقت ہے۔ کیا تم واقعی اتنی زیادہ بیوقوف ہو کہ یہ منصوبہ بنا بیٹھی ہو؟''

میں نے آہستہ سے پوچھا: ''وہ'' کون لوگ ہیں؟ وہی، جن کا آپ ذکر کر رہے ہیں؟''

''ان میں پولیس بھی ہے، جرائم پیشہ لوگ ہیں، شہر کے بڑے بڑے نام ہیں جو سیاست میں بھی پیش پیش ہیں۔'' میں نے خوب لمبی سانس لی، پھر ہمت کر کے کہا: ''میں نے تو... بڑا محفوظ... کمرہ۔'' امجد شاہ نے میری بات کاٹ کر کہا: ''مجھے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا ہوں۔ صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ اگر تمہارے ساتھ کچھ ہو تو مجھ سے مدد کی امید نہ رکھنا۔''

یہ سن کر میرے ہوش سچ مچ ٹھکانے آ گئے۔ میرا منصوبہ کہ کمرہ خوب سجاؤں گی، اپنے موسیقار اور سازندے دوستوں کو مدعو کروں گی اور دیر تک بازار کا مشاہدہ کروں گی جو رات

کو بیدار ہوتا ہے، سب کچھ خاک میں مل گیا۔ مجھے علم ہوگیا کہ تحقیق کا یہ حصہ ممکن نہیں۔ افسوس!!

تاثرات

سماجی تحریک کی متحرک کارکن

ثریّا ایک سماجی تحریک کی فعال کارکن اور دو بچوں کی ماں ہیں۔

وہ عورتوں کے حقوق سے وابستہ ایک غیر سرکاری تنظیم میں کئی سال سے کام کر رہی ہیں۔ جب میں نے اُن سے جنسی کاروبار کے حوالے سے بات چیت کی تو انہوں نے کہا، "تم جانتی ہو کہ ہماری عورتوں کی تحریک نے کبھی طوائف کے پیشے پہ توجہ نہیں دی۔ بھارت میں عورتوں کی تنظیموں نے طوائف کے پیشے کے خلاف آواز اٹھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خاص طور پہ 'دیوداسیوں' کے نظام کے خلاف مگر ہمارے ہاں کئی دوسرے فوری توجہ طلب مسائل در پیش رہے۔"

میں نے کہا، "مغرب میں تو عورتوں کی تحریکیں طوائفوں کی طرفداری کر رہی ہیں اور اس سلسلے میں اُن کی تنظیمیں نئی پالیسیاں مرتب کرنے پہ زور دے رہی ہیں اور اُنکو دوسری پیشہ ور عورتوں کے طور پہ قبول کروانے کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ وہ ملکی معیشت میں حصہ لیتی ہیں تو اُنہیں 'کمرشل سیکس ورکرز' کہا جائے (اور یہ اصطلاح مغرب میں اب عام ہوگئی ہے) اور ان کو وہ مراعات دی جائیں جو دوسرے کام کرنے والوں کو حاصل ہیں۔ COYOTE (کال آف یوراولڈ ٹائرڈ ایتھکس) ایسی ہی ایک تنظیم ہے جو ۱۹۷۳ء میں وجود میں آئی اور عام عورتوں کی تنظیمیں بھی اُنہیں تسلیم کر چکی ہیں۔ لیکن عورتوں کے یہ دونوں گروہ جن دُور رس مقاصد کے لیے کام کر رہے ہیں ان میں کچھ تجزیہ کاروں نے واضح فرق پایا ہے۔'

"ہاں، یہ متضاد رائے ہے نا؟" انہوں نے کہا۔ "میں کہوں گی کہ ہم جنسی کاروبار کے خلاف ہیں لیکن طوائفوں کی مخالف نہیں ہیں۔ ہم انہیں تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھنا چاہتے۔ میں اس سلسلے میں اٹھائے گئے حکومتی اقدامات کی مخالفت کرتی ہوں۔ شاہی محلے میں رہنے والے افراد کو پولیس ہراساں کرتی ہے اور ان کو اپنا کاروبار قائم رکھنے کے لیے پولیس کو رشوت دینی پڑتی ہے۔"

میں نے پوچھا کہ وہ شاہی محلے یا اس طرح کے کسی دوسرے علاقے میں کبھی گئی ہیں تو ان کا جواب تھا: "میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ مجھے اس بارے میں زیادہ علم نہیں ماسوائے اس کے جو میں نے پڑھا ہے سنا ہے یا فلموں میں دیکھا ہے۔"

میں نے سوال کیا، "آپ کو معلوم ہے کہ تحریکِ نسواں سے تعلق رکھنے والی ہماری کارکن اس بارے میں ملی جلی کیفیات رکھتی ہیں۔ آپ اِن عورتوں کو ہراساں کیے بغیر کاروبار چلانے کی حمایت کرتی ہیں یا آپ چاہیں گی کہ حکومت طوائف کے پیشے کا خاتمہ کرے؟"

انہوں نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا: "دونوں نہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ طوائفوں کو اپنا پیشہ جاری رکھنا چاہیے۔ اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ میں جنسی کاروبار کی حمایت کرتی ہوں اور اس کی ترویج کے حق میں ہوں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتی۔ میں یہ نہیں مانتی کہ یہ دوسرے پیشوں کی طرح ایک پیشہ ہے۔ طوائف کا پیشہ عورتوں کا ناجائز استعمال ہے۔ چاہے براہ راست دباؤ کے ذریعے ہو یا سماجیت کے ذریعے۔ بالکل عریانیت (جاری)

کی طرح، آپ یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ یہ عورت اپنی مرضی سے کرتی ہے اور اسے اس کا معقول معاوضہ بھی ملتا ہے۔ ہمیں اس سطحی خیال کو نہیں ماننا چاہیے۔ وسیع تناظر میں یہ عورتوں کی تذلیل ہے جو عورتوں کو اس نظریے کو مضبوط کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے کہ 'عورت ایک جنسی شے رہے'۔ لیکن دوسری طرف جو حکومت کر رہی ہے پولیس کے ذریعے وہ بالکل غلط ہے۔ ان کی بحالی کا کوئی منصوبہ ہونا چاہیے۔"

پھرانہوں نے مجھ سے کہا، "تم ان پہ تحقیق کر رہی ہو مجھے امید ہے کہ ہم میں سے تم ہی اُن کے لیے براہِ راست کچھ کر سکو گی۔"

"میں یقینی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتی کہ میں کیا کرنا چاہوں گی۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا، "میرا خیال نہیں کہ ہمیں ان کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں ہمیں اپنے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ بہرحال اس بارے میں ابھی میرے خیالات اتنے واضح نہیں ہیں۔ آپ کی رائے انتظامیہ اور پولیس کی ہراساں کرنے کی حکمتِ عملی کے بارے میں بالکل صحیح ہے۔ ہمیں اس کی روک تھام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور میں یہ سب کچھ منظرِ عام پہ لا سکتی ہوں۔"

باب ۲۵

مٹّی کھانیاں

ایک دن میں استاد صادق کی بیٹھک میں ایک نوجوان گروپ کی موسیقی سن رہی تھی جو گٹار اور سنتھیسائزر سے لیس، "ماڈرن" موسیقی پیش کر رہے تھے۔ ان کے پاس ایک ڈرم سیٹ بھی تھا اور اس پر وہ سب سے زیادہ خوش تھے۔ ان کی آنکھوں میں مستقبل کے سنہرے سپنے تھے کہ بڑی بڑی دعوتوں، جیسے کسی شادی بیاہ میں وہ کیسے مدعو کیے جائیں گے۔

اسی دوران، قریب ہی، جہاں پمی رہتی تھی اس مکان کے اندرونی صحن میں اچانک ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اندر کوئی بڑی زوردار جنگ چھڑ گئی تھی۔ عورتوں کی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔

اب موسیقی کیا خاک سنائی دیتی۔ میں نے سوچا کہ ذرا لڑائی کی وجہ ہی معلوم کر لی جائے۔ میں اٹھ کر جائے واردات تک جا پہنچی۔ وہاں درجن بھر عورتیں اور مرد جمع تھے۔ اوپر جھروکوں سے بھی ان گنت عورتیں اور بچے جھانک رہے تھے۔ مقابلہ دو عورتوں کے درمیان تھا۔ ایک پمّی کی ماں تھی اور دوسری کوئی عورت تھی جسے میں نہیں پہچانتی تھی۔ وہ کوئی چالیس برس کی سانولی سلونی عورت تھی۔ ایک ہاتھ میں اس نے سگریٹ دبا رکھی تھی۔ جنگ کے تماش بینوں میں مجھے پمی کی چھوٹی بہن رضیہ نظر آئی۔

دونوں فریق پورے جوش اور جذبے سے لڑ رہی تھیں۔ دونوں کی آوازیں لحظہ بہ لحظہ بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر اکھاڑے میں پینترے بدلتے پہلوان کی طرح پمّی کی ماں نے ایک اسٹول اٹھا کر مخالف پر دے مارا۔ اسٹول عورت کے کاندھے پر پڑا اور پھر پانی کے ڈرم سے ٹکرا کر

ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ اس پر ہر طرف ایسی خاموشی چھا گئی کہ میرا تو دل ہی ڈوبنے لگا۔ سب لوگ سانس روکے انتظار کر رہے تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔

عورت نے اونچی آواز میں رونا پیٹنا شروع کر دیا اور پمی کی ماں پر غلیظ گالیوں کی بوچھاڑ کردی۔ پمی کی ماں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جو کچھ اس کے ہاتھ میں آیا مخالف پر دے مارا۔ چمٹا، جھاڑو، جوتا، سبھی کچھ دوسری عورت پر برسانے لگی۔ دوسری عورت بلبلاتی ہوئی پانی کے ڈرم کے پیچھے پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔

اب لوگ پمی کی ماں کو روکنے کے لیے دوڑے۔ پمی کی ماں میدان کے عین بیچ میں چھاتی تانے کسی چٹان کی طرح کھڑی تھی اور جو بھی اس کے پاس پہنچتا تھا اسے دھکا دے کر پرے دھکیل رہی تھی۔ چیخ و پکار اپنے عروج تک جا پہنچی تھی اور گالیاں تو اس قدر پیچیدہ ہوگئی تھیں کہ ان کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے لغت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اب سب لوگ اکٹھے چیخ رہے تھے۔ کچھ لوگ پمی کی ماں کو باز رہنے کی تلقین کر رہے تھے جبکہ دوسرے لوگ اس دوسری عورت کو بھاگ کر جان بچانے کا مشورہ دے رہے تھے۔

وہیں ایک دیوار کے ساتھ میں بھی کھڑی ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں ٹھیک سے نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ لڑائی کس بات پر تھی اور یہ ہو کیا رہا تھا؟ ان باتوں کا چونکہ مجھے چنداں علم نہ تھا اس لیے میں نے عافیت اسی میں جانی کہ خاموشی سے تماشا دیکھا جائے۔ پمی کی ماں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ''مٹی کھانی! گشتی! میں ایدے تے ترس کھانیاں تے ایہہ مینوں چکر دے گئی اے! (میں اس پر ترس کھاتی ہوں اور یہ مجھے ہی چکر دے گئی ہے!)'' ایک گالی وہ بار بار دیتی تھی: ''وڑ پانڈے وِچ'' (مجھے بعد میں علم ہوا کہ ''پانڈا'' دراصل ''بچے دانی'' کو کہتے ہیں۔ گویا وہ اس دوسری عورت کو اپنی ماں کی بچے دانی میں جا گھسنے کے لیے کہہ رہی تھی۔)

میرا خیال تھا کہ یہ دوسری عورت بھاگ جائے گی یا کہیں جا چھپے گی اور اپنی جان بچائے گی۔ لیکن میری توقع کے برعکس وہ چیخیں مارتی ہوئی پمی کی ماں کی طرف لپکی اور اس پر پل پڑی۔ جیسے کوئی گولی کسی ٹینک سے ٹکرائے، بس یہی عالم تھا۔ پمی کی ماں گوشت پوست کا ایسا تودہ تھی جسے یہ دوسری عورت ہلا بھی نہیں سکی۔ اس نے پمی کی ماں کے بال پکڑ کر کھینچنا شروع کیے اور اسے مارنے لگی۔ پانچ چھ لوگ دوڑ پڑے اور عورت کو گھسیٹ کر علیحدہ کرنے لگے۔ اس کے کندھے سے خون بہہ رہا تھا۔ ہڈی وغیرہ تو نہیں ٹوٹی تھی مگر چوٹ زور کی لگی تھی۔ آخر کار لوگ دونوں کو الگ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ دونوں نے دل کی کافی بھڑاس نکال لی تھی۔ کچھ عورتیں پمی کی ماں کو ایک طرف

لے گئیں اور اسے چارپائی پر بٹھایا، کچھ دوسری عورت کو دوسری طرف لے گئیں۔ ایک عورت اس کے کندھے کے لیے گیلا کپڑا لے آئی۔

جھگڑے کا تماشہ دیکھنے والے لوگ ایک کے بعد ایک بھیڑ لگاتے چلے جا رہے تھے۔ ہر نیا آنے والا پوچھتا "بات کیا تھی؟" ہر ایک کو جواب دیا جاتا۔ جو لوگ پہلے سے موجود تھے وہ نئے آنے والوں کو ایک آدھ جملے میں لڑائی کی وجہ بتا دیتے۔ اس پر نو وارد اپنا تبصرہ کرتا بلکہ دونوں فریقین کو مفت مشورہ بھی پیش کر دیتا۔

اب تک مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اس دوسری عورت کا نام رانی ہے۔ وہ ایسی کسبی تھی جن کا اپنا ٹھور ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ وہ سڑک سے گاہک پھنساتی ہیں۔ پمی کی ماں اسے اپنے گھر کا کمرہ کرائے پر دے دیتی تھی۔ اسی بات سے اس جھگڑے کا تعلق تھا۔ لیکن میری سمجھ میں اب بھی پوری بات نہیں آ رہی تھی۔ اس وقت تو مشکل سے شام کے چار بجے ہوں گے۔ دن کے وقت تو یہ عورتیں دھندا نہیں کرتیں۔ پھر اس وقت کیا ہوا ہوگا؟

پمی کی بہن رضیہ ایک پنکھا لے آئی تھی اور ماں کا جوش ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے پنکھا جھل رہی تھی۔ تماش بینوں کی بھنبھناہٹ کے علاوہ اب میدانِ جنگ میں خاموشی طاری تھی۔ وہاں کھڑے ایک بڈھے نے بچوں کی طرف دیکھا جو اس جنگ سے بے حد محظوظ ہوئے تھے اور بلند آواز سے کہا:

"ذرا دیکھو! بچے بھی ہنس رہے ہیں تم دونوں پر! توبہ توبہ!! تمہیں شرم نہیں آتی؟ بچوں کے سامنے ایسی ایسی گالیاں نکالی ہیں..." یہ کہہ کر وہ بیزاری سے واپس لوٹنے کے لیے مُڑا ہی تھا کہ ایک چپل تیر کی طرح ہوا میں اڑتی ہوئی آئی اور اس کی پیٹھ پر تڑ سے پڑی۔ بڈھا اچھل پڑا۔ ایک تیز آواز گونجی۔ "تُو دخل دینے والا کون ہوتا ہے؟ ہیں؟ تو اس کا بھڑوا ہے؟ اس کا یار ہے تو؟" بڈھے نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور "کشتیاں! کشتیاں! کشتیاں!" بڑبڑاتا ہوا وہاں سے کھسک گیا۔

فریقین اب تک کچھ ستا چکے تھے۔ اب پمی کی ماں نے چیخنا شروع کیا۔ "اس نے جھوٹ بولا مجھ سے، مجھے دھوکا دیا اور میں برسوں سے اس کے ساتھ اتنا اچھا چلی!" رانی نے چیخ کر کہا:

"ارے، اُس حرامی نے تم سے جھوٹ بولا ہے۔" پمی کی ماں چلائی "چُپ کر بھوتنی دی!"

لوگوں نے رانی کو خاموش کروا دیا۔ پمی کی ماں نے بکھرے بالوں کو ٹھیک کرتے ہوئے روزمرہ کی آواز میں کہا: "خدا کا تو کسی کو خوف ہی نہیں رہا۔"

پھر اس نے رضیہ پر عجیب سی نظر ڈالی جو بڑی فرمانبرداری سے اسے پنکھا جھل رہی تھی۔ "میرے سَر پر کیوں سوار ہے تو؟ رہنے دے یہ چونچلے!" یہ کہہ کر اس نے رضیہ کو پرے دھکیل دیا۔

رضیہ چارپائی پر لڑھک کر بوکھلاسی گئی۔
وہاں کھڑے ایک سازندے شکور نے تبصرہ کیا۔
''چلو جی! گھر چلیں۔ تماشہ ختم ہوگیا ہے۔ اب یہ سانڈنی ہمیں ٹکریں نہ لگائے کہیں...''
شکورا اسی گروپ کا تھا جس کی نئی موسیقی، میں تھوڑی دیر پہلے سن رہی تھی۔ وہ چلنے لگا تو بھیڑ میں راستہ بناتی ہوئی میں بھی اس کے ساتھ بیٹھک میں واپس لوٹ آئی۔ استاد وہیں بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہنس کر مجھ سے کہا: ''کیوں؟ مزا آیا؟ یہ ہماری تفریح ہے...''
نہ جانے کیوں، مجھے ہنسی نہیں آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کیوں نہیں آئے وہاں؟''
استاد ہنسا۔ اس نے کہا: ''بھئی آوازیں تو یہیں سے سن لیں۔ اتنا ہی کافی ہے۔ میں دونوں کو خوب جانتا ہوں۔ پمی کی ماں رانی کو کمرہ کرائے پر دیتی ہے۔ رانی ٹھہری مٹی کھانی! رانی جیسوں کو مٹی کھانیاں کہتے ہیں۔''
''اچھا!'' میں نے کہا: ''دس فی صد کمائی دینی بندھی تھی۔ کمرہ کوئی آدھے گھنٹے کے لیے ملتا ہے۔'' اس پر ایک سازندے نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''آدھا گھنٹہ کہاں! دس منٹ کہو۔''
''چپ کر!'' استاد نے اس کو تنبیہ کی۔ اس پر کوئی کھی کھی کر کے ہنسا۔ استاد نے کہا: ''میری بات نہ کاٹو۔ تو میں بتا رہا تھا بی بی فوزیہ! کہ اگر مٹی کھانی کو سو روپے ملیں تو دس روپے کمرہ دینے والی کے ہوئے۔ اب رانی کو کل رات ایک گاہک ایسا بدبخت ملا کہ مٹی کھانی رانی کو بھی دھوکا دے گیا۔ سودا ہوا تھا سو روپے کا اور وہ بعد میں صرف دس روپے دے کر چلتا بنا۔ پمی کی ماں کو ملا ایک روپیہ۔ اس سے کسی نے کہہ دیا کہ سودا تو سو روپے کا طے ہوا تھا۔ بس جی۔ اسے آ گیا جلال! یہ بات تھی۔''
''تو کیا...'' میں نے حیرت اور افسوس سے کہا ''یہ سارا جھگڑا... صرف نو روپوں پر تھا!!''
استاد اور دوسرے سازندے اب دوبارہ نئی دھنیں بنانے میں مصروف ہو چکے تھے۔ میں وہاں سے اٹھ کر چلی آئی، مگر میں رانی کو بھول نہیں سکی۔ میں سوچ رہی تھی: ''کیا پمی کی ماں یہ نہیں جانتی؟ نہیں... وہ خوب جانتی ہوگی کہ رانی کے درجے کی طوائفوں سے دھوکا ہوسکتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گاہک بعد میں پورے پیسے نہ دے۔ پھر اس نے رانی کو ہی جھوٹا کیوں سمجھا؟''
رانی جیسی ''مٹی کھانیاں'' ٹبی کے علاقے میں رہتی ہیں۔ یہاں تنگ و تاریک گلیوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ ان میں جو بڑی گلی ہے اسے ٹبی گلی کہا جاتا ہے۔ یہاں بسنے والی عورتیں ناچ گانے کے تکلف میں نہیں پڑتیں۔ بہت کم پیسوں پر وہ صرف جنسی خدمات سرانجام دیتی ہیں۔ سو دو سو سے صرف دس روپے تک ان کی قیمت ہوتی ہے۔

اپنی تحقیق کے دوران میں جب پہلی بار اس گلی میں گئی تھی تو اس کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے ایک عجیب احساس ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ موت کی گلی ہو۔ اس کے در و دیوار پر موت کا ایک احساس چھایا ہوا تھا۔ گلی بالکل خالی تھی جیسے کوئی طوفانی ہوا اس میں چلنے پھرنے والوں کو کہیں اڑا لے گئی ہو۔ لوگ وہاں رہتے ضرور تھے۔ دروازوں پر بوسیدہ پھٹے ہوئے پردے نظر آ رہے تھے۔ میں دو قدم ہی چلی ہوں گی کہ پیچھے سے ایک پولیس والے کی بھاری کراری آواز آئی۔

''اندر جانا منع ہے۔'' پیچھے آفیسر مجھ سے کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ یہ سخت احکامات دیئے گئے ہیں کہ اس گلی میں کسی کو داخل نہ ہونے دیا جائے۔

''لیکن میں گاہک تو ہو نہیں سکتی۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''مجھے یہاں سے گزرنے سے کیوں روکا جا رہا ہے؟''

بڑی مشکل سے مجھے وہاں سے گزرنے کی اجازت ملی لیکن مجھ سے سختی سے کہا گیا کہ کسی سے بات کرنے کی کوشش نہ کروں۔ میں خاموشی سے چاروں اطراف نگاہیں ڈالتے ہوئے وہاں سے گزری۔ چھوٹے چھوٹے کمروں کے مکان تھے۔ ایک منظر ذہن پر نقش سا ہو گیا ہے۔ ایک ادھ کھلا دروازہ، جس میں کوئی اسّی سالہ بڑھیا بیٹھی تھی۔ اس کے بال ایسے میلے کچیلے اور بدرنگ تھے جیسے برسوں سے نہ دھوئے گئے ہوں۔ دونوں ٹانگیں سامنے پھیلائے، آگے کی طرف جھکی ہوئی، وہ ہولے ہولے جھوم رہی تھی۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آ رہی تھی۔

شام کے وقت ان گھروندوں میں رہنے والی عورتیں باہر گلی میں نکلتی ہیں اور اگر کوئی گاہک مل جائے تو اسے فوراً اندر لے جاتی ہیں۔ اندر کمرے ہمیشہ نیم تاریکی میں ڈوبے رہتے ہیں تاکہ گاہک کو چہرہ یا جسم صاف نظر نہ آ سکے۔ اس گلی میں عمر سے اتری عورتیں جوں توں اپنا آپ بیچ پاتی ہیں۔ چہرے کی جھریاں چھپانے کے لیے منہ پر گہرا میک اپ تھوپ کر، چھاتیوں کو بھرا بھرا اور سخت ظاہر کرنے کے لیے بلاؤز میں اون کے گولے ٹھونس کر، ڈھلی ہوئی عمر کی عورتیں جوں توں گاہک پھنساتی ہیں اور اندر لے جاتی ہیں۔ کمرے میں پہنچ کر وہ گاہک کے ساتھ پورا لباس بھی نہیں اتارتیں۔

یہ تھی وہ گلی جہاں پہنچ جانے کے خوف سے شاہی محلے کی ہر طوائف کانپ اٹھتی تھی۔ جوانی تو کسی کی بھی سدا قائم رہنے والی نہ تھی لیکن اگر انہیں اپنی آخری عمر ٹبی گلی سے بچانا ہو تو ان کے لیے ضروری تھا کہ مناسب وقت پر طوائف کے پیشے کو خیرباد کہہ کے نائیکہ کی حیثیت اختیار کر لیں۔

رانی اسی ٹبی گلی میں رہتی تھی۔ وہ چالیس برس کی تھی مگر پچاس کی نظر آتی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور جھریوں بھری جلد... ایسا لگتا تھا جیسے کسی آگ نے اسے جھلسا دیا تھا۔ اس نے مجھے

اپنی زندگی کی کہانی سنائی۔

وہ پنجاب کے ایک گاؤں کی تھی۔ اس کی عمر چودہ سال کی تھی کہ اسے رفیق سے عشق ہوگیا۔ لوک تھیٹر کرنے والوں کا ایک ٹولہ ان کے گاؤں آیا تھا جس میں رفیق بھی شامل تھا۔ رفیق اداکار یا گائیک نہ تھا۔ وہ اس ٹولی کے لیے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔ اس کی دو رشتہ دار عورتیں تھیٹر میں ناچتی تھیں۔ وہ لاہور کے شاہی محلے کی تھیں۔ رفیق ان کے ساتھ ہی پھرتا تھا۔ اور ان کے پیشے کے سب اسرار و رموز جانتا تھا۔ وہ خود شاہی محلے میں پلا بڑھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورت کا جسم آمدنی کا اچھا ذریعہ بن سکتا ہے۔ شاید اس نے ابتدا سے ہی دلال بننے کا ارادہ کرلیا تھا۔

گاؤں میں تھیٹر گروپ کو صرف چار دن رکنا تھا۔ یہیں گاؤں کے بازار میں رفیق کو رانی ملی جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ اس کے میٹھے بولوں نے رانی پر تو جادو ہی کر دیا تھا۔ جیسے اسے اپنے خوابوں کا شہزادہ مل گیا ہو۔ رانی اس چھوٹے سے گاؤں کی گھٹن سے دور شہر جانے کا سپنا دیکھا کرتی تھی۔ رفیق نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اسے شہر لے جائے گا جہاں وہ اپنی ایک نئی دنیا بسائیں گے۔

چار دن بعد جب تھیٹر گروپ گاؤں سے رخصت ہوا تو رانی اپنے گھر والوں کو سوتا چھوڑ کر منہ اندھیرے رفیق کے ساتھ چلی گئی۔ تھیٹر والوں کو اگلے گاؤں تک پہنچ کر معلوم ہوا کہ رفیق گاؤں کی ایک لڑکی کو اپنے ساتھ لے آیا ہے تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ انھوں نے رفیق سے کہا کہ وہ فوراً ان کی ٹولی چھوڑ کر کہیں دور چلا جائے۔

رفیق رانی کو لے کر اکیلا ہی شہر کی جانب چل پڑا۔ رانی کو یاد تھا کہ وہ غیر آباد سنسان دیہاتی علاقوں میں کس طرح کھائیاں پھلانگتی، جھاڑیوں سے الجھتی ہوئی رفیق کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ انہیں خوف تھا کہ پولیس نہ پکڑلے۔ رانی کو یہ بھی یاد تھا کہ راستے میں اسے تیز بخار چڑھ آیا تھا۔ وہ کہیں کسی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹی تھی جہاں کھٹملوں نے کاٹ کاٹ کر اس کا بُرا حال کر دیا تھا۔ لیکن واقعات کی ترتیب اس کے ذہن سے محو ہوگئی تھی۔ رانی کی یادیں کسی ٹوٹے ہوئے ہار کے موتیوں کی طرح بکھری ہوئی تھیں۔

آخر کار، وہ لاہور تو نہیں، لیکن کسی دوسرے شہر جا پہنچے تھے۔ رفیق نے اس سے شادی نہیں کی تھی۔ اس شہر میں اس نے رانی کے کنوار پن کی قیمت چکانے کے لیے گاہک ڈھونڈھ لیا تھا۔ اس کے بعد وہ رانی کو شاہی محلے میں لے آیا تھا۔ یہاں کچھ عرصے اس نے رانی کی دلالی کی تھی۔ پھر وہ کسی دوسرے دلال کے حوالے کر دی گئی تھی۔

اس کے بعد کے واقعات رانی کی یادداشت میں بے ترتیب تھے۔ اتنا اسے ضرور یاد تھا کہ

ایک گاہک اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ لیکن تب ہی نہ جانے کہاں سے رفیق پھر نمودار ہوگیا۔ رانی نے بہت چاہا کہ اس سے پیچھا چھڑا لے مگر شاید وہ بہت عیار تھا اور رانی سمجھدار نہیں تھی۔ وجہ کچھ بھی تھی، مگر نتیجہ یہی تھا کہ رفیق چار برس تک مزید رانی کی دلالی کرتا رہا۔

چار برس بعد، جب رفیق رانی کی دلالی سے خاطر خواہ رقم حاصل نہ کرسکا تو اس نے رانی کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور آخر ایک دن اسے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا۔

وہ دونوں شاہی محلے میں کرائے کے ایک کمرے میں رہا کرتے تھے، جہاں اب رانی بالکل خالی ہاتھ اکیلی رہ گئی تھی۔ مالک مکان کرائے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ رانی کی طبیعت خراب تھی۔ اسے کوئی پوشیدہ جنسی روگ بھی لگ گیا تھا۔ ایک رات تیز بخار کی حالت میں اس نے منہ پر میک اپ تھوپا اور گلی میں جو پہلا گاہک ملا اسے لے کر اندر آ گئی۔ اس رات رانی تیز بخار کی حالت میں نیم بیہوش تھی۔ دوسری صبح اسے تکیے پر سو روپے کا نوٹ پڑا ملا۔ یہ نوٹ لے کر وہ مالک مکان کے پاس پہنچی اور کمرے کی چابی اس کے حوالے کرتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ کمرہ خالی کر رہی ہے اور اسے بس یہ رقم ہی دے سکتی ہے۔ مالک مکان نے چابی تو لے لی مگر وہ نوٹ اس نے رانی کو واپس کر دیا۔

''جا بھئی جا! اس نے کہا۔ ''تو بہت بیمار ہے۔ جا کر کہیں اپنا علاج ولاج کروا لے۔''

رانی ایک پچاس سالہ عورت کو جانتی تھی جو ٹبی میں رہتی تھی اور اس عمر میں بھی جوں توں پیشہ کر رہی تھی۔ وہ گاہک حاصل کرنے گلی میں بھی نہ جاتی تھی۔ دروازے کے پردے کے پیچھے سے جھانکتی رہتی تھی۔ پردے کی اوٹ سے ہی سودا ہوتا تھا۔ وہ گاہک کو اندر نیم اندھیرے کمرے میں بلا لیتی تھی۔

اس عورت کے گھر رانی آہستہ آہستہ ٹھیک ہوگئی۔ یہ عورت دن میں بہت کم بات کرتی تھی۔ اس کے بدن میں رعشہ آ گیا تھا اور ٹھیک سے چلا بھی نہ جاتا تھا۔ رانی ٹھیک ہوگئی تو اس عورت کی مدد کرنے کے لیے اس کے لیے کبھی کبھار کھانا پکانے لگی، گو زیادہ تر وہ تندور سے ہی دال روٹی خرید کر کھا لیتی تھیں۔ گھر میں کھانا پکانے کی نسبت بازار سے معمولی کھانا خریدنا ان کو سستا پڑتا تھا۔ رانی اب دوبارہ دھندا کرنے لگی تھی۔ لیکن ایک دن جب وہ بازار سے کھانا خرید کر گھر پہنچی تو اس نے کمرے میں اپنی دوست کو مردہ پایا۔ وہ بیٹھی ہوئی حالت میں مر گئی تھی۔ اس کا بدن آگے کی طرف جھکا ہوا تھا اور سر گھٹنے پر جا لٹکا تھا۔

رانی کمرے میں عورت کی لاش دیکھ کر سکتے میں آ گئی۔ پھر وہ کمرے سے نکلی اور باہر بھاگ گی۔ وہ کسی صورت بھی اس کمرے میں واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ ایک بس میں بیٹھ کر وہ ملتان جا پہنچی۔ کچھ دن وہاں ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ واپس لاہور آ گئی اور اپنے پرانے محلے کے

پھیرے لگانے لگی۔

یہ تھی رانی... جو پمی کی ماں سے کمرہ کرائے پر لیتی تھی اور کمائی کا دس فیصد اسے دیتی تھی۔ کمرہ صاف ستھرا تھا اس لیے اسے اپنے دام بھی بہتر مل جاتے تھے۔ جو کچھ وہ کماتی تھی اس سے رانی کی خوراک اور سگریٹوں کا خرچہ نکل آتا تھا۔

''پمی کی ماں کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''شاید وہ اس بات کو بھلا دے! میں چاہتی ہوں کہ یہ کمرہ مجھے کرائے پر ملتا رہے۔''

باب ۲۶

پمّی کے گھر میں

میں رانی کے لیے کئی مہینے سے فکر مند تھی اس لیے ایک دن پمی کے گھر جا پہنچی تا کہ اس کی ماں سے بات کروں۔ اس کی ماں مجھ سے بڑے اخلاق سے ملی۔ وہ اپنی مقررہ ''چوکی'' پر، دروازے کے پاس چارپائی ڈالے، صحن میں ہر آنے جانے والے کا جائزہ لے رہی تھی۔ پمی اور اس کی چھوٹی بہن باہر گئی ہوئی تھیں۔

''پمی تو کبھی گھر پر ہوتی ہی نہیں۔'' میں نے کہا ''میں آج بھی اس سے نہیں مل سکوں گی۔''

''نہیں۔'' پمی کی ماں نے کہا۔ ''وہ استاد جی کی بیٹھک تک گئی ہے۔ ابھی آنے والی ہی ہوں گی۔''

''کیا یہ سبق کا وقت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''سبق تو وہ دیر سے لیتی ہیں۔ اس وقت تو شو کی تیاری کر رہی ہیں۔ استاد جی شو پر لے جا رہے ہیں ان کو۔''

''کیا وہی شو جس کے لیے نیا میوزک بنایا جا رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اونہہ! نیا ہو کہ پرانا۔ ہمیں اس سے کیا۔ ہمیں تو اتنے ہی پیسے ملنے ہیں۔''

میں آہستہ آہستہ اسے رانی کے موضوع پر لانا چاہتی تھی۔ میں نے پہلے اس سے پوچھا کہ کیا محلے کی گلیوں میں اب بہت سی کسبیاں گھومنے لگی ہیں۔

''ہاں!'' اس نے کہا۔ ''جانے ہمارے محلے کا پیچھا کیوں پکڑا ہے ان مٹی کھانیوں نے۔

ارے کہیں اور جا کر اپنا دھندا کریں۔ یہ محلہ ناچنے گانے والیوں کا ہے۔ ان کو کیا آتا ہے؟ کچھ بھی نہیں! اپنے پیچھے پولیس کو بھی لگا لاتی ہیں۔ ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ پہلے مجھے ان پر رحم آتا تھا لیکن اب نہیں آتا۔ ان کی وجہ سے ہمارا کاروبار بھی خراب ہو رہا ہے۔''

پمی کی ماں نے اپنے سب سے چھوٹے والے بیٹے کو آواز دی۔ نکر پر کرتا پہنے وہ ننگے پاؤں اپنی بہن سونی کے ساتھ صحن میں آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ پمی کی ماں نے اپنے پلّو کی گانٹھ کھولی اور کچھ رقم نکال کر اس کے حوالے کی اور پھر نوٹ گنتے ہوئے کہا: ''جاؤ، ماسی شیداں کو دے آؤ۔'' رقم شاید کچھ کم نکلی۔ وہ باقی کے پیسے اندر سے لانے کے لیے یہ کہتی ہوئی اٹھی۔ ''اس گشتی سے کہنا... میں کرایہ وقت پر بھیج رہی ہوں۔ اس لیے اب کوئی بڑ بڑ نہ کرے۔''

میں اسے ایک سوٹ کیس کھول کر پیسے ڈھونڈتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔ باقی کے پیسے لے کر وہ واپس لوٹی تو بری طرح ہانپ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا: ''اچھا! تو رہنے دے۔ میں تیری بڑی بہن کو بھیجتی ہوں۔''

اس نے اپنی بڑی بیٹی کو بلایا جو دھندے سے لگ چکی تھی۔ پمی کی ماں نے پیسے اس کے حوالے کر کے کہا: ''نامراد سے کہہ دینا کہ پمی کا خاندان کرایہ دیتا ہے۔ مفت میں نہیں رہ رہا۔'' اور ساتھ گالیوں کی ایک بوچھاڑ کی۔ سونی نے ماں سے پوچھا ''میں وی نال چلی جاواں؟ (میں بھی ساتھ چلی جاؤں؟)''

ماں نے گالی دے کر اسے منع کر دیا۔ سونی منہ لٹکائے واپس صحن میں چلی گئی مگر بھائی کے ساتھ اپنا کھیل اب اس نے دوبارہ شروع نہیں کیا۔ وہ دس برس کی رہی ہوگی۔ معصوم چہرہ اور دلکش مسکراہٹ اس کے بچپن کے غماز تھے۔ تیکھے نین نقش، گورا رنگ اور بالوں میں سرخی کی جھلک... وہ واقعی بہت حسین تھی۔ سونی ایک خوش باش بچی تھی مگر اسے میری موجودگی میں ماں کا جھڑکنا اچھا نہیں لگا تھا۔

پمی کی ماں اندر جانے آنے کی مشقت سے تھک گئی تھی۔ اس نے چیخ کر کہا: ''ذرا ایک گلاس پانی لا۔'' سونی دوڑتی ہوئی نلکے سے پانی کا گلاس بھر لائی۔ جب اس کی ماں غٹ غٹ کر کے پانی پی رہی تھی تو سونی نے ایک دلربا انداز میں مسکرا کر مجھے دیکھا اور اپنے شانوں کو جنبش دی۔

پمی کی ماں آرام سے بیٹھ گئی تو میں نے اس سے رانی کے بارے میں پوچھا:

''رانی کمرے میں آتی ہے؟ آجکل اس کا دھندا تو کچھ چل نہیں رہا۔''

پمی کی ماں نے ایسے اطمینان سے میری بات کا جواب دیا جیسے مجھے ان کے درمیان ہونے والی خطرناک جنگ کا کچھ علم ہی نہ ہو۔ کہنے لگی: ''میں تو اسے کمرہ دے دیتی ہوں، مگر سنا ہے اس

نے بازار کے نکڑ پر کوئی سستا کمرہ دیکھ لیا ہے۔ میں دسواں حصّہ لیتی تھی۔ یہ کون سی زیادہ رقم ہے؟ میری بھی کچھ کمائی ہونی چاہیے کہ نہیں؟ ہر چیز کے پیسے لگتے ہیں، خرچہ ہوتا ہے۔ کمرے کی دیکھ بھال، صفائی ستھرائی میں ہی کتنے پیسے خرچ ہو جاتے ہیں۔ آخر ہمیں بھی زندہ رہنا ہے۔"

میں نے کہا: "جب وہ آئے تو میرا اسلام کہیے گا۔ اور یہ بھی کہ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ اس کا کوئی پتا نہیں جہاں میں اسے ملوں۔"

"پتا؟" پمی کی ماں نے منہ بنا کر کہا "آپ کو پتے کی کیا ضرورت ہے؟ ان گلیوں میں ہی تو پھرتی رہتی ہے مٹی کھاتی ہر رات، پولیس سے چھپتی چھپاتی..."

پمی کی ماں سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد میں صحن میں نکل آئی۔ میں نے ایک چارپائی پر بیٹھ کر سونی کو بلایا اور اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی۔

"کیا تمہارا بھی کوئی استاد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں جی!" اس نے شوق سے بتایا۔ "میں استاد صاحب کے پاس جاتی ہوں۔ ہم کل چھ لڑکیاں ہیں۔ استاد جی کہتے ہیں میں سب سے اچھی ہوں۔"

"آج بھی سبق لینے جاؤ گی" میں نے بات بڑھائی۔

"نہیں جی۔ آج ہماری چھٹی ہے۔ کل استاد جی شو کریں گے۔ آج اس کی تیاری ہو گی۔ اس لیے ہماری چھٹی!" سونی نے بتایا۔ پھر اس نے کہا: "اور کل بھی چھٹی ہو گی۔"

"کل کیوں؟" میں نے پوچھا۔

سونی کی آنکھیں چمکنے لگیں پھر وہ ہنس پڑی۔ اس نے کہا: "اگر آج تیاری کرنے کے لیے چھٹی دی ہے تو کل کیسے سبق دیں گے؟ وہ دوسرے شہر میں شو نہیں کر رہے ہوں گے؟"

اس پر میں بھی ہنس پڑی۔ میں نے پوچھا: "تم اسکول بھی جاتی ہو؟"

"نہیں جی۔" سونی نے کہا۔ "چوتھی جماعت تک پڑھا تھا اسکول میں، پھر ابا نے چھڑوا دیا۔"

پمی کی ماں نے چیخ کر کہا "اری سونی! تو کیوں فوزیہ باجی کا مغز کھا رہی ہے!"

میں نے کہا "کیا یہ استاد جی کی بیٹھک تک جا کے پمی کو بلا کر لا سکتی ہے؟ میں بڑی دیر سے اس کا انتظار کر رہی ہوں۔"

پمی کی ماں نے سونی کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ شلوار کے پائینچے سنبھالتی، دوپٹہ گلے میں لپیٹتی ہوئی دوڑ گئی۔ میں دوبارہ پمی کی ماں کے پاس آ بیٹھی۔ میں نے کہا:

"سنا ہے آپ رضیہ کی شادی کرنے والی ہیں؟"

"کس سے سنا ہے؟" پمی کی ماں نے چونک کر کہا۔
"ایسے ہی... باتوں باتوں میں... یہیں کے لوگ کہہ رہے ہیں۔ کیوں؟ کیا یہ راز کی بات ہے؟"
پمی کی ماں نے لمبی سانس لے کر کہا: "نہیں جی! اس میں چھپانے کی کیا بات ہے۔ اس کا باپ کوشش کر رہا ہے۔ مگر جو بندے وہ لاتا ہے۔ وہ مجھے پسند نہیں آئے۔ سارے نو دولتیے ہیں۔ ایسے لوگ بھروسے کے قابل نہیں ہوتے۔ جب تک میری پوری تسلی نہیں ہوتی، میں رضیہ کی شادی نہیں کروں گی۔"
میں نے پوچھا "یہ صاحب، جن کا آپ ذکر کر رہی ہیں، کیا واقعی رضیہ کے باپ ہیں؟"
پمی کی ماں نے تیوری چڑھا کر کہا: "سال بھر سے تو تم یہاں آ رہی ہو۔ اب بھی ایسے سوال پوچھتی ہو؟ کون کس کا باپ ہے، اس جھگڑے میں نہ ہی پڑو تو اچھا ہے۔"
میں شرمندہ ہوگئی اور فوراً بولی: "میرا مطلب تھا... کیا آپ نے اُن سے شادی کی ہے؟"
پمی کی ماں نے کہا: "اس کے بارے میں میں کسی سے بات نہیں کرتی ہوں۔ اپنی ہی طرز کا بندہ ہے وہ! دوسرے لوگوں سے تم نے ضرور اس کی برائیاں سنی ہوں گی۔ لیکن وہ ایسا برا نہیں ہے۔ میری ایک رشتے کی بہن کے کوٹھے پر آتا تھا۔ وہیں سے اس نے ان لڑکیوں کے دھندے میں میری مدد شروع کی۔ یہ دھندا آسان نہیں ہوتا۔ ہمارا تو اپنا ذاتی کوٹھا بھی نہیں تھا۔ اب بھی کام کونسا آسان ہے! کمرے کرائے پر اٹھا کر گزارہ کر رہے ہیں۔ خیر، یہ ہمارے مسائل ہیں۔"
میں خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے اس "شوہر" کے بارے میں کسی سے بات نہیں کرتی۔ محلے کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے خیال میں وہ ایک بدمزاج، منشیات کا عادی، جھگڑالو دلّال تھا۔ اس محلے میں اس کی دوستی بھی نہیں تھی۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا محلے سے باہر رہنے والے دوسرے دلالوں میں تھا۔
پمی کی ماں مجھے سمجھانے لگی: "پمی کے لیے گاہک سے سودا کرنا آسان نہ تھا۔ سارے دلے بس پیسہ ہتھیانا چاہتے ہیں۔ اپنا حصہ لے کر چین سے نہیں بیٹھتے۔ میں نے سوچا اس سے تو اچھا ہے اس بندے کو ساتھ ہی رکھ لوں۔ میری مدد کر دیا کرے گا۔ ایسا برا بھی نہیں ہے۔"
اتنی دیر میں سونی اور اس کے پیچھے پیچھے رضیہ اور پمی بھی آ پہنچی۔ سونی دوڑتی ہوئی آئی تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی مگر میرا کام کرنے پر اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ رضیہ اور پمی سے گپ کرتے ہوئے میں دیکھ رہی تھی کہ یہ چھوٹی سی لڑکی بڑوں میں شامل ہونے کے لیے کتنی بے قرار تھی۔
میرے کہنے پر اپنی بہنوں کو استاد کی بیٹھک سے لے آنے پر وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔

میں نے رضیہ سے چپکے سے کہا" روبا! تمہاری بڑی تعریفیں کر رہا تھا۔ کہتا تھا کہ تم بہت ہی اچھا گاتی ہو۔"

رضیہ روبا کا نام سن کر شرما گئی مگر سونی زور سے ہنسی۔ اس نے جھک کر سرگوشی کی: "باجی! رُوبا رضیہ کو پرچے لکھ لکھ کر بھیجتا ہے۔"

رضیہ نے سونی کو چپت لگا کر کہا" بکواس!!"

سونی کلکاری بھر کر ہنسی۔ اس نے کہا: "باجی! قسم سے، وہ چٹھیاں میں ہی تو لاتی ہوں۔ روبا نے کہا تھا ماں کو پتا نہ چلے۔"

"ہوں!!" میں نے رضیہ سے کہا۔ "تو روبا نے بات آگے بڑھائی ہے!"

میری بات سن کر رضیہ نگاہیں جھکا کر مسکرائی۔ موضوع اتنا نازک تھا کہ میں نے سوچا اس سے پھر کبھی تنہائی میں مزید بات کروں گی۔ مگر موقع ملنے پر میں نے پمی سے پوچھا: "اس داستان کا کیا انجام ہوگا؟"

پمی نے کہا: "امّاں کو شک پڑ گیا ہے کہ رضیہ کو عشق ہو گیا ہے۔ یقین تو انہیں نہیں ہے مگر ابّا کو روبا کا بار بار ادھر آنا اچھا نہیں لگتا۔ اماں اس بات پر ابّا سے ناراض ہے، مگر وہ خود کسی گاہک کو جانتی نہیں۔ کرے تو کیا کرے! رضیہ کی نتھ اتروائی پر روز گھر میں جھگڑا کھڑا ہوتا ہے۔"

پمی نے بتایا: "ابھی حال ہی میں ایک موٹی اسامی ابّا کی وجہ سے ہاتھ سے نکل گئی۔ جب سے یہ آدمی یہاں رہنے لگا ہے، تب سے اماں نے دوسرے دلالوں سے ملنا جلنا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

پمی کو امّاں کا یہ "ساتھی" اچھا نہ لگتا تھا لیکن پمی کی ماں پولیس والوں سے تنگ آ کر گھر میں قید ہو گئی تھی۔ باہر والوں سے سودا کرنے کے لیے اسے "مرد" چاہیے تھا۔ خواہ وہ اس آدمی جیسا منشّیات باز ہی کیوں نہ ہو۔

باب ۲۷

رَت جگا

چندا نے مجھے اپنے گھر ایک تقریب میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ اس کا ایک منہ بولا بھائی بیماری سے صحت یاب ہوا تھا اور اب اس خوشی میں چندا اپنے گھر ''رت جگا'' کر رہی تھی۔

شاہی محلے کی یہ ایسی تقریب تھی جس میں گاہکوں کی موجودگی کے بغیر ناچ گانا ہونا تھا، سو میں نے خوشدلی سے یہ دعوت قبول کر لی اور بہت اشتیاق سے تقریب کا انتظار کرنے لگی۔ گاہکوں یا کسی مالی فائدے کے بغیر اس محلے کے باسیوں کے خوشیاں منانے کا مشاہدہ کرنے کا یہ ایک نادر موقع تھا۔

میں گیارہ بجے استاد صادق کی بیٹھک میں پہنچی۔ ہم نے یہی طے کیا تھا کہ میں اس تقریب میں استاد جی کے ساتھ جاؤں گی۔ چونکہ جب میں نے ان سے پوچھا تھا کہ کیا وہ بھی رت جگے میں جائیں گے تو انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ چندا کے استاد ہیں اور چندا کی تقریب میں ان کی شمولیت ان پر لازم ہے۔

استاد صادق کے شاگرد، نوعمر سازندے بڑے اشتیاق سے تقریب میں روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ جوش و خروش سے تمام ضروری ساز و سامان اکٹھا کر رہے تھے اور رت جگے میں اپنی موسیقی پیش کرنے کے خیال سے بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

چندا کے گھر میں، بڑے کمرے کے تمام سامان کو اس رات کے اہتمام میں کہیں اور رکھ دیا گیا تھا۔ کمرے میں ''ماڈرن'' بینڈ کے ساز رکھے گئے تھے۔ ایک بڑا خوبصورت سرخ ڈرم پورے

کمرے کی زینت بڑھا رہا تھا۔

چندا کے مہمان رقص کے لیے تیار تھے۔ وہاں چند کرسیاں بھی رکھی تھیں مگر یہ لوگ یا تو کھڑے تھے اور یا چہل قدمی کر رہے تھے۔

مہمان عورتیں زرق برق کپڑوں میں ملبوس تھیں اور مہمان مردوں نے ریشمی کرتے پہن رکھے تھے (یوں بھی اس محلے میں مغربی لباس کوئی مرد نہیں پہنتا۔ صرف فلم میں موسیقی دینے والے اپنے آپ کو ممتاز کرنے کے لیے اسٹوڈیو جاتے ہوئے پتلون قمیض یا جینز پہن لیتے ہیں)۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں گہنوں اور گوٹے کناری کے کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ بچیوں کا خوب میک اپ کیا گیا تھا۔ ان کی آنکھوں پر بھی گہرا نیلا اور سبز آئی شیڈ لگایا گیا تھا۔ اور ہندی فلموں کی نقل کرتے ہوئے ان کی پیشانیوں پر بندیاں بھی لگا دی گئی تھیں۔

موسیقی ایک دھماکے کے ساتھ شروع ہوئی اور ایک بہت خوبصورت نوجوان نے گانا شروع کیا۔ وہ ہندوستانی پنجابی گیت گا رہا تھا جو زیادہ تر انگلینڈ میں مقیم دیسیوں نے تیار کیے ہیں۔ اور جو ہندوستان اور پاکستان، دونوں ہی ملکوں میں بہت مقبول ہوئے ہیں۔ اس نوجوان کی آواز اتنی عمدہ تھی اور موسیقی پر اس کی گرفت اس قدر اعلیٰ درجے کی تھی کہ میں مسحور ہو کر رہ گئی۔ ذرا سی ہی دیر میں رقص شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے چندا نے کمرے کے وسط میں آ کر رقص کا آغاز کیا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ رقص کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ آن کی آن میں تمام مہمان خوشی سے سرشار ہو کر رقص کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر نوٹ بھی نچھاور کر رہے تھے اور چندا کے صحت یاب ہونے والے بھائی کے سر پر سے وار کر نوٹ ہوا میں اچھال رہے تھے۔

رات کے ایک بجے کے بعد مہمانوں کے دوسرے ریلے کی آمد شروع ہوئی۔ یہ ایسی عورتیں تھیں جو گیارہ بجے سے ایک بجے تک اپنے ''آفس'' میں کام کرتی رہی تھیں۔ چندا نے انہیں پیار بھری جھڑکیاں دیں۔

''کنجوسو! کتنی خسیس ہو! ایک رات کے لیے بھی دھندا نہیں چھوڑ سکتی تھیں؟ جو میری سچی سہیلیاں ہیں، انہوں نے آج کام نہیں کیا۔ وہ تو گیارہ بجے سے یہیں ہیں۔'' ان میں سے کچھ نے چندا سے معذرت کی اور کچھ نے پلٹ کر جواب دیا، ''ہم تمہاری طرح امیر نہیں!''

میں اس خوشیوں بھری رات میں دو بجے تک شامل رہی جس کے بعد میں واپس آ گئی۔ اس وقت تک ناچ گانا اور نوٹوں کی بارش ایک لمحہ کو بھی نہ رکی۔

چند دن بعد دعوت کے لیے چندا کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے میں اس کے گھر گئی۔ چندا

کی بہن کسی ممبر پارلیمنٹ کی حاضری کے لیے پرتکلف سنگھار میں مصروف تھی۔ باتوں باتوں میں رت جگے والی رات کے گائیک کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے کہا: ''بڑا حسین جوان تھا۔ اور کتنا اچھا گاتا ہے! میں تو حیران رہ گئی۔'' اتنا سننا تھا کہ چندا کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ ذرا سی دیر میں اُس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ میں بالکل سٹپٹا گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے ایسی کیا بات کہہ دی ہے جو چندا رونے لگی ہے۔

چندا کی بہن نے آئینے کے سامنے بیٹھے بیٹھے لاپروائی سے کہا: ''رونے دو اسے۔ روئے گی نہیں تو اور کیا کرے گی۔ اوس میراثی نال پھسی اے۔ (اُس میراثی کے ساتھ پھنسی ہے)۔''

''وہ میراثی نہیں، کنجر برادری کا ہے۔'' چندا نے چیخ کر کہا۔

''خوب!'' چندا کی بہن طنز سے ہنسی۔ ''چلو میراثی نہ ہوا کنجر ہوا۔ تیرے لیے تو شرمناک یوں بھی ہے اور یوں بھی!''

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی: ''فوزیہ! تم اس پاگل کو سمجھاؤ۔ یہ ہم سب کا نام ڈبو رہی ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ پھر میک اپ میں مصروف ہوگئی۔ چندا اب زور زور سے سسکیاں لے رہی تھی۔ میں نے اسے پانی پلا کر چپ کرانے کی کوشش کی تو وہ مجھ سے کہنے لگی: ''ہے تو کتنا سوہنا! ہیں نا؟'' اور پھر رو پڑی۔

اس کی بہن نے پھر طنزیہ قہقہہ لگایا۔ ''ہائے!!'' اس نے کہا۔

چندا مجھ سے کہنے لگی۔ ''فوزیہ! دل پر کس کا زور چلتا ہے۔ پیار تو بس ہو جاتا ہے۔''

پھر سنبھل کر بولی ''تم نے اس کا کُرتا دیکھا تھا؟ کتنا اچھا لگ رہا تھا اس کرتے میں!! میں نے بنوا کر دیا تھا۔ مجھے پتا تھا وہ کُرتا اس پر بہت ہی سجے گا۔'' وہ پھر روئی۔

مجھے چندا سے بڑی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ ''تم کرو گی کیا؟'' میں نے پوچھا۔

اس پر چندا پھٹ پڑی: ''اس کی پوجا کروں گی رات دن! وہ میرا دیوتا ہے!''

چندا کی بہن نے غصے میں جھڑک کر کہا: ''بکواس نہ کر گشتی! دیوتا ہے! ہونہہ!!''

میں خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کسی سے عشق کرنا تو یہاں بُرا سمجھا جاتا ہی ہے، مگر اپنی ہی برادری کے کسی لڑکے سے عشق کرنا تو اتنی ہی بڑی گالی ہے جیسے کسی میراثی سے عشق کرنا۔ اس نظام میں کنجر یا میراثی سے عشق کرنے کو بہت حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔

میں نے چندا سے پوچھا: ''اور وہ لڑکا، وہ کیا کہتا ہے؟''

''وہ بے چارہ تو بے بس ہے۔'' چندا نے کہا۔ مزید آنسو اس کے رخساروں کو تر کر گئے۔

چندا کی بہن سنگھار میز سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''بے بس؟ ہرگز نہیں۔'' اس نے سختی سے کہا۔

''وہ تو اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ وہ تو یہی گشتی ہے جس کا اپنے دل پر قابو نہیں چلتا۔''

چندا نے التجا کی: ''ایسا مت کہو۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔''

''اچھا ہوتا جو ماں اس کا گلا گھونٹ دیتی۔ ویسے ماں جانتی ہے کہ اس بندے کو اس میں دلچسپی نہیں ہے۔ اسی لیے وہ خاموش ہے۔ فوزیہ! یہ میری چھوٹی بہن ہے، مگر سارے خاندان کو اس نے اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ امی کو تو یوں بھی دل کی تکلیف رہتی ہے۔ آخر یہ سب کچھ چندا کیوں کر رہی ہے۔ جبکہ وہ لڑکا اس کو جوتی کی نوک پر بھی نہیں رکھتا۔''

''یہ جھوٹ ہے!'' چندا نے کہا۔ ''وہ بھی مجھے چاہتا ہے۔ اور میں... میں اس سے پیار کرتی ہوں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اماں کچھ بھی کہے، میں... اس کے بغیر... زندہ نہیں رہ سکتی...''

یہ کہتے ہوئے وہ بے قراری سے رو رہی تھی۔ ''میں اپنی جان دے دوں گی!'' چندا نے کہا۔

چندا کی بہن نے اسے جھڑکا: ''کس کے لیے جان دے رہی ہے؟ اسے تو پروا بھی نہیں۔''

''تم اسے کب سے جانتی ہو؟'' میں نے چندا سے پوچھا۔

''تین سال سے۔'' چندا نے کہا۔ ''وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ بہت چھوٹی عمر کا تھا تب...''

چندا کی بہن نے اس کی بات کاٹی: ''ہاں! چھوٹی عمر کا تھا تب یہ لڑکا۔ چندا بائیس برس کی تھی اور وہ صرف سترہ سال کا تھا۔ چندا اس سے زیادہ تجربہ کار تھی مگر اس کے بھولے پن پر ریجھ گئی۔ لیکن اب وہ پہلے والا معصوم لڑکا نہیں رہا ہے۔ اب وہ بھی تجربے کار ہے۔ حسین ہے، بہت اچھا گاتا ہے۔ ترقی کرنا چاہتا ہے۔ دنیا میں آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اب وہ تم سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

''میں... میں اس کی مدد کروں گی۔ قدم قدم پر ساتھ دوں گی۔'' چندا نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں چندا!'' اس کی بہن نے کہا۔ تم اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاؤ گی۔ ایک پچیس برس کی عورت کو ساتھ لے کر وہ کہاں جا سکتا ہے؟ وہ دلال نہیں، گلوکار ہے۔ میں تمہاری بہن ہوں۔ اس لیے تمہیں دنیا کا برا بھلا سمجھانا چاہتی ہوں۔ اس نے کل ہی تم سے کہا ہے کہ تم اس کا پیچھا چھوڑ دو۔ تمہیں سمجھایا ہے کہ اس معاشقے کا اب اختتام ہو چکا ہے۔ چوتھی یا پانچویں بار اس نے صاف لفظوں میں تم سے یہ بات کی ہے۔ مگر تم یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہو۔ اپنے آپ کو دھوکا دیے جا رہی ہو۔ وہ زندگی میں آگے بڑھنا چاہتا ہے اور تم اس کے پیر کی زنجیر بن گئی ہو!''

چندا یہ سن کر خاموشی سے روتی رہی۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی: ''میرے استاد نے کہا تھا 'یا کسی کو اپنا کر لو، یا کسی کے ہو جاؤ' اگر میں اسے اپنا نہیں کر سکتی تو اس کی ہو تو سکتی ہوں!''

اس کے چند مہینے بعد میں نے سُنا کہ وہ خوش شکل گلوکار کراچی منتقل ہو گیا ہے جہاں وہ ایک

نئے گروپ میں شامل ہو کر گاتا ہے۔

چندا نے خودکشی کی کوشش کی اور پوری برادری میں ہلچل مچ گئی۔ اس کے گھر والوں نے اس کی جان تو بچا لی مگر چندا میں اس کے بعد بہت بڑی تبدیلی آ گئی۔ اس کے دوستوں کا کہنا تھا کہ اس جذباتی بحران کے بعد چندا میں ایک پراسرار قسم کی طاقت آ گئی ہے۔ اس سے ملنے پر میں نے بھی محسوس کیا کہ وہ بہت کم گفتگو کرتی ہے مگر اس کی مشاہدہ اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت زیادہ ہو گئی تھی۔

میں چاہتی تھی کہ اس کے زخم وقت کے ساتھ ساتھ بھر جائیں اور جب بھی اس سے ملتی تو اس کا دل بہلانے کے لیے ہر طرح کی گفتگو کرتی رہتی۔ اپنی تحقیق سے متعلق باتیں اس سے میں نے صرف اس وقت دوبارہ شروع کیں جب میرا تجزیہ آخری مرحلوں میں تھا۔

باب ۲۸

رضیہ اور سونی

استاد گامن نے ہم سب کی دعوت کی۔ انہیں ایک فلم میں دو گیتوں کی موسیقی دینے کی پیشکش کی گئی تھی اور اس خوشی میں وہ اپنے شاگردوں کی دعوت کر رہے تھے جس میں وہ خاص الخاص اپنے ہاتھ سے مرغی پکا کر کھلانے والے تھے۔ اس تقریب میں استاد جی نے مجھے بھی بلایا۔

دعوت والے دن استاد جی کی بیٹھک میں بڑی رونق تھی۔ گھر بھر میں لذیذ طعام کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ میں دروازے کے پاس بیٹھی جاجی اور اکرم سے گپ لڑا رہی تھی۔ میں نے پوچھا:

"روبا نظر نہیں آ رہا؟ کہاں ہے وہ؟"

جاجی ہنسی مذاق کی باتیں کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گیا۔ "وہ شہر میں نہیں ہے۔ باہر چلا گیا ہے۔ اب وجہ نہ پوچھئے گا۔"

میں نے سوچا وہ گانے کے لیے باہر گیا ہوگا۔ یہ سب سازندے، گلوکار اور موسیقار کام کے سلسلے میں لاہور سے باہر جاتے ہی رہتے تھے۔

جاجی نے موضوع بدل دیا: "فوزیہ جی! ایک بار آپ ہم سے ہیجڑوں کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ آپ تو موسیقاروں، یعنی ہم لوگوں پر تحقیق کر رہی ہیں۔ ہیجڑوں کے بارے میں کیوں پوچھ رہی تھیں؟"

کسی نے فقرہ کسا: "کیونکہ ہم میں سے کچھ لوگ ہیجڑے لگتے ہیں۔" اس پر محفل میں ایک

کم مالی حیثیت کی طوائفیں ناچ گانے کی بجائے صرف جنسی خدمات ہی انجام دیتی ہیں۔
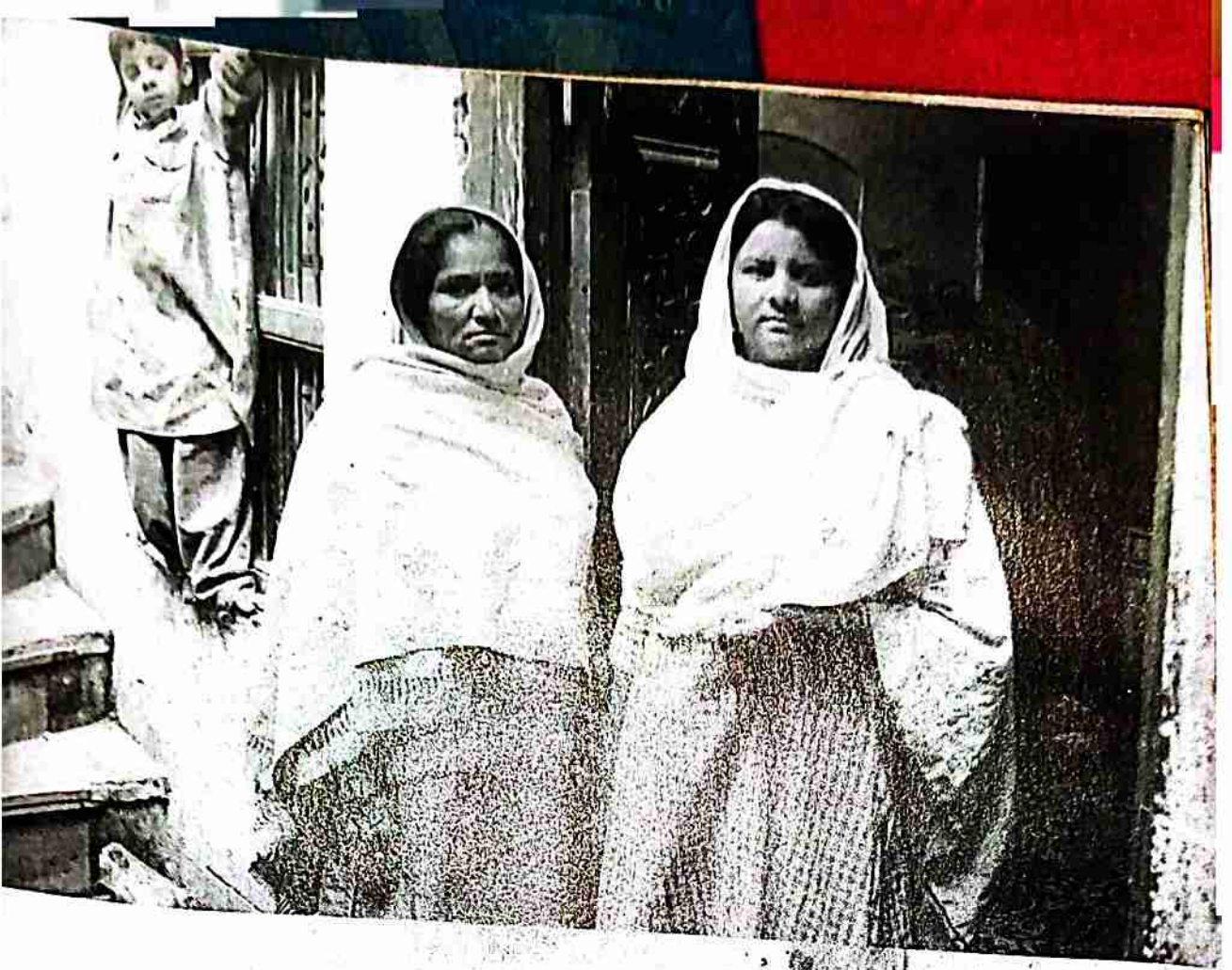
ان طوائفوں کے مالی حالات ناگفتہ بہ ہیں۔
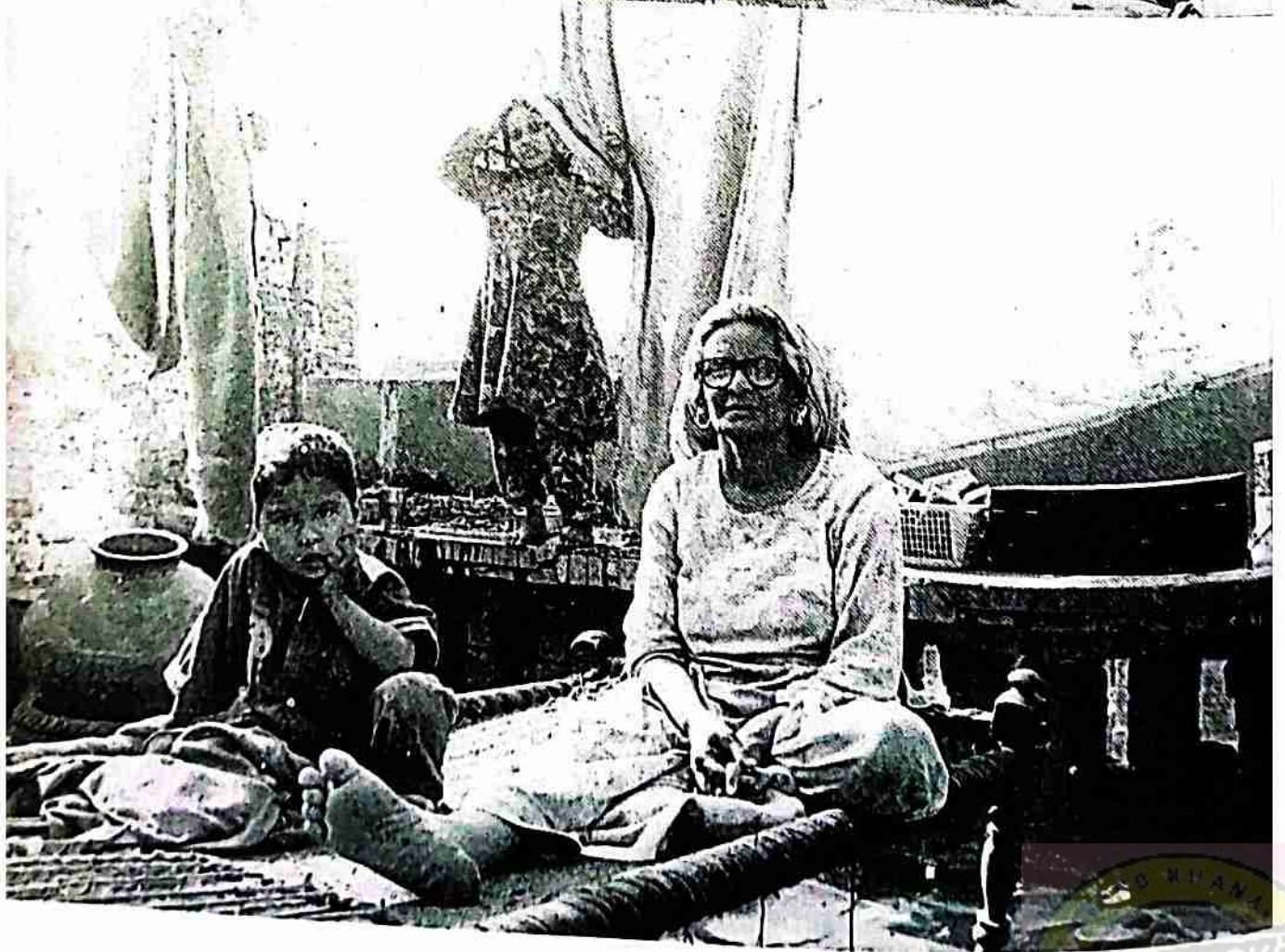
یہاں صحت و صفائی کے حالات بہت خراب ہیں۔
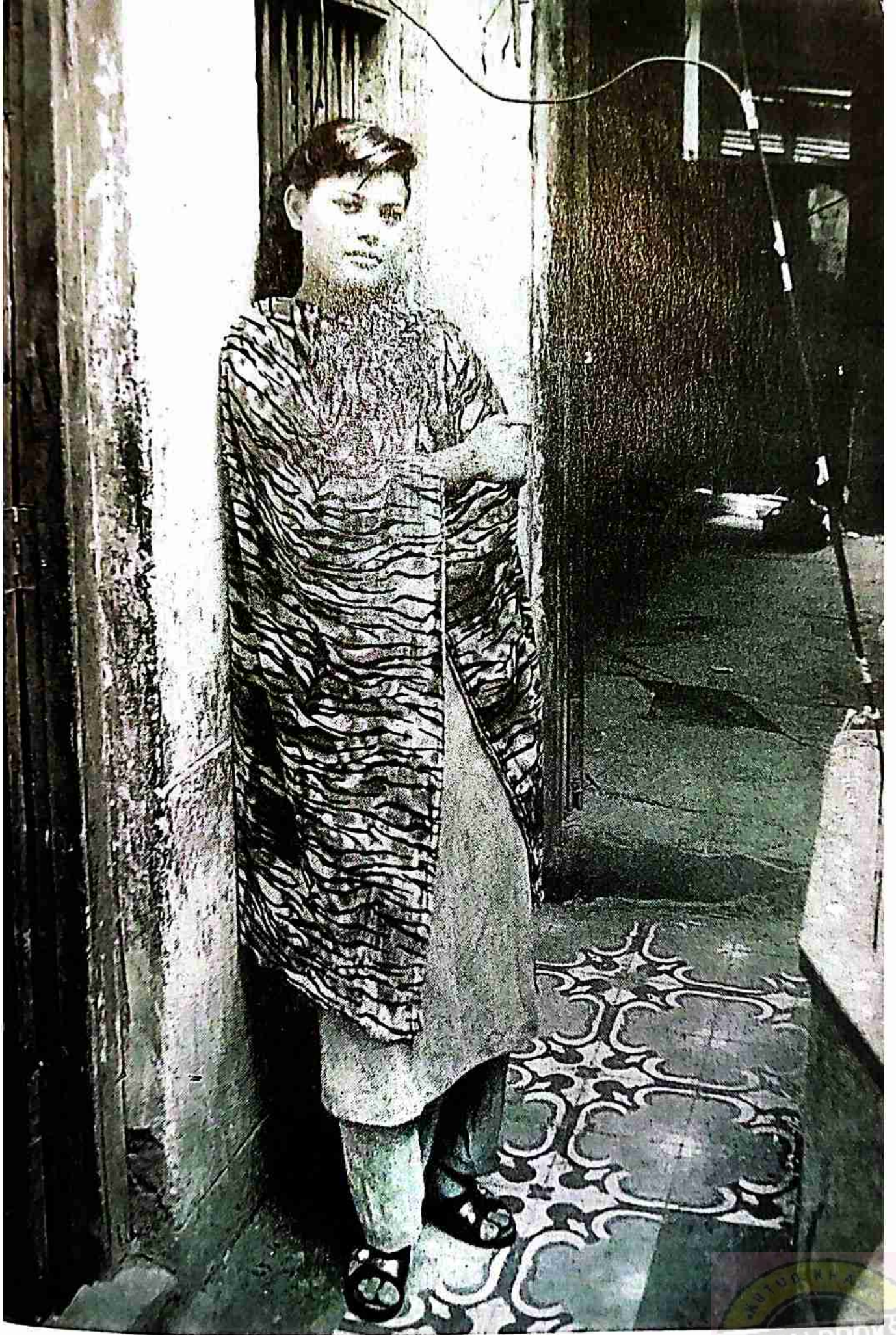
یہ عورتیں اپنے خاندانوں کے ساتھ چھوٹے کوارٹروں میں رہتی ہیں اور اپنے دھندے کے لیے گھنٹوں کے حساب سے کمرہ کرایہ پر لیتی ہیں۔

قہقہہ پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ خسروں کے بارے میں مزید توہین آمیز تبصرے کریں، میں نے وضاحت شروع کردی۔ میں نے کہا: ''میری تحقیق اس علاقے کے بارے میں ہے اور یہاں یہ لوگ بھی رہتے ہیں۔ آپ کو یہ بات اچھی لگے یا بُری مگر وہ بھی یہاں کا ایک حصہ ہیں۔''

استاد گامن ساتھ والے کمرے کے ایک کونے میں اپنا کھانا تیار کر رہے تھے۔ انہوں نے میری بات سنی تو حیرت کے مارے ہاتھ میں کفگیر لیے اپنے کمرے کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔

''کیا؟ فوزیہ بی بی! تم ہیجڑوں پر بھی تحقیق کرو گی؟'' انہوں نے انتہائی تعجب سے پوچھا۔

''کرنی تو چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ یہیں رہتے ہیں۔ لیکن شاید میں اسے اس تحقیق میں شامل نہ کروں۔ ان کا نظام اور سماجی درجہ بندی اتنی پیچیدہ ہے کہ اس کے لیے ایک علیحدہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ سرسری جائزے میں موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔''

اتنی دیر میں استاد کے دو شاگردوں نے فرش پر ایک نیلے پلاسٹک کا بڑا سا ٹکڑا بچھا دیا۔ جو وہاں دسترخوان کا کام دیتا تھا۔ اس پر پلاسٹک کی پلیٹیں لگا دی گئیں۔ پانی پینے کے لیے ایلومینیم کے کٹورے اور میرے اور استاد گامن کے لیے دو شیشے کے گلاس لگا دیے گئے۔ دسترخوان کے گرد بیٹھ کر استاد گامن کے ''طعامِ خاص'' کا انتظار کیا جانے لگا۔ جب کچھ دیر لگی تو نوجوان سازندے آپس میں ہنسی مذاق کرنے لگے۔ ''معلوم ہوتا ہے ہنڈیا جل گئی۔ استاد جی نے پھر سے پکانا شروع کیا ہے۔'' ایک نے کہا۔ ''لگتا ہے بچے کی دکان سے کھانا لینے کسی کو چپکے سے بھیج دیا استاد جی نے۔'' دوسرے نے اضافہ کیا۔

لیکن اتنی دیر میں استاد اصلی دیسی مرغی کی ڈش تھامے نمودار ہو گئے۔ اس محلے میں ''اصلی'' اور ''دیسی'' پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ اصلی گھی، دیسی مرغی کے دیسی انڈوں کے سوا یہ لوگ ناشتہ نہیں کرتے اور ''ولایتی ککڑی'' کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جب یہ میراثی کسی دوسرے شہر مہمان جاتے ہیں تو اپنے میزبانوں کو دیسی مرغی اور دیسی انڈوں کی فرمائشوں سے زچ کر دیتے ہیں۔

ہم سب کھانے پر ٹوٹ پڑے جو اتنے انتظار کے بعد نہایت ذائقہ دار لگ رہا تھا۔ کھاتے کھاتے میں نے پوچھا: ''کیوں استاد جی! آپ نے رضیہ اور پمّی کو نہیں بلایا۔ وہ بھی تو آپ کی شاگرد ہیں۔ یہ دعوت صرف مرد شاگردوں کے لیے ہے کیا؟'' میرے بلند آواز سے پوچھے ہوئے سوال پر کمرے میں اچانک ایسی خاموشی چھا گئی کہ میں پریشان ہو گئی۔ میں نے کہا: ''کیوں کیا ہوا؟ مجھے بتائیے نا!''

''آپ کو رضیہ کے بارے میں نہیں معلوم؟''، ایک شاگرد بولا۔

''نہیں، میں آج ہی صبح تو اسلام آباد سے آئی ہوں''، میں نے جواب دیا۔

استاد گامن نے اور اس کے شاگردوں نے تب مجھے سارا واقعہ سنایا۔ رضیہ رُوبا کے ساتھ دو

دن ہوئے فرار ہوگئی تھی۔ اس داستان کا المناک پہلو یہ تھا کہ منشیات کے عادی ان کے 'باپ' نے گاہک سے نتھ اترائی کے دس ہزار روپے وصول کرنے کے لیے رضیہ کی جگہ دس برس کی سونی کو اس کے حوالے کر دیا۔ میں حیران رہ گئی۔ میں نے اس بچی کو دیکھا تھا اس لیے مجھے بہت صدمہ ہوا۔ میں نے کہا: ''ان کی ماں نے اس کی اجازت کیسے دے دی؟''

استاد گامن نے کہا: ''وہ بس پڑوسنوں کے لیے شیر ہے۔ ان پر ہی غرّا سکتی ہے۔ اس آدمی کے سامنے تو بھیگی بلّی بن جاتی ہے۔ جب نائیکہ کا کام دلّے سنبھال لیں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''اور رُوبا؟'' میں نے پوچھا۔ ''روبا اور رضیہ کا کیا ہوگا؟''

''رُوبا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' استاد گامن نے سنجیدگی سے کہا: ''رضیہ کے باپ نے پولیس میں رپورٹ لکھوا دی ہے اور اب پولیس ان کو تلاش کر رہی ہے۔ اگر وہ مل گئے تو روبا کو تھانے میں بند کر دیں گے۔ رضیہ کو پولیس والے کیوں چھوڑیں گے بھلا؟ پہلے خود اس کا خون چوسیں گے پھر اس کے گھر والوں سے بھاری رشوت وصول کریں گے، روبا کے گھر والوں سے الگ مال بٹوریں گے تب کہیں جا کے ان کی رہائی ہوگی۔ رپورٹ فائل سے آخر میں خارج کر دی جائے گی، یہ ہوگا۔''

رضیہ کے خاندان کے لیے یہی کم شرمندگی نہیں تھی کہ ایک نوعمر ناچنے والی گھر چھوڑ کر بھاگ گئی بلکہ ایک میراثی کے ساتھ بھاگنا تو اور بھی معیوب بات تھی۔ پھر اوپر سے لڑکی کی نتھ بالغ ہونے سے پہلے اتروا دینے پر تو سارا محلّہ ان پر تھوتھو کر رہا تھا۔ کم از کم جو لوگ روایتی طور پر اس کاروبار میں تھے اور جو اپنی قدروں کا خیال رکھتے تھے وہ تو کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔

میری تحقیق کئی مہینے جاری رہی۔ اس دوران روبا اور رضیہ پولیس کے ہتھے نہیں چڑھے۔ وہ دونوں جیسے صفحۂ ہستی سے ہی غائب ہو گئے تھے۔

سونی کو اس کی ''نتھ اترائی'' کے بعد دھندے سے لگا دیا گیا۔ اس کا الھڑ پن ایک رات ہی میں اس کے ''باپ'' کی منشیات کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بٹا ہوا پاتی۔ ایک طرف تو اس کا دل بچوں کی طرح اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ کھلونوں سے کھیلنے کو چاہتا دوسری طرف اس پر دباؤ تھا کہ وہ بڑوں کی طرح مرد گاہکوں کو رجھائے۔ میں نے تو بس یہ دیکھا کہ اس کا چہک چہک کر باتیں کرنا اور اس کی آنکھوں کی چمک ختم ہوگئی۔

باب ۲۹
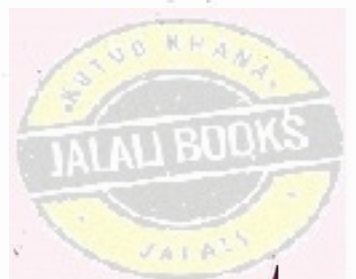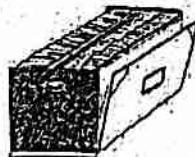
یادوں کا طوفان

لیلیٰ کے خاندان میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس کی انہیں کوئی توقع نہیں تھی۔ جمیلہ کی پہلی بچی بلی جسے شمسہ اپنے ساتھ لندن لے گئی تھی، اچانک واپس آ گئی۔

بلی، لیلیٰ سے ایک سال بڑی تھی۔ جب شمسہ اسے لندن لے گئی تھی اس وقت وہ دو مہینے کی نوزائیدہ بچی تھی اور آج ایک جوان سال، حسین لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ بلی اور لیلیٰ کی شکل کافی ملتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ بلی زیادہ دبلی اور خاموش طبع تھی۔ لیلیٰ کے برعکس وہ اپنی خوشیاں اور غم اپنے دل میں ہی رکھتی تھی۔ وہ لیلیٰ کی طرح کی لڑکی نہیں تھی جو زکام کی اطلاع بھی گاہک کو ٹیلیفون پر دے دے۔ اس کی انگریزی کچھ شکستہ سی تھی مگر لہجہ بالکل برطانوی تھا۔

اس زمانے میں، میں نے قیصرہ کے ایک نئے روپ کا مشاہدہ کیا۔ بلی کے آنے سے قیصرہ کا برسوں کا دبا ہوا غم و غصہ ایک بپھرتے ہوئے طوفان کی طرح اُمڈ آیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بیتے برسوں کی ساری یادیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں اور اس نے کسی بات کو بھلایا ہی نہ تھا۔ اسے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ باپ کی موت کے بعد وہ کس طرح تنہا رہ گئی تھی۔ شمسہ بہت ضدی تھی۔ اپنے ایک گاہک سے عشق میں مبتلا ہو کر وہ اُس کی خاطر لندن چلی گئی تھی۔ جاتے ہوئے وہ جمیلہ کے بچوں کو بھی ساتھ لے گئی تھی۔ اسے ذرا خیال نہ آیا تھا کہ قیصرہ اکیلی زندگی کا مقابلہ کس طرح کرے گی۔ ان کی والدہ کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ باپ کی موت کے بعد قیصرہ اپنی بہن کے ساتھ مل کر زندگی

کی جدو جہد کرنا چاہتی تھی۔ اس کے خیال میں اس کاروبار کو جاری رکھنا دونوں بہنوں کا فرض تھا اور ان کو تربیت بھی یہی دی گئی تھی۔ مگر شمسہ ایک دوسری سمت روانہ ہو گئی تھی۔ قیصرہ کو محسوس ہوا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ زندگی کا تمام تر بوجھ صرف اس کے کاندھوں پر ڈال دیا گیا ہے۔ شمسہ قیصرہ سے زیادہ پُر اعتماد تھی۔ جن بچوں کو انہوں نے گود لیا تھا وہ بھی شمسہ کو دیئے گئے تھے۔ اس بات نے دونوں بہنوں کی شخصیت کے فرق کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا تھا۔

شاہد اور کرن کی وجہ سے شمسہ اپنے مستقبل کے بارے میں زیادہ پُر اعتماد ہو گئی تھی جبکہ قیصرہ خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔ تنہائی کے وہ دن یاد کر کے قیصرہ اچانک اتنی افسردہ ہو گئی کہ بلی کے آنے کے بعد وہ گھنٹوں ایک کونے میں بیٹھ کر روتی رہی۔

قیصرہ کو شمسہ کے عشق کی داستان یاد آئی۔ شمسہ اس بندے کو کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس وقت وہ نوجوان تھی اور اسے لگا تھا کہ اسے اپنے خوابوں کا شہزادہ مل گیا ہے۔ قیصرہ جب بھی جانتی تھی کہ وہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ چالیس کے پیٹے میں تھا اور اس کی بیوی بھی تھی اور تین بچے بھی۔ اس کا کاروبار بھی ذاتی نہیں بلکہ خاندانی تھا۔ قیصرہ جانتی تھی کہ وہ ایک طوائف سے شادی کر کے کبھی خطرہ مول نہیں لے گا مگر شمسہ کو یہ یقین کوئی نہیں دلا سکتا تھا۔ اس نے شمسہ کو بتایا کہ وہ لندن میں رہائش اختیار کرنے والا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے شمسہ سے لندن میں شادی کا وعدہ بھی کیا تھا۔ شمسہ اپنے تصور میں دور دیس جا بسی تھی۔ اب وہ چاہتی بھی تو اپنے اس سنہری خواب کو توڑ نہیں سکتی تھی۔ اس لیے جب جانے سے پہلے قیصرہ نے شمسہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ نہ وہ اس سے شادی کرے گا اور نہ اسے اپنے ساتھ لے جائے گا، تب بھی شمسہ نے حقیقت کو تسلیم نہیں کیا۔ محض اس آسرے پر کہ وہاں وہ اس کے نزدیک رہ سکے گی، شمسہ نے لندن جانے کا فیصلہ کر لیا۔

شمسہ نے بڑے اعتماد اور باقاعدہ منصوبہ بندی سے ہر قدم اٹھایا۔ اس نے بڑی سمجھداری کے ساتھ اندازہ لگایا کہ مستقبل میں اسے کن لوگوں کی ضرورت پڑے گی۔ وہ اپنے ساتھ شاہد، کرن اور شاہد کی پہلی بچی بلی کو لے گئی۔ یعنی ایک نوجوان مرد، ایک پندرہ سالہ لڑکی اور ایک بچی جو مستقبل میں جوان ہو جائے گی۔ اس شخص نے کچھ عرصے تک شمسہ سے تعلق جاری رکھا مگر بعد میں شمسہ لندن میں کاروبار جمانے پر مجبور ہو گئی۔ اس میں شمسہ کے محبوب نے اس کی کچھ مدد بھی کی لیکن اس کے بعد وہ اس نئی دنیا میں ہمیشہ کے لیے گم ہو گیا۔ شمسہ ہوشیار تھی اور جانتی تھی کہ مستقبل میں یہ بچیاں اس کے مالی تحفظ کی ضمانت ہیں۔ ساتھ ہی وہ ابھی خود بھی اس قابل تھی کہ لندن میں جسم فروشی کر سکے۔ شمسہ نے اپنے، کرن اور بلی کے لیے لندن میں قیام کے قانونی کاغذات حاصل کر لیے مگر شاہد کا کیس کئی

سال لٹکتا رہا۔ شاہد کی بیوی لاہور میں بھی تھی اس لیے وقتاً فوقتاً وہ لاہور آتا رہا اور بچے بھی پیدا ہوتے رہے۔ ایک طرح یہ اس کا 'فرض' بھی تھا۔ بچے اس لاہور والے خاندان کے مستقبل کی ضمانت تھے اور جمیلہ پابندی سے ہر سال بچہ پیدا کرتی رہی۔ اسی دوران، شمسہ جمیلہ کے دوسرے دو بچوں کو بھی لندن لے گئی جن کو اس نے قانوناً گود لے لیا۔

شروع میں شمسہ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن رفتہ رفتہ اسے کافی تعداد میں ایشیائی گاہک مل گئے۔ شمسہ نے جرائم پیشہ طبقے میں مضبوط روابط قائم کر لیے تا کہ اس کے کاروبار میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ ان لوگوں سے وہ پیسے بھی نہیں لیتی تھی۔ شمسہ نے شاہد کی لندن میں رہائش کو جلد سے جلد قانونی بنانے کے لیے ایک مقامی طوائف سے اس کی شادی کروادی لیکن اس جلد بازی کے باعث برطانوی حکومت نے اس کی درخواست ہی مسترد کر دی۔ شمسہ نے اس ناکامی کا الزام شاہد کے سر دھرا جو ہوشیاری سے کام نہیں لے سکا تھا۔

کرن لندن میں رہنے کی کبھی عادی نہ ہو سکی۔ اسے محلّہ اور وہاں بسنے والی سہیلیاں یاد آتی رہتی تھیں۔ اگرچہ محلے میں اس کی کسی سے بہت گہری دوستی نہیں تھی لیکن وہ مانوس ماحول میں رہنا چاہتی تھی۔ لندن میں اس نے دھندا تو کیا لیکن اس کا دل وہاں نہیں لگا اور شمسہ کو خدشہ تھا کہ اس نے کرن کے لیے جو مستقبل سوچا ہے وہ شاید اس پر رضامند نہ ہو۔ اس نے کرن کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کرن کی مستقل اداسی کو جھیل نہیں پائی۔ بالآخر تمام کوششوں میں ناکام ہو کر چند برس بعد اس نے کرن کو واپس لاہور بھیج دیا۔ لیکن اس نے یہ بات سب پر واضح کر دی کہ کرن اس کی ملکیت ہے اور اس کی آمدنی پر صرف شمسہ کا ہی حق ہو گا۔ قیصرہ کو صرف ڈیرے دار کا حصہ ملے گا۔ اگر لاہور کا کوٹھا صرف قیصرہ چلاتی تو شمسہ کرن کو نہ بھیجتی، مگر اسے یقین تھا کہ شاہد کرن سے اچھا دھندہ کروائے گا۔

کرن کا دل لاہور میں بھی نہیں لگا۔ اس نے محلے میں اپنا بچپن ضرور گزارا تھا لیکن اب اسے طوائف کی اصلی زندگی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے بچپن کی یادیں، جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی ماں اور خالہ کو ناچتے گاتے دیکھتی تھی اس حقیقت سے کہیں زیادہ خوشگوار تھیں جس کا سامنا اسے اب کرنا پڑ رہا تھا۔ گاہکوں کا رال ٹپکانا اسے ذرا بھی نہ بھاتا تھا۔ اس کی روح بے چین تھی جسے سکون کی تلاش تھی، لیکن وہ کیا چاہتی ہے ایسا وہ خود بھی نہ سمجھ سکتی تھی تو کسی کو کیا بتاتی۔ اس کے باوجود قیصرہ اور شاہد نے اس کی شادی طے کر دی۔ حالانکہ وہ لندن سے یہ کاروبار کرتی آئی تھی لیکن محلے میں وہ نئی تھی۔ اس لیے شاہد نے اس کی نتھ اتروائی کی معقول رقم وصول کر لی۔ اسے ایک اچھا گاہک

مل گیا جس نے اس کا ماہانہ مقرر کر دیا اور شام کی محفلوں سے اس کی جان چھوٹ گئی۔ لیکن کرن اب بھی خوش نہ تھی اور چند ماہ بعد اس 'ملازمت' کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد جلد ہی کرن نے دوبارہ دھندا شروع کر دیا۔ یہ مشکل نہ تھا۔ کرن کی آواز بہت سریلی تھی۔ وہ ایک دراز قد، خوبصورت لڑکی تھی، جو محلے کی عام طوائفوں سے کہیں زیادہ پُرکشش تھی۔

قیصرہ نے بڑے دکھ سے یاد کیا کہ کرن کس طرح اپنے ایک گاہک کے عشق میں مبتلا ہو گئی تھی۔ صرف اس زمانے میں وہ پہلی بار خوش نظر آتی تھی۔ بدقسمتی سے کسی کنجر گھرانے کی طوائف کو عشق کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہوتی۔ کرن کے جذبات نے سارے گھرانے کی ناک کاٹ کے رکھ دی۔ کرن ایک سنار کے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ وہ اتنا دولت مند تھا کہ دوسری بیوی رکھ سکتا تھا۔

کرن نے بڑی جرأت سے اپنے محبوب کی خاطر چپکے سے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ اس عمل نے تو پورے گھر پر بجلی سی گرا دی اور شرم سے وہ محلّے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ قیصرہ ان سب باتوں کو یاد کرتی تو اس کا دل پھٹنے لگتا۔ وہ زمانہ باپ کی موت سے بھی زیادہ مشکل اور تکلیف دہ تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ موت تو ہر بندے کو آنی ہے، لیکن کرن نے تو پورے خاندان کو زندہ درگور کر دیا ہے۔

اس کے باوجود قیصرہ دل کے کسی گوشے میں خوش بھی تھی کہ کرن نے جو چاہا تھا وہ اسے مل گیا۔ قیصرہ صرف اس بات پر دکھی نہیں تھی کہ کرن اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ ایک دن وہ شخص کرن کو چھوڑ دے گا۔ اسے بار بار لگتا تھا جیسے پریشان حال کرن ان کے دروازے پر پھر آ پہنچے گی اور اسی لیے وہ کرن سے ملنا ترک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ قیصرہ چاہتی تھی کہ اگر کبھی کرن پرانی زندگی میں واپس آنا چاہے تو اس کے گھر کے دروازے اس کے لیے کھلے رہیں۔

اس کے برعکس شمسہ کو کرن پر اتنا غصہ تھا کہ وہ کرن سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ شاید کرن کی زندگی میں اسے اپنی پچھلی زندگی کا عکس نظر آ رہا تھا۔ قیصرہ نے شمسہ کو سنبھالنے کی کوشش کی کہ یہ قسمت کا کھیل ہے مگر شمسہ تمام الزام قیصرہ پر رکھ رہی تھی کہ اس نے کرن کو حد سے زیادہ ڈھیل دے دی تھی۔ شمسہ کے الزامات اور حالات کے دباؤ کے باوجود قیصرہ کرن سے اتنی محبت کرتی تھی کہ وہ اسے کسی طرح چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ وہ کرن سے ملنے جاتی رہی۔ وہ ہمیشہ چپکے سے کرن سے پوچھتی تھی، ''کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟'' وہ اس بات کی بھی یقین دہانی چاہتی تھی کہ کرن کا شوہر اسے مارتا تو نہیں، یا وہ کنجوس تو نہیں ہے۔

کرن کے چار بچے ہوئے۔ اس عرصے میں قیصرہ اس سے برابر ملتی رہی۔ کرن لاہور میں ہی رہتی تھی۔ حالانکہ اس کی سسرال نے کبھی اسے قبول نہیں کیا، مگر کرن کے شوہر نے اس کے لیے علیحدہ

رہنے کا بندوبست کر دیا تھا۔اس نے کرن کو واقعی ایک بیوی کی طرح چاہا۔کرن اپنی پرانی زندگی میں واپس نہ جانے کا حتمی فیصلہ کر چکی تھی۔ پانچ سال بعد کرن کے شوہر نے اسے قیصرہ سے ملنے یا اپنے ماضی سے کوئی بھی رشتہ قائم رکھنے سے منع کر دیا۔شاید قیصرہ کے آنے سے اسے خوف محسوس ہوتا تھا کہ مبادا قیصرہ اس کی بیوی کو دوبارہ اس کے ماضی کی زندگی میں واپس نہ لے جائے۔کرن نے قیصرہ سے کہہ دیا کہ وہ کبھی اس کے گھر نہ آئے۔ وہ اپنے شوہر کو مطمئن کرنا چاہتی تھی۔

برادری کے لوگوں نے کرن کا ذکر کرنا ختم کر دیا۔اس نے اپنے خاندان کی توہین کی تھی۔ ہاں کبھی کبھی جب گانے کا ذکر ہوتا تو کوئی کہہ دیتا تھا کہ کرن کی آواز کتنی اچھی تھی۔عموماً جواب میں سب خاموش ہو جاتے۔ کرن کا نام اب خاموشی میں دفن ہو چکا تھا۔

بلی کے آنے سے پہلے میں کرن کے بارے میں کچھ نہ جانتی تھی، لیکن جب یادوں کا ریلا بہہ نکلا تو یہ سب باتیں بھی قیصرہ کی زبانی مجھے معلوم ہوئیں۔یادوں کے درد کی ماری قیصرہ گھنٹوں کمرے کے کسی گوشے میں بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔

لیلیٰ لاکھ کوشش کرتی کہ ماں بلی سے بات کر کے معلوم کرے کہ وہ کن حالات میں واپس آئی ہے، لیکن قیصرہ ماضی کی دردناک یادوں سے فرصت ہی نہ پاتی تھی۔وہ وقت کے دیئے ہوئے ہر زخم کو یاد کرنا چاہتی تھی۔ شمسہ اور قیصرہ کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے تھے۔لڑکپن میں بھی ان کا ایک دوسرے سے مقابلہ رہتا تھا۔ حالانکہ دونوں بہنیں خوبصورت تھیں مگر شمسہ میں جھجک نہ تھی اس لیے لوگ اس پر ہی زیادہ توجہ دیتے تھے۔شمسہ قیصرہ سے صرف ایک برس بڑی تھی لیکن گھر کی بڑی بیٹی کی ساری مراعات اسے ہی حاصل تھیں۔نتھ اتروائی میں اسے قیصرہ سے کہیں زیادہ رقم ملی تھی اور اسے اس بات پر بھی بڑا ناز تھا کہ اس کا پہلا گاہک نواب کا بیٹا تھا۔ قیصرہ کا پہلا گاہک ایک کاروباری آدمی تھا جو ظاہر ہے نواب زادے کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔بچوں کو گود دیتے ہوئے بھی والدین نے قیصرہ کا خیال تک نہیں رکھا تھا۔ قیصرہ کو خاندان کے سارے بچوں کی، خصوصاً سارے لڑکوں کی پرورش کرنی پڑی تھی۔ حالانکہ قیصرہ کو لیلیٰ اور اس کی چھوٹی بہن یاسمین مل گئی تھیں لیکن وہ اس احساس سے کبھی نجات حاصل نہیں کر سکی تھی کہ ان کے لیے اسے شمسہ کی عنایت کا ممنون بننا پڑا ہے کیونکہ یہ شاہد کی بیٹیاں تھیں۔اسے اب بھی یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ شمسہ آ پہنچے گی اور ان لڑکیوں پر بھی اپنا حق جتائے گی۔ یہ ایسی انہونی بات بھی نہ ہوتی۔آخر ماضی میں شمسہ نہایت خودغرضی سے کرن، شاہد اور نوزائیدہ بچی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ قیصرہ کا کیا بنے گا۔قیصرہ خود کافی عمر تک پیشہ کرنے پر مجبور رہی تھی اور اسے لیلیٰ کے جوان ہونے کا طویل انتظار

کرنا پڑا تھا۔ اگر اس کی جائیداد نہ ہوتی اور کرایہ نہ آتا تو قیصرہ در در کی ٹھوکریں کھاتی۔ لیلیٰ کے جوان ہونے سے پہلے وہ کوٹھے پر دوسری طوائفوں سے رقص کرواتی تھی۔ اس کے لیے اسے صرف ڈیرہ داری کی رقم ملتی تھی۔ قیصرہ نے بہت مشکل زمانہ دیکھا تھا۔ اسے بہت سے بچوں کی پرورش بھی کرنی تھی اور ساتھ ہی لیلیٰ کی نافرمانی اور ضد کا سامنا بھی کرنا ہوتا تھا۔ بعد میں جب شمسہ کی کرن سے نہ بنی تو اس نے اس اعتماد کے ساتھ کرن کو لاہور روانہ کر دیا کہ قیصرہ تو اس کی دیکھ بھال کر ہی لے گی۔

شاہد قیصرہ کی مدد تو کرتا تھا لیکن اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اکثر شمسہ کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا لیکن شمسہ سے ان بن ہونے پر قیصرہ کے دامن میں پناہ ڈھونڈتا تھا۔ قیصرہ اس پر پوری طرح اعتماد کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ شمسہ کسی وقت بھی شاہد کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتی تھی۔ شمسہ جب بھی آتی تھی، دونوں بہنوں میں لازماً جھڑپ ہو جاتی تھی۔ قیصرہ کی آرزو تھی کہ اسے بہن کا پیار مل سکے مگر یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ ایک بار جب شمسہ لاہور آئی ہوئی تھی، اس وقت اس نے لیلیٰ کی ضد کو ایک بحران کی شکل دے دی تھی۔ قیصرہ کو یاد آیا تھا کہ جمیلہ کو بچوں کے ساتھ گھر سے نکالنے پر وہ کس قدر روئی تھی۔ جمیلہ بڑی فرمانبردار بہو تھی۔ قیصرہ اسے پسند کرتی تھی اور جانتی تھی کہ وہ اس سلوک کی مستحق نہیں تھی۔ پھر بھی خاندانی ایکتا دکھانے کے لیے اس نے شمسہ کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن اسے یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی تھی کہ وہ لندن سے آ دھمکے اور قیصرہ کے انتظام میں مین میخ نکال کر سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اسے لگا تھا کہ شمسہ کے لیے یہ صرف اپنی برتری ثابت کرنے کا اور قیصرہ کو نیچا دکھانے کا بہانہ ہے کہ وہ اپنی لڑکیاں سنبھال نہیں سکتی۔ قیصرہ کے دل میں تو آئی تھی کہ وہ شمسہ سے صاف صاف کہہ دے کہ دراصل لڑکیاں تو شمسہ نہیں سنبھال سکی لیکن اس کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ اس کی ایک واضح مثال تو یہ تھی کہ جونہی شمسہ کو بلی کے سلسلے میں مسائل کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے بلی کو بھی قیصرہ کے پاس بھیج دیا تھا۔

قیصرہ سسکیاں لے لے کر روتی رہی۔ زندگی نے اس کے ساتھ منصفانہ سلوک نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خوف جاگ رہے تھے۔ کہیں بلی کو کسی سے محبت تو نہیں ہو گئی تھی؟ کہیں وہ حاملہ تو نہیں تھی، یا منشیات کی عادی تو نہیں ہو گئی تھی؟ کسی نئے مسئلے سے نمٹنے کی قیصرہ میں اب سکت نہیں تھی۔

بلی کے پہنچنے کے دوسرے دن شمسہ نے لندن سے قیصرہ کو ٹیلیفون کیا۔ اس کے لہجے میں تشکر کا شائبہ تک نہ تھا کہ قیصرہ نے بلی کو اپنے پروں تلے سمیٹ لیا ہے۔ اس کے برعکس، کراری آواز میں وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے کوئی افسر اپنے ماتحت سے مخاطب ہوتا ہے۔ اس نے قیصرہ کو ہدایت

دی کہ وہ ببلی کا پاسپورٹ کہیں چھپا دے۔ ببلی کو واپس بھیجنے کی وجہ شمسہ نے یہ بتائی کہ لندن میں ببلی کو شراب پینے کی بری طرح لت پڑ گئی تھی اور اس کا رویہ سب کو مصیبت میں گرفتار کرا سکتا تھا۔ لیکن قیصرہ کو بعد میں معلوم ہوا کہ اصل بات کچھ اور تھی۔ ببلی کو دراصل وہاں ایک لڑکے سے عشق ہو گیا تھا۔ شمسہ نے اس سونے کی چڑیا کے پر کاٹنے کے لیے اسے زبردستی وطن واپس بھیج دیا تھا۔

قیصرہ نے شمسہ کی ہدایت پر عمل تو کیا لیکن اسے یہ احساس بھی تھا کہ شمسہ ایک بار پھر اسے استعمال کر رہی ہے۔

باب ۳۰
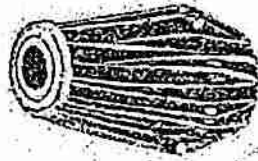
نائیکہ کی راہ پر

لیلیٰ نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ یہ خاندان کے مستقبل کے لیے اچھا شگون نہ تھا۔ قیصرہ کا تو دل بجھ سا گیا۔ لیلیٰ کے محفوظ مستقبل کے لیے وہ چاہتی تھی کہ لیلیٰ بیٹی کو جنم دیتی۔ پھر بھی، بچہ پیدا ہونے کے بعد اب قیصرہ، سلیم سے ماہانہ رقم بڑھانے کا مطالبہ کرنے کا جواز حاصل کر چکی تھی۔ اس نے سلیم کا پیچھا پکڑ لیا۔

ایک دن میں ان کے گھر گئی تو سلیم اپنی مخصوص چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ قیصرہ نے مجھے دیکھا تو بلند آواز میں کہا: ''کیوں فوزیہ! ذرا یہ تو بتاؤ کہ بچے کے لیے پاؤڈر کے دودھ کی کیا قیمت ہے آجکل؟''

میں نے کہا: ''پتا نہیں!''

قیصرہ نے کہا: ''میں کوبا سے ایک چیز منگاتی ہوں تو دوسری کے لیے پیسے نہیں بچتے۔ بچے کا خرچہ اتنا زیادہ ہوتا ہے، ہماری تو کمر ہی ٹوٹ گئی ہے۔ میں یہ خرچہ نہیں اٹھا سکتی۔ بچے کا خرچہ باپ کو اٹھانا چاہیے۔ سنا تم نے فوزیہ!''

میں خوب سمجھ رہی تھی کہ یہ ساری باتیں مجھے نہیں، سلیم کو سنانے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ میں نے کہا: ''جی ہاں! سُن رہی ہوں۔''

قیصرہ نے کہا: ''لیلیٰ کا ماہانہ سال بھر پہلے مقرر کیا گیا تھا۔ تب سے ہر چیز کی قیمت کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ لیلیٰ ابھی تک خود بچی بنی ہوئی ہے۔ اس کو تو اپنے لیے سارا ٹھاٹ باٹ چاہیے۔''

پھر قیصرہ نے ایک دم آواز نیچی کر کے میرے کان میں کہا: ''اس کے باپ کو اسکے لیلیٰ سے رشتے

کا پتا چل گیا ہے۔ وہ لاہور آ گیا ہے۔ اب تو وہ اسے کوڑی بھی نہیں دیتا۔ یہ تو اب کنگال ہو گیا ہے۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"ہونہہ! ہم کیا جانیں! کہیں سے بھی لائے روپیہ!" قیصرہ نے خوفناک سرگوشی کی: "روٹیاں توڑن ساڈے بوہے تے آ جاندا اے۔ (روٹیاں توڑنے ہمارے دروازے پر آ جاتا ہے)"

پھر اس نے آواز بلند کرتے ہوئے سب کو سنانے کے لیے کہا: "دیکھ! میری بچی! ایسے فرمانبردار سپوتوں کو رنڈی بازی کا شوق نہیں پالنا چاہیے۔ یہ خاندانی امیروں کے شوق ہیں۔ لیکن ذمہ داری اٹھا ہی لی ہے تو پھر نبھانے کا بھی دم ہونا چاہیے۔ بھئی جو مال کسی کے باپ کا ہے، وہ اس کا بھی ہوا۔ ہوا کہ نہیں؟ اب جب اپنے آگے بھی اولاد ہے تو بندے کو ذمہ داری کا کچھ تو احساس ہونا چاہیے۔"

اتنے میں لیلیٰ نے دوسرے کمرے سے قیصرہ کو آواز دی اور قیصرہ بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ سلیم ہڑبڑا کر چارپائی سے اٹھا اور میری طرف رحم طلب نگاہیں ڈال کر باہر بھاگ گیا۔ بے چارہ! واقعی، یہ شخص تو ابھی خود بچہ معلوم ہوتا تھا۔ 'نہ جانے اس نے خود کو اس مصیبت میں کیسے ڈال لیا؟' میں نے سوچا۔

تھوڑی دیر میں لیلیٰ بھی آ گئی۔ اس دن میں نے بازار میں کئی دکانداروں کے انٹرویو کیے تھے۔ میں فرش پر بیٹھی کیسیٹوں پر لیبل لگا رہی تھی۔ لیلیٰ نے میرے پاس بیٹھ کر کہا: "دیکھ لیا! یہاں کیا تماشہ ہو رہا ہے۔" میں نے سر ہلایا تو اس نے کہا: "جس دن سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے، امی پنجے جھاڑ کر سلیم کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ اس نے پندرہ ہزار روپے ہسپتال کا خرچہ بھرا، جوان کے بھاویں ہی نہ چڑھا۔ اب وہ کرے تو کیا کرے۔ اس کے باپ کو خبر ہو گئی ہے۔ وہ تو اسے ایک پیسہ بھی نہیں دیتا۔ خدا جانے وہ پندرہ ہزار کہاں سے لایا تھا۔" اتنا کہہ کر لیلیٰ رونے لگی۔

قیصرہ کمرے میں آ گئی اور لیلیٰ کو میرے پاس بیٹھا دیکھ کر کہنے لگی: "ارے تو کیا میں یہ سب کچھ اپنے لیے کہتی ہوں؟ اس میں عقل ہوتی تو خود اس سے پیسہ نکلواتی مگر یہ ٹھہری مٹی کی مادھو!"

لیلیٰ نے آنسو پونچھ کر زور سے کہا: "مجھے بیچ میں مت لاؤ۔ یہ رشتہ تم نے کرایا تھا، اب تم ہی نمٹو!"

قیصرہ نے کہا: "ارے گھوڑا گھاس سے دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا؟ مگر یہ نہیں سدھرے گی۔ ابھی سر پر کوئی ذمہ داری پڑی جو نہیں ہے۔ دنیا کو تو منہ مجھے دکھانا پڑتا ہے نا۔ آئے گئے کا خیال بھی میں ہی کرتی ہوں۔ بولو! اس گھر میں بچوں کو کون پال پوس رہا ہے؟ کون سب کا پیٹ بھرتا ہے؟"

قیصرہ بے تکان بول رہی تھی: "جیب خالی ہے تو یہ بندہ جائے یہاں سے۔ کیوں لیلیٰ کا وقت ضائع کر رہا ہے؟ دوسرے بہت گاہک ہیں۔ بیٹے پر مان ہے تو لے جائے اپنا بچہ!"

میں نے حیرت سے پوچھا: "کیا سلیم سچ مچ اپنا بچہ لے جائے گا؟"
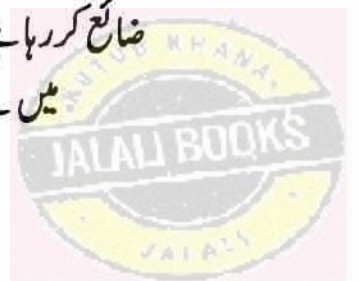
قیصرہ ہنسنے لگی۔ ''بچے کوئی نہیں لے جاتا۔'' اس نے کہا ''ان مردوں کو اپنی 'عزت' کا بڑا پاس ہوتا ہے۔ لیکن اپنی اولاد سب یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ گھر والوں کا سامنا کریں۔ بزدل کہیں کے...۔'' پھر اس نے کہا: ''اب کیا بتاؤں کہ اس محلے میں کیسے کیسے ناک والوں اور نام والوں کی اولاد پل رہی ہے؟''

میں نے کہا: ''قیصرہ! اگر کوئی شخص سچ مچ اپنا بچہ یہاں سے لے جانا چاہے تو کیا وہ ایسا کر سکے گا؟''

قیصرہ مسکرائی: ''بی بی! یہ بازار ہے۔ یہاں ہر چیز کا ایک مول ہے۔ مناسب دام چکائیں اور اپنی اولاد لے جائیں۔ بیٹیاں دینی مشکل ہوں گی لیکن کوئی ناک والا اونچے دام دے تو اس کی بیٹی اس کے حوالے کر دی جائے گی۔ مگر بچہ لینا کون چاہتا ہے؟ سب لوگ یہیں چھوڑ دیتے ہیں... جو ہمارے خلاف سب سے بلند آواز میں بولتے ہیں یقین کرو اُنکے ہی کئی بچے اس محلّے میں ہوتے ہیں''۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا، ''چلو چھوڑو، ہمارا کاروبار تو ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا۔ میں گاہکوں کو کیوں کوسوں، آخر انہی کے دم سے ہماری روزی روٹی چلتی ہے۔''

کئی ماہ گزر گئے۔ سلیم کوشش سے کبھی کبھی روز کی بکری میں سے کچھ پیسے خورد برد کر کے لیلیٰ کے لیے لے آتا تھا، مگر اُس کے چکر لیلیٰ کے کوٹھے پر کم سے کم ہوتے گئے۔ اُس کو شدت سے یہ احساس تھا کہ اسے قیصرہ اور لیلیٰ کے سامنے اپنا بھرم رکھنا ہے، ورنہ لیلیٰ کے ساتھ جو اس کا رشتہ تھا اسکی کشش اب اس کے لیے بالکل بھی باقی نہ رہی تھی۔ قیصرہ اس پر دباؤ ڈالتی رہی اور ساتھ ساتھ لیلیٰ کے لیے دوسرے گاہک بھی ڈھونڈتی رہی۔ لیلیٰ رات کو روز اپنے کوٹھے پر محفل کرتی مگر اِن دنوں اُن کے ہاں ہفتے میں دو یا تین سے زیادہ گاہک نہ آتے۔ ان میں بھی اصل گاہک بس مہینے میں ایک آدھ ہی ہوتا۔ قیصرہ پر ان باتوں کا کافی بوجھ تھا اور وہ سوچتی رہتی کہ کاروبار کو کیسے بڑھائے۔ وہ لیلیٰ کو ورائٹی شو کرنے کے لیے بھی بھیجتی مگر وہاں سے بھی لیلیٰ زیادہ پیسے کما کر نہ لا سکی۔ وہ ویلیں نکلوانے میں ابھی بہت تیز نہیں ہوئی تھی۔

اس کے بعد سلیم وہاں زیادہ عرصے تک نہیں رہا۔ چند مہینوں بعد اسے لیلیٰ کے گھر اپنا ٹھکانہ چھوڑنا ہی پڑا۔ اس نے دوبارہ دکان کی آمدنی میں خورد برد کی تھی اور اس کے باپ نے اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تھی۔ معافی مانگنے پر اس کے گھر والے اسے اس کے آبائی شہر واپس لے گئے تھے۔

سلیم کی جدائی میں کچھ دن لیلیٰ نے آنسو بہائے اور پھر زندگی کے مسائل کا مقابلہ کرنے لگی۔

قیصرہ نے کوشش کی کہ لیلیٰ کو کسی فلم میں ہی کام مل جائے۔ اس محلّے کی ہر رقاصہ کا یہ خواب ہوتا ہے کہ وہ فلم میں کام کرے۔ قیصرہ کو یہ معلوم تھا کہ لیلیٰ کی عمر ۲۱ رسال ہوگئی ہے، مگر پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ ایک آخری کوشش کر دیکھے۔ لیلیٰ کا وزن کچھ زیادہ تھا، آواز بھی اتنی زیادہ سریلی نہیں تھی اور رقص میں بھی اس کی دلچسپی واجبی سی تھی۔ ہاں وہ دل کی بہت اچھی تھی مگر اس کا کیا فائدہ؟ صرف دل کے اچھے ہونے سے فلموں میں کام نہیں ملتا۔

ان لوگوں کے تعلقات فلم انڈسٹری میں اتنے اونچے درجے کے لوگوں سے نہیں تھے۔ فلم اسٹوڈیوز کے اردگرد رہنے والے ایجنٹ ان کو خواب ہی دکھاتے رہے۔ قیصرہ سمجھدار عورت تھی۔ جلد ہی اسے سمجھ آ گئی کہ یہاں اس کی دال نہیں گلنے والی۔ ہاں، اسے کسی نے مشورہ دیا کہ لیلیٰ پر وقت اور توانائی ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ یاسمین پر امید لگاؤ۔ یاسمین ابھی نوعمر بھی تھی اور لیلیٰ سے شکل وصورت میں بہتر بھی۔

قیصرہ نے اپنا یہ فیصلہ لیلیٰ کو سنا دیا مگر لیلیٰ تو اپنے خوابوں میں فلم اسٹار بنی ہوئی تھی۔ قیصرہ ذرا سختی سے بولی، ''میری تم سے کچھ زیادہ توقع تھی بھی نہیں۔ تم نے ایک دن بھی اس طرح محنت نہیں کی جو ہمارے اس کاروبار کا تقاضا ہے۔ فلموں میں جانا اتنا آسان کام ہوتا تو سارا شاہی محلّہ فلموں میں پہنچا ہوتا۔''

''جھوٹ بالکل جھوٹ''۔ لیلیٰ چیخی، ''یہ سب تعلقات کی بات ہے۔ میرے جیسی ہی لڑکیاں فلموں میں کام کرتی ہیں۔ مگر ان کے اچھے تعلقات ہیں جو آپکے اور شاہد بھائی کے پاس نہیں ہیں۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو اور تمہیں یہ بات اچھی طرح پتا ہے۔'' قیصرہ غصے سے بولی، ''میں تمہیں ہمیشہ کہتی رہی کہ کم کھاؤ، صبح سویرے اٹھو۔ رقص اور گانے کا ریاض باقاعدگی سے کرو۔'' قیصرہ اٹھ کر کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولی، ''مگر تم نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ تم اپنی زندگی نہیں بدلوگی۔ اب میں تو تمہاری جگہ وزن نہیں گھٹا سکتی۔''

لیلیٰ اس کے پیچھے دوڑی: ''ایک منٹ ٹھہریں، میں کھاتی کیا ہوں؟ کیا میں کھانا بند کردوں اور مر جاؤں۔ میرا جسم ہی پھولنے والا ہے میں کیا کروں؟ اور ہاں، میں اچھا خاصا رقص کرتی ہوں۔'' قیصرہ نے مُڑ کر اسے غصے سے دیکھا اور کہا، ''میں تمہارے ساتھ فضول کی لڑائی نہیں شروع کرنا چاہتی۔'' اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ وہ بولی: ''مجھے کہا گیا ہے کہ میں اب یاسمین پر توجہ دوں اور تم سے کوئی امید نہ رکھوں۔ تم خود اپنے اوپر یہ عذاب لائی ہو۔ تم نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ کبھی نہیں سیکھوگی۔'' یہ سب کہہ کر وہ مڑی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

لیلیٰ زور سے چیخی: ''مجھے بچہ ہونے والا ہے۔''
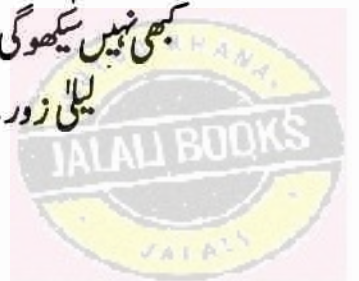
قیصرہ فوراً دوبارہ کمرے میں آئی۔ غصّے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ بولی، ''ڈِھڈ کرا لیا اے؟ تُو کدی نمیں سدھریں گی، ہُن بہہ کے اپنے نصیباں نوں رو۔ (اپنے نصیبوں کو رو)'' اس نے غصّے سے بھری آواز میں پوچھا، ''کونسا مہینہ ہے؟''

لیلیٰ بولی، ''دوسرا۔''

قیصرہ نے جھلاّ کے کہا: ''اور ہم فلموں میں کام ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔'' پھر اچانک وہ سکون سے بیٹھ گئی، جیسے ایک طوفان اچانک تھم جاتا ہے۔ ''ہم یہ بچہ رکھیں گے۔'' اس نے بارعب آواز میں کہا۔

لیلیٰ کو سب پر غصہ تھا۔ اپنی دادی پر، ان تمام ایجنٹوں پر جو اُسے فلموں کے خواب دکھاتے رہے تھے، شاہد پر کیونکہ اس کے تعلقات اونچے طبقے میں نہیں تھے۔ سلیم پر جو انتہائی کمزور شخصیت کا مالک تھا، اپنے ہونے والے بچے پر اور خود اپنے آپ پر بھی کہ وہ زندگی میں کامیاب کیوں نہیں ہو سکی۔ وہ جا کر صوفے پر لیٹ گئی اور فلمی گانوں کا ایک ٹیپ اونچی آواز میں لگا دیا۔ وہ موسیقی نہیں سن رہی تھی، بس اپنے آپ کو ایک شور میں ڈبو دینا چاہتی تھی۔

لیلیٰ بہت بے اطمینانی محسوس کر رہی تھی مگر اس کی وجہ اس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس کو زیادہ محنت کرنا بالکل پسند نہیں تھا اور اس نے اپنے آپ کو بار بار سمجھایا کہ فلموں کا کام تو بہت محنت طلب تھا۔ اداکاروں کو بسا اوقات ساری ساری رات کام کرنا پڑتا ہے۔ ایک ہی سین کو بار بار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ اس شہرت کا مزہ چکھنا چاہتی تھی جو فلمی اداکاروں کی تقدیر ہوتی ہے۔ وہ اپنی تصویریں فلمی رسالوں اور اخباروں کے رنگین صفحات پر دیکھ سکتی تھی۔ جاگتی آنکھوں کے خواب آہستہ آہستہ اسے سلانے لگے۔ نیند میں اس نے دیکھا کہ وہ ٹی وی پر ایک صابن کے اشتہار میں ہے... ''میرے حسن کا سنگھار...'' لیلیٰ کہہ رہی تھی۔ اتنے میں اچانک دروازہ کھلا اور ایک عمر رسیدہ عورت داخل ہوئی۔ لیلیٰ گھبرا کر اٹھی۔ پھر اس کو قیصرہ کی بلند آواز سنائی دی۔ وہ آنے والی عورت کو گھر سے نکال رہی تھی۔ پھر یہ شور تھم گیا۔ قیصرہ یہ کہتی ہوئی گزر رہی تھی: ''پہلے یہ عورت بڑے اونچے درجے کی طوائف تھی۔ آج بھکارن بن گئی ہے۔ دوسروں کے گھروں میں بلا اجازت گھس آتی ہے۔ اپنے کاروبار میں جو عورتیں ناکام ہو جائیں ان کا یہ حال ہوتا ہے، بے چاری۔''

لیلیٰ نے یہ سب باتیں نیم خوابیدہ حالت میں سُنی تھیں۔ وہ دوبارہ سو گئی۔ لیکن جب وہ بیدار ہوئی تو اس کا دل سہا ہوا تھا۔ اس کی ساری زندگی اسکی آنکھوں کے سامنے گزر رہی تھی اور اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنی جوانی ناکامیوں کی نذر کر دی ہے۔ اب تک تو اس کا خیال تھا کہ سب کچھ

خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ زندگی میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مگر اب اچانک اس پر ایک خوف طاری ہونے لگا، اُسے کہیں بھی تو کامیابی نہ ملی تھی۔ نہ تو اسے اس بازار سے دور لے جانے والا، اپنے سپنوں کا شہزادہ ملا تھا۔ اس محلے سے باہر اس نے کوئی ملازمت بھی حاصل نہیں کی تھی، جس کے بارے میں وہ کبھی سوچا کرتی تھی اور اسے فلم میں بھی کام نہیں مل سکا تھا۔ اب بچہ پیدا کرنے کا مطلب تھا کہ کئی ماہ کے لیے کام چھوڑ دیا جائے اور کس کو خبر تھی کہ اب کی بار بھی لیلیٰ کو لڑکی ہو گی یا نہیں۔ اس میں بھی ابھی سات ماہ کا انتظار تھا۔ اب اس کا کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر لیلیٰ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس کے بعد لیلیٰ میں ایک بے اطمینانی سی آ گئی تھی۔ اس نے ہنسنا اور بولنا کچھ کم کر دیا تھا۔ قیصرہ نے یہ تبدیلی محسوس تو کی مگر بالکل نظرانداز کر دی۔ وہ لیلیٰ کو ایک بگڑی ہوئی بچی سمجھتی تھی اور لیلیٰ حرکتیں بھی تو ہمیشہ بچوں جیسی کرتی رہی تھی۔

اگلے دن لیلیٰ کو پشاور کے پاس ایک گاؤں میں ورائٹی شو کے لیے جانا تھا۔ وہ اپنے آپ میں ایک نیا جذبہ محسوس کر رہی تھی۔ اسے اپنی زندگی کسی کنارے تو لگانی تھی۔ اس نے اپنا سب سے خوبصورت لباس شو کے لیے منتخب کیا۔ شو ایک زمیندار کے گھر تھا جس کے بیٹے کی شادی تھی۔ دولہا کے دوست جو اس کے ساتھ ایڈورڈ کالج پشاور میں پڑھتے تھے، ایک ٹولی کی شکل میں سٹیج کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔ یہ لڑکے باقی پٹھانوں سے مختلف تھے۔ انہوں نے نہ تو بڑی بڑی پگڑیاں پہنی ہوئی تھیں اور نہ ہی شانوں پر بندوقیں لٹکائی ہوئی تھیں۔ لیلیٰ نے اپنی توجہ انہی لڑکوں پر مرکوز کی۔

لیلیٰ نے ایک نئے اعتماد کے ساتھ پُرزور رقص پیش کیا۔ اس کی اداؤں اور نازو انداز میں ایک نئی کشش تھی۔ لیلیٰ کو ان لڑکوں میں ایک بالکل شہزادوں کی طرح لگ رہا تھا۔ اس نے اس لڑکے کی آنکھوں میں دیکھنا شروع کر دیا۔ نگاہیں چار ہوئیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ لیلیٰ پر لوگ نوٹ نچھاور کر رہے تھے۔ اس لڑکے نے بھی آگے ہو کر اسے ویل دی۔ لیلیٰ نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کا تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ اس بات کی تصدیق جلد ہی ہو گئی جب وہ لڑکا اٹھ کر اسٹیج کے پیچھے والے حصے میں جا پہنچا۔ لیلیٰ اس وقت ایک دوسری رقاصہ کے ساتھ دوبارہ اسٹیج پر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ دونوں کی ملاقات اگرچہ مختصر رہی مگر انہوں نے شو کے فوراً بعد ملنے کا پروگرام بنا لیا۔

رقص کے بعد لیلیٰ نے ورائٹی شو کے منیجر کے ساتھ واپس جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ بعد میں خود واپس آئے گی۔ منیجر نے بڑی ناراضگی ظاہر کی مگر لیلیٰ نے اس کی ایک نہ سنی۔

لیلیٰ اس شخص کے ساتھ غائب ہو گئی۔ اس کے گھر والے سخت پریشان تھے۔ جمیلہ نے تو پیر

صاحب کے مزار پر اس کی واپسی کے لیے منّت بھی مانی لیکن لیلیٰ نہ واپس لوٹی اور نہ اس نے اپنی کوئی خبر بھیجی۔ تین ہفتے بعد اچانک ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ لیلیٰ ایک بڑے حسین جوان کے ساتھ میرے گھر آ پہنچی ہے۔ اس وقت صرف میری والدہ اور بھائی گھر پر تھے۔ انہوں نے ان مہمانوں کی خاطر داریاں کیں۔ میری والدہ کو علم نہ تھا کہ لیلیٰ اپنے گھر سے فرار ہوگئی ہے اس لیے وہ اس سے بڑی محبت سے ملیں۔ انہوں نے لیلیٰ کو ایک فرد کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔

جب تک میں کام سے گھر پہنچی لیلیٰ کا دوست پشاور واپس جا چکا تھا۔ میرے بھائی کو اس بات پر بہت تعجب تھا کہ بات چیت میں وہ لڑکا کسی بھی دوسرے مہذب لڑکے کی طرح لگ رہا تھا۔ خوش شکل، خوش لباس اور تمیز والا، بالکل جیسے اُسکا کوئی بھی متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والا دوست۔ اس کا خیال تھا کہ طوائفوں کے گاہک کسی غنڈے کی طرح لگتے ہونگے۔ میں اور میرا بھائی بعد میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ عام تصور یہی ہے کہ گاہک کوئی عجیب مخلوق ہوتی ہے مگر یہ ہمارے آپ کے جیسے عام لوگ ہی ہیں اور یہی عام مرد اس محلّے کو آباد رکھے ہوئے ہیں۔

میرے گھر سے لیلیٰ نے قیصرہ کو فون کر کے بتایا کہ وہ واپس لاہور آ رہی ہے۔ اگلے دن وہ واپس چلی گئی۔ اس نے قیصرہ سے نہ تو کوئی معذرت کی نہ ہی اپنے غائب ہونے کی لمبی چوڑی وجوہات بتائیں۔ اُس کا رویہ ایسا تھا جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ قیصرہ نے بھی صورتِ حال بھانپ لی اور لیلیٰ کا مزاج دیکھ کر بات کو زیادہ طول نہیں دیا۔

لیکن میرے دل کو یقین تھا کہ لیلیٰ میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ اس مرد کے ساتھ اپنے گھر سے غائب ہو کر لیلیٰ نے اپنی پوری زندگی میں پہلی بار کوئی قدم صرف اپنی مرضی سے اٹھایا تھا!

لیلیٰ واپس اپنے کام میں لگ گئی۔ وہ اسی طرح ہر شام اپنی محفل سجاتی رہی اور ورائٹی شو وغیرہ میں حصہ لیتی رہی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد دوبارہ اپنی پرانی ڈگر پر واپس آ گئی۔ اس نے پھر گاہکوں کا دل بہلانا ترک کر دیا۔ نتیجتاً خاندان کے سامنے پھر مفلسی کے بھیانک سائے لہرانے لگے۔ ان حالات میں ببلی ان کے لیے ایک سہارا بن سکتی تھی۔ مگر ببلی کے ارادے کچھ اور ہی تھے۔

ببلی اس گھر یا محلے میں کسی سے بھی نہیں گھلی ملی تھی۔ وہ اپنے دل کی بات کسی کو نہ بتاتی تھی۔ ایک دن اس نے اچانک اعلان کر دیا کہ اسے پھر کسی سے عشق ہو گیا ہے۔ قیصرہ نے ببلی کو خوب بُرا بھلا کہا۔ لیلیٰ نے، جو اَب اس کاروبار کی زیادہ ذمہ داری سنبھال رہی تھی، قیصرہ کا پورا ساتھ دیا۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ شخص اس کا مستقل گاہک بن جائے اس طرح اس کی مراد بھی پوری ہو جائے گی اور خاندان کی آمدنی بھی ہوتی رہے گی۔ قیصرہ نے تو یہ بھی کہا کہ ببلی کے عاشق کو اس کی

پرورش کے سارے اخراجات بھی دینے چاہئیں۔ لیکن ببلی پر ان التجاؤں اور دھمکیوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ایک دن وہ بھی گھر سے غائب ہوگئی۔

شاہد ان دنوں گھر پر ہی تھا۔ اسے علم ہوا تو وہ غصے سے دیوانہ ہوگیا۔ اس نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ ببلی کا کھوج نکالا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ ببلی کا نکاح پڑھایا جا چکا ہے تو اس کے جوش و جذبے پر اوس پڑگئی۔ قانونی شادی ہونے کے بعد وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ پھر ببلی نے صاف کہہ دیا کہ وہ اب اس پورے خاندان سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی۔

شاہد ناکام واپس لوٹا اور اس نے قیصرہ سے کہا: ''قصور ہمارا اپنا ہے۔ ہم نے کرن کی دفعہ ہار مان لی، وہ بدنامی اپنے سر لے لی، اور اب ببلی... جب ہماری اپنی لڑکی ہمارے قابو میں نہیں تو ہم دوسروں سے کیا لڑیں؟ اگر میں اس کو اٹھوا کر بھی واپس لے آؤں تو کیا وہ آ کر دوبارہ کام پر لگے گی؟ نہیں، وہ ضدی ہی رہے گی۔''

قیصرہ خاموش رہی۔ شاہد نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا، ''بس دعا کرو، ببلی کا شوہر اپنے خاندانی مسائل میں گِھر جائے اور اُسے خود ببلی کو چھوڑنا پڑے۔''

لیلیٰ ہر رات اکیلی گاہکوں کو لبھانے سے تھک گئی تھی۔ اس نے اپنے کوٹھے پر دوسری رقاصاؤں کو مدعو کرنا شروع کردیا۔

ایک روز دوپہر کے وقت جب سب 'ناشتہ' کر رہے تھے ببلی گھر میں داخل ہوئی۔ سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ صرف ببلی کی ماں جمیلہ دوڑ کر آگے بڑھی اور اسے گلے لگالیا۔ ساتھ ہی اس نے روتے ہوئے سوالوں کی بوچھاڑ کردی، ''تم ٹھیک تو ہو؟ تم خود آئی ہو یا اس آدمی نے نکال دیا؟ بتاؤ، میری بچی؟'' قیصرہ اور لیلیٰ نے اس سے کوئی بات نہ کی، جیسے اپنی ناراضگی بتانا چاہتی ہوں۔ ببلی کسی سوال کا جواب دیئے بغیر اندر بھاگ گئی، اپنے بستر پر گر کر خوب روئی اور روتے روتے سوگئی۔

لیلیٰ کو ببلی پر بہت غصہ تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ ببلی ان کو جب چاہے استعمال کرتی ہے مگر اپنے دل کی بات کبھی نہیں بتاتی۔ قیصرہ نے اسے کہا کہ بہتر یہی ہے کہ ببلی کو اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ اس نے لیلیٰ کو یاد دلایا کہ جب وہ لندن سے آئی تھی تب بھی اسی طرح کسی کو کچھ نہیں بتاتی تھی۔ ساتھ ہی دکھ سے اس کے آنسو نکل آئے۔ وہ کہنے لگی: ''شمسہ کے بچے سمجھتے ہیں میں یہاں ہوٹل چلا رہی ہوں۔ ان کا جب دل کرے آئیں اور جب دل کرے جائیں۔ نہ انہیں مجھے بتانے کی ضرورت ہے اور نہ ہی پوچھنے کی۔ ہاں، مجھ پر یہ لازم ہے کہ انکی طبیعت کے مطابق ہر طرح ان کے لیے حاضر رہوں۔'' لیلیٰ نے قیصرہ کی بات سے پورا اتفاق کیا۔

اگلے دنوں میں گھریلو سیاست میں کافی تبدیلی آئی۔ ببلی اپنی ماں کے زیادہ قریب ہوئی، اس کے ساتھ دل کی بات کرنے لگی اور اس کے ردِعمل میں لیلیٰ قیصرہ کے زیادہ قریب ہونے لگی۔ لیلیٰ اور قیصرہ، دونوں کو یقین تھا کہ ببلی نے ساری باتیں جمیلہ سے کر لی ہیں مگر وہ ماں بیٹیاں سارا مسئلہ اپنے تک ہی رکھ رہی ہیں۔ جمیلہ اس خاندان کو بہت اچھی طرح جانتی تھی اور قیصرہ سے کسی قیمت پر بگاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے ببلی کو سمجھانا شروع کیا کہ وہ خود قیصرہ سے بات کرے تاکہ گھر میں یہ عجیب تناؤ ختم ہو، مگر ببلی نے ایک نہ سُنی۔ جمیلہ نے کہا کہ آخر قیصرہ گھر کی سربراہ ہے اور یہ جاننا اس کا حق ہے کہ ماجرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اب جبکہ ببلی نے رہنا بھی اس کے گھر میں ہے تو قیصرہ سے بات کرنا ضروری ہے۔ جب ببلی نہ مانی تو جمیلہ نے خود حوصلہ کیا اور جا کر قیصرہ کو بتایا کہ ببلی کے خاوند نے اسے بہت مارا ہے۔ قیصرہ غصے سے پاگل ہوگئی کہ اس کے خاندان کی لڑکی پر کوئی ہاتھ اٹھائے! وہ زور زور سے چیخنے لگی: ''اب پتا چلا شادی کے بعد کیا ہوتا ہے؟ تم لڑکیاں یہاں بیٹھ کر شادی کو کسی سہانے سپنے کی طرح دیکھتی ہو۔ یہاں کم از کم تم اپنی شرائط پر اپنی محنت سے حلال کی روٹی کماتی ہو۔ تمہیں ہر طرح کا آرام ہے۔ جبکہ وہاں ایک آدمی کو اپنا آپ دے کر اس کے ہاتھ میں لگامیں تھما دیتی ہو۔ اس کے کام بھی کرو اور اسکی ماریں بھی کھاؤ۔'' سب اس کی باتیں خاموشی سے سُن رہے تھے۔

وہ بولنے لگی: ''واہ بھئی ان کے ہاں تو مردوں کے بڑے مزے ہیں، مفت کے غلام ملتے ہیں انہیں۔ اور بیویوں کو دیکھو کہ وہ کتنی بیوقوف ہیں۔ نہ صرف اپنے آپ کو غلامی میں دیتی ہیں بلکہ ساتھ جہیز بھی لاتی ہیں ان حرامیوں کا گھر بھرنے کے لیے۔ اور اوپر سے جو بچے پیدا کرتی ہیں وہ بھی اس مرد کی ملکیت ہوتے ہیں۔'' پھر اس نے طنزیہ ہنستے ہوئے کہا، ''کیا بات ہے جی اس نظام کی۔'' اس نے سنجیدگی سے لڑکیوں کی طرف دیکھا اور لیلیٰ سے مخاطب ہو کر سوال کیا، ''کیا تم بھی یہی بیوقوفی کرو گی؟''

لیلیٰ نے کوئی جواب نہ دیا۔ قیصرہ کے گھر میں ساری شام غم و غصے کا رونا دھونا چلتا رہا۔ وہ ببلی کو الزام بھی دیتی رہی اور آنسو بھی بہاتی رہی۔

اگلے دن ببلی پھر گھر سے غائب ہوئی۔ سب حیران رہ گئے۔ انہیں معلوم ہوا کہ اُسکے خاوند نے اسے کسی کے ہاتھ معافی کا پیغام بھیجا تھا۔ سارے گھر پر جیسے پھر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ دُکھی تھا مگر ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ جمیلہ بہت غمگین، سارے گھر کے کام کرتی رہی مگر آنکھوں سے لگا تار بہتے ہوئے آنسوؤں پر اس کا بس نہیں چلتا تھا۔

لیلیٰ ٹی وی کے آگے بیٹھی ایک کے بعد دوسری فلم دیکھ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی الجھنیں اور دکھ
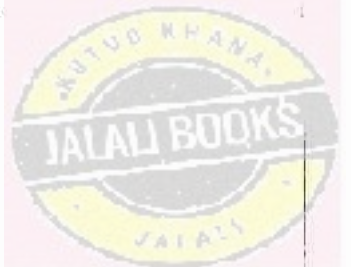
ویڈیو پر لگی فلموں کے پیچھے چھپا لیتی تھی۔ قیصرہ کی حالت بُری تھی۔ اُسے اندر ہی اندر ایک احساسِ جرم کھائے جا رہا تھا۔ شاید اسے ببلی کو الزام دینے کی بجائے پیار سے بات کرنی چاہیے تھی۔ وہ اگر ببلی کو پہلے سے بتا دیتی کہ معافیاں مانگنا ان مردوں کی عادت ہے اور وہ اسے پھر مارے گا تو شاید ببلی اس پیغام پر یقین نہ کرتی۔ شاید اگر وہ ببلی کو اپنے سینے سے لگا لیتی تو اسے پھر گھر چھوڑ کر جانا قبول نہ ہوتا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر روتی رہی۔

ان کو ببلی کی کوئی خبر نہ ملی۔ اور جب ملی بھی تو تقریباً ایک سال بعد جب وہ ایک بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔ قیصرہ کے خاندان نے اس سے رابطہ کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

لیلیٰ نے دوسری مرتبہ بھی بیٹے کو جنم دیا۔ قیصرہ صدمے سے نڈھال ہوگئی۔ ''یہ ہماری خطاؤں اور گناہوں کی سزا ہے!'' اس نے کہا۔ کفّارہ ادا کرنے کے لیے اس نے پیر کے مزار پر ایک دیگ چڑھائی۔ لیلیٰ بھی بہت مایوس تھی، لیکن میرے سامنے وہ اس دکھ کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی۔

میری تحقیق مختلف مراحل طے کر رہی تھی اور کافی عرصے تک مجھے لیلیٰ سے ملنے کا موقع نہ ملا۔ ایک بار بسنت کا تہوار منانے میرا لاہور جانا ہوا تو میں لیلیٰ سے ملنے جا پہنچی۔ لیلیٰ نہا کر نکلی تھی اور بالکنی میں اپنے گیلے بالوں میں کنگھا کر رہی تھی۔ وہ مجھ سے محبت بھری شکایتوں سے ملی۔ میرے کٹے ہوئے بال دیکھ کر تو وہ غصے سے بپھر گئی۔ میرے لمبے بال جو اُسے اِس قدر پسند تھے میں نے کیوں کٹوائے اور وہ بھی اس سے پوچھے بغیر۔ پھر اس نے کوبے کو آواز دی۔

''کوبے! جاؤ فوزیہ باجی کے لیے ٹھنڈا دودھ لے کر آؤ!'' پھر اس نے اپنے پلّو کی گانٹھ سے پیسے کھول کر کوبے کو دیئے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ لیلیٰ پہلے تو ہمیشہ بچوں کی آواز بنا کر ہر فرمائش قیصرہ سے کیا کرتی تھی۔ یہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ لیلیٰ نے مجھے بتایا کہ وہ پشاور اکثر آتی جاتی ہے۔ گزشتہ مہینوں میں جو کچھ بھی اس نے کیا اور ہمارے دوسرے مشترکہ دوستوں نے کیا، وہ سب اس نے مزے لے لے کر مجھے بتایا۔

میری موجودگی میں لیلیٰ نے اپنی چھوٹی بہن یاسمین کو زور سے آواز دی۔ ''یاسمین! کب تک سوتی رہوگی۔ اٹھّو! دیکھو کون آیا ہے!'' پھر اپنے آپ سے کہنے لگی، ''انسان کو چاہیے کہ اپنا دن بارہ بجے تک شروع کر دے۔ اتنا سونا نہیں چاہیے۔'' ''یاسمین'' وہ زور سے چلائی۔

پھر اس نے مجھ سے کہا: ''اسے بس کھانے اور سونے کا شوق ہے۔ اوپر سے موٹی ہوتی جا رہی ہے۔ ذرا اس کی عمر دیکھو اور جثّہ دیکھو! بس ہر وقت کوئی بہانہ چاہیے کہ ریاض کرنے سے بچ جائے۔ یہ اپنے کام میں سنجیدہ نہیں۔ اس کے یہی لچھن رہے تو کیسے گزارہ ہوگا!''

حیرت سے مبہوت میں لیلیٰ کی باتیں سُن رہی تھی جو پاندان کھول کر اپنے لیے پان لگانے میں مصروف تھی اور کہہ رہی تھی: "... اور یہ میری بات نہیں سنتی۔ مجھے اس کے مستقبل کی فکر ہے، میں نہیں چاہتی یہ آگے چل کر ناکام ہو... مگر اِسکو بیٹھ کر کھانے اور ہنسی مذاق سے فرصت نہیں۔"

صرف تھوڑے عرصے پہلے ہی تو قیصرہ بالکل یہی باتیں لیلیٰ کے لیے کہتی تھی۔ اور اب... لیلیٰ ایک صدائے بازگشت کی طرح یاسمین کے لیے قیصرہ کے الفاظ دہرا رہی تھی۔ قدم بہ قدم... لیلیٰ نائیکہ بننے کا راستہ طے کر رہی تھی۔

باب ۳۱

ایک ہی راستہ

لیلیٰ کی توجہ اب اپنی چھوٹی بہن یاسمین پر مرکوز تھی۔ وہ اس کے مستقبل کے لیے سنہرے خواب دیکھ رہی تھی۔ یاسمین ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ گول چہرہ، موزوں نین نقش اور گندمی رنگ۔ دیکھنے میں وہ خاموش سی لڑکی تھی مگر اس کو اپنی پُرکشش شکل پر بڑا مان تھا، ہر دفعہ جب میں ان کے گھر جاتی تو یاسمین کا وزن پہلے سے زیادہ ہوتا۔

یاسمین کو یہ بھی گمان تھا کہ اسے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں۔ پہلے پہل اس نے لیلیٰ کے ساتھ ورائٹی شو میں جانا شروع کیا۔ کیونکہ ابھی یاسمین کی نتھ اتروائی نہیں ہوئی تھی، یہ ضروری تھا کہ گھر کا کوئی ذمہ دار شخص اس کے ساتھ جائے۔ لیلیٰ یہ کام بڑی لگن سے کر رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح یاسمین کو فلم میں کوئی کام مل جائے۔

اس محلے میں فلمی دنیا کے کئی ایسے لوگ آتے تھے جو فلموں کے لیے ان گلی کوچوں سے ''ایکسٹرا'' کا کام کرنے والی عورتیں اور لڑکیاں فراہم کرتے تھے۔ یہ لڑکیاں وہ اپنے فنانسر کو جنسی خدمات کے لیے بھی پیش کرتے تھے لیکن انہیں باقاعدہ دلال نہیں کہا جا سکتا، گو وہ یہ کام بھی کر لیتے تھے۔

شاہد اور قیصرہ یاسمین کی نتھ اترائی کے لیے موٹی اسامی کی تلاش میں تھے لیکن لیلیٰ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے میل جول بڑھانے میں مصروف تھی تا کہ یاسمین کو فلم میں پہلا کام کرنے کا موقع مل سکے۔ اس نے اچھے فوٹو گرافروں سے یاسمین کی بہت سی تصویریں کھنچوائیں اور

ایک پورٹ فولیو تیار کر کے ہدایت کاروں اور پروڈیوسروں کو پیش کرنا شروع کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ کامیابی رشتوں اور رابطوں کے ذریعے نصیب ہوسکتی ہے اس لیے ایک خاص شخص پر اس نے اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی۔ یہ آدمی ان کے کوٹھے پر آتا جاتا رہتا تھا اور اس نے لیلیٰ کے دل میں امید جگا دی تھی کہ اپنے ہدایت کار کی اگلی فلم کے لیے وہ یاسمین کو بہت اچھا کام دلوا دے گا۔

لیلیٰ اس کی خاطر داری میں لگی رہتی تھی۔ اس ایجنٹ سے وہ اپنے جسم کے دام بھی وصول نہ کرتی تھی۔ ایک بار تو اس نے ایجنٹ کو کچھ رقم ادھار بھی دی جو اس بازار میں ایک ان ہونی بات تھی۔ لیکن اس ایجنٹ نے یاسمین کے مستقبل کے لیے لیلیٰ کو ایسا روایتی سبز باغ دکھایا تھا کہ وہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے جی جان سے ہر کوشش کر رہی تھی۔ اس نے محلے والوں سے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ یاسمین کو عنقریب ہی ایک فلم میں بڑا اہم کام ملنے والا ہے۔

لیلیٰ اب اس انتظار سے تھک رہی تھی مگر پھر بھی بہت پُر امید تھی۔ اچانک اسے کسی نے بتایا کہ جس فلم کے لیے وہ یاسمین کی امید لگائے بیٹھی ہے اس میں تو نہ صرف کسی اور کو لے لیا گیا ہے بلکہ فلم کی شوٹنگ بھی کئی ہفتے ہوئے شروع ہو چکی ہے۔ لیلیٰ کے لیے یہ خبر کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ پتا کروانے پر اسے یقین ہو گیا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بہت ذمہ دار اور ہوشیار سمجھ رہی تھی۔ اس حادثہ نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ شاید ابھی وہ اتنی تجربہ کار نہیں تھی کہ انسانوں کی پہچان کر سکے۔ اس کے دل میں لوگوں کے لیے ایک کڑواہٹ سی آ گئی۔

ان ہی دنوں لیلیٰ کا مکان ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ بجلی کا سرکٹ شارٹ ہونے کے باعث ایک رات اس مکان میں آگ لگ گئی۔ اس عمارت کا نصف حصہ شمسہ کی ملکیت تھا۔ آگ نے اسی نصف حصے کو جلا کر راکھ کر دیا۔ شمسہ کو کبھی یقین نہ آیا کہ یہ صرف حادثہ تھا۔ اس نے یہی سمجھا کہ آگ قیصرہ نے لگائی ہے۔ وہ چند دنوں کے لیے لندن سے آئی اور اس نے قیصرہ کے دل پر ایسے نشتر چلائے کہ قیصرہ صاحبِ فراش ہو گئی۔ صحت تو اس کی پہلے بھی اچھی نہ تھی، اس جذباتی تناؤ نے اس کی قوتِ مزاحمت بالکل ختم کر دی۔ قیصرہ پر فالج نے حملہ کر دیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو گئیں۔

لیلیٰ ان دنوں ورائٹی شو کرنے کے لیے اکثر شہر سے باہر آ جا رہی تھی۔ وہ قیصرہ کو زیادہ توجہ نہ دے پائی۔ لیلیٰ پہلے بھی جب قیصرہ کے قریب ہوتی تھی اس سے ایک فاصلہ رکھتی تھی۔ قیصرہ کو اب اس کی ضرورت تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی منہ بولی بیٹی اس کا خیال کرے۔ جمیلہ پر بوجھ بننا اسے بالکل اچھا نہ لگ رہا تھا مگر وہ بے بس تھی۔

جمیلہ نے اس دوران قیصرہ کی بہت خدمت کی۔ اِنہی حالات میں اس نے قیصرہ سے ایک

دوسری وصیت بھی لکھوالی۔ کنجر برادری کی روایت کے مطابق جائیداد لڑکیوں کو دی جاتی ہے اور اس طرح لیلیٰ قیصرہ کی اکلوتی وارث تھی۔ قیصرہ نے اپنی پہلی وصیت میں اپنا ترکہ لیلیٰ کے نام کر دیا تھا۔لیکن اس بیماری میں جمیلہ نے اس کی اتنی خدمت کی کہ کنجر برادری کی ہر روایت کے خلاف اس نے اپنی جائیداد جمیلہ اور لیلیٰ کے بیٹوں کے نام کر دی تھی۔ بسترِ مرگ پر اس نے لیلیٰ سے معافی بھی مانگی کہ اس نے لیلیٰ کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔

کچھ ہفتوں بعد قیصرہ کو دل کا دورہ پڑا۔ وہ چند دن ہسپتال میں رہی اور پھر اس نے دم توڑ دیا۔لیلیٰ کی زندگی تاریکیوں میں ڈوب گئی۔ خوف کے سائے اُسے ڈرانے لگے۔ اُسے اپنا مستقبل بہت تاریک نظر آنے لگا۔ اُسے وہ بے کس عورت یاد آئی جو ایک بار ان کے گھر میں گھس آئی تھی اور قیصرہ نے اسے نکال دیا تھا۔قیصرہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی: ''بے چاری اچھے گھر کی طوائف تھی اور اب دیکھو بھکارنوں جیسا حال ہے''۔ لیلیٰ اس خوف کو برداشت نہ کر پا رہی تھی۔اس نے کامیاب ہونے کی بہت کوشش کی تھی اور جب تک یاسمین کے فلم میں کام کرنے والا حادثہ پیش نہیں آیا تھا، وہ کافی ٹھیک ٹھاک کاروبار دیکھ رہی تھی۔ مگر اب تو ایک دھچکے کے بعد دوسرا۔اور پھر قیصرہ تو ہمیشہ سب کچھ ٹھیک کرنے کے لیے تھی ہی۔ اب اس کے چلے جانے سے لیلیٰ کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ ہاں وہ قیصرہ کی جگہ لینے کی تیاری ضرور کر رہی تھی مگر اس کو ابھی اور وقت چاہیے تھا۔ وہ اپنے آپ کو زندگی کا تنہا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں پاتی تھی۔ کاش اس کو کچھ سال اور مل جاتے۔شاید قیصرہ ٹھیک ہی کہتی تھی کہ لیلیٰ کو اپنے کاروبار کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے تھی۔اس نے بہت سارے سال کِھلواڑ میں ہی گزار دیے اور اس کاروبار کی باریکیاں جو اسے سیکھنی چاہیے تھیں نہیں سیکھیں۔

قیصرہ کی آواز پھر اس کے کانوں میں آئی: ''جو اپنے کاروبار میں کامیاب نہیں ہوتیں ان کا یہی حال ہوتا ہے''۔ ''نہیں'' اس نے اپنے آپ سے کہا: ''میں بھکارن نہیں بنوں گی جو کوڑیوں کے مول جسم فروشی کرتی ہیں اور مانگ کے پیٹ بھرتی ہیں... نہیں میں کامیاب ہونگی...میں ضرور کامیاب ہوں گی۔'' وہ اپنے آپ کو یقین دلا رہی تھی مگر اس کا دل ڈر رہا تھا۔

قیصرہ کی موت کے چند ہی دنوں بعد اسے وصیت کی حقیقت پتا چلی۔ تب اس کی سمجھ میں آیا کہ قیصرہ اس سے کس بات کی معافی مانگ رہی تھی۔ساری جائیداد جمیلہ کے دو بیٹوں اور لیلیٰ کے بڑے بیٹے کے نام تھی۔ وہ یہ سب جان کر خود اپنے ہی اوپر غصہ تھی کہ وہ اپنے حق کا بھی تحفظ نہ کر سکی۔ مزید یہ کہ اُس کا شاہد سے یاسمین کے مستقبل پر جھگڑا ہو گیا اور دونوں کے درمیان سخت کشیدگی پیدا ہو گئی۔اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ شاہد سے کس حیثیت میں بات کرے۔ قیصرہ نے

اسے گھریلو سیاست کے بارے میں تو کچھ سکھایا ہی نہیں تھا۔لیلیٰ کی خواہش تھی کہ گھر کا سارا نظام اب وہ سنبھالے اور کاروبار چلائے۔ دل ہی دل میں وہ شاہد سے ڈرتی بھی تھی۔ شاہد کا وہ رعب جو لیلیٰ کے لڑکپن میں اس پر تھا اب بھی کہیں اس کے دل و دماغ میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس الجھن میں تھی کہ اُس کے کوٹھے کا کاروبار اُس کا ہے یا شاہد کا؟

ایک دن لیلیٰ نے خاموشی سے اپنا سامان باندھا اور کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ اس واقعے پر گھر والے بھونچکے ہو کر رہ گئے۔ اس کے باوجود شاہد اپنی کسی پراسرار مہم پر لاہور سے کہیں اور چلا گیا۔ اس گھر میں جمیلہ، یاسمین اور چھوٹے بچے بالکل تنہا اور بے سہارا رہ گئے۔

جمیلہ جس نے کبھی گھر کے اندرونی حصے سے باہر پیر نہیں دھرا تھا، اب کوٹھا سنبھالنے کی ذمہ داری کا سامنا کر رہی تھی۔ وقت نے اُس جیسی بے زبان عورت کو بھی ہمت دے دی۔ اس نے یاسمین سے کہا کہ وہ ہمیشہ کی طرح ہر شام محفل سجاتی رہے اور اپنے ساتھ رقص و موسیقی کی ان محفلوں میں محلے کی دوسری لڑکیوں کو بھی شامل کر لے۔ جمیلہ خود اس عمارت کے دوسرے حصوں کا کرایہ وصول کرنے میں منہمک ہو گئی۔

لیلیٰ دوبارہ پشاور چلی گئی تھی۔ اس کے بارے میں صرف یہ ہی اطلاع اس کے گھر والے دے سکتے تھے۔ جب لیلیٰ آخری مرتبہ گھر سے فرار ہوئی اس زمانے میں میری شادی ہو رہی تھی۔ یہ میری زندگی کا اہم موڑ تھا۔ شادی کی تقریب میں میں نے اپنے سارے عزیز دوستوں کو مدعو کیا تھا اور ان میں کچھ شاہی محلے کے رہنے والے بھی شامل تھے۔ یاسمین نے بتایا تھا کہ لیلیٰ گھر پر نہیں ہے، لیکن اگر اس کا فون آیا تو وہ یہ پیغام اس تک ضرور پہنچا دے گی۔

شادی کے دن تقریب کے اختتام پر لیلیٰ میرے لیے ایک تحفہ لیے میرے گھر آ پہنچی۔ میری امّی کے ساتھ کچھ وقت گزار کر، مجھے کامیاب ازدواجی زندگی کی دعائیں دے کر وہ رخصت ہو گئی۔

دو مہینے بعد مجھے اطلاع ملی کہ لیلیٰ لاہور اپنے گھر واپس آ گئی ہے۔ لیلیٰ نے شاہی محلے سے باہر زندگی گزارنے کی یہ آخری کوشش کی تھی اور وہ ایک بار پھر ناکام ہو گئی تھی۔ اب اس کے سامنے اپنے جدی پُشتی پیشے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔ یا وہ ایک بھکارن بن کر زندگی گزارتی، جو وہ بالکل نہیں چاہتی تھی۔

لیلیٰ کو قیصرہ کے آخری لمحات یاد آئے، جب اس نے لیلیٰ سے اپنی ناانصافیوں کی معافی مانگی تھی۔ اس نے لیلیٰ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کے تاکید کی تھی کہ کبھی شاہی محلّے سے اپنا گھر چھوڑ کے نہ جائے۔ اس وقت بھی قیصرہ کو یہی فکر تھی کہ لیلیٰ اپنے کوٹھے کے بغیر اس ظالم دنیا میں چل نہ پائے
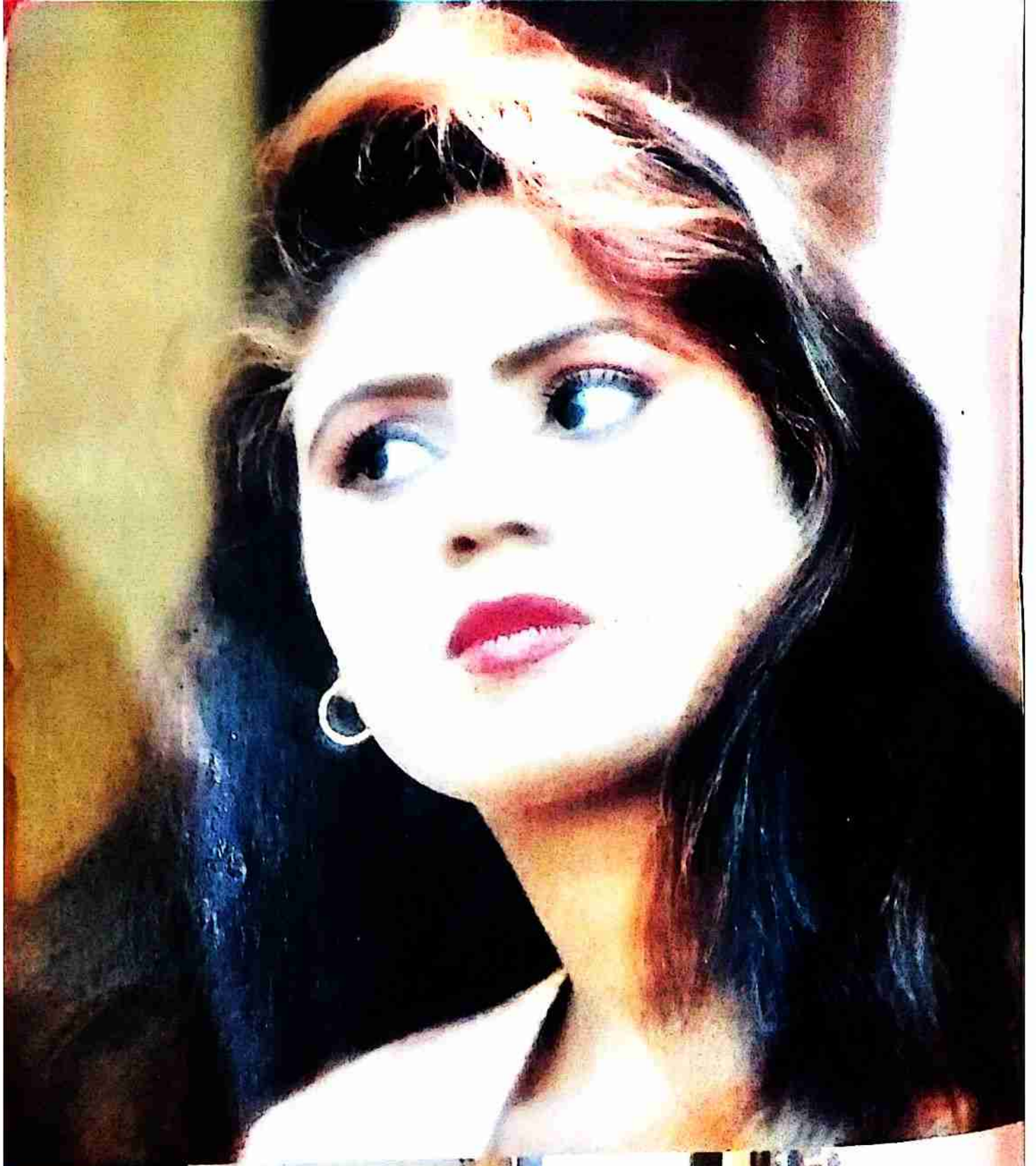
بناؤ سنگھار سے پہلے اور بعد میں.. ... بھاری میک اپ اور تیز روشنیاں اس کاروبار کا اہم جزو ہیں۔

کھلے دریچوں میں سے پھوٹتی روشنیاں اور ان میں سجی بنی رقاصائیں گاہکوں کو دعوت دیتے ہوئے۔

گاہکوں کے انتظار میں پورے بناؤ سنگھار کے ساتھ گانے کی ریاضت۔

خود اپنے رقص سے لطف اندوز ہوتے ہوئے تین رقاصائیں اپنے گاہکوں کو محظوظ کر رہی ہیں۔

نائکہ مجرے کے بعد رقم گنتے ہوئے تاکہ مجرے میں حصہ لینے والوں میں انصاف سے تقسیم کر سکے۔

ایک طوائف گاہک کے انتظار میں۔
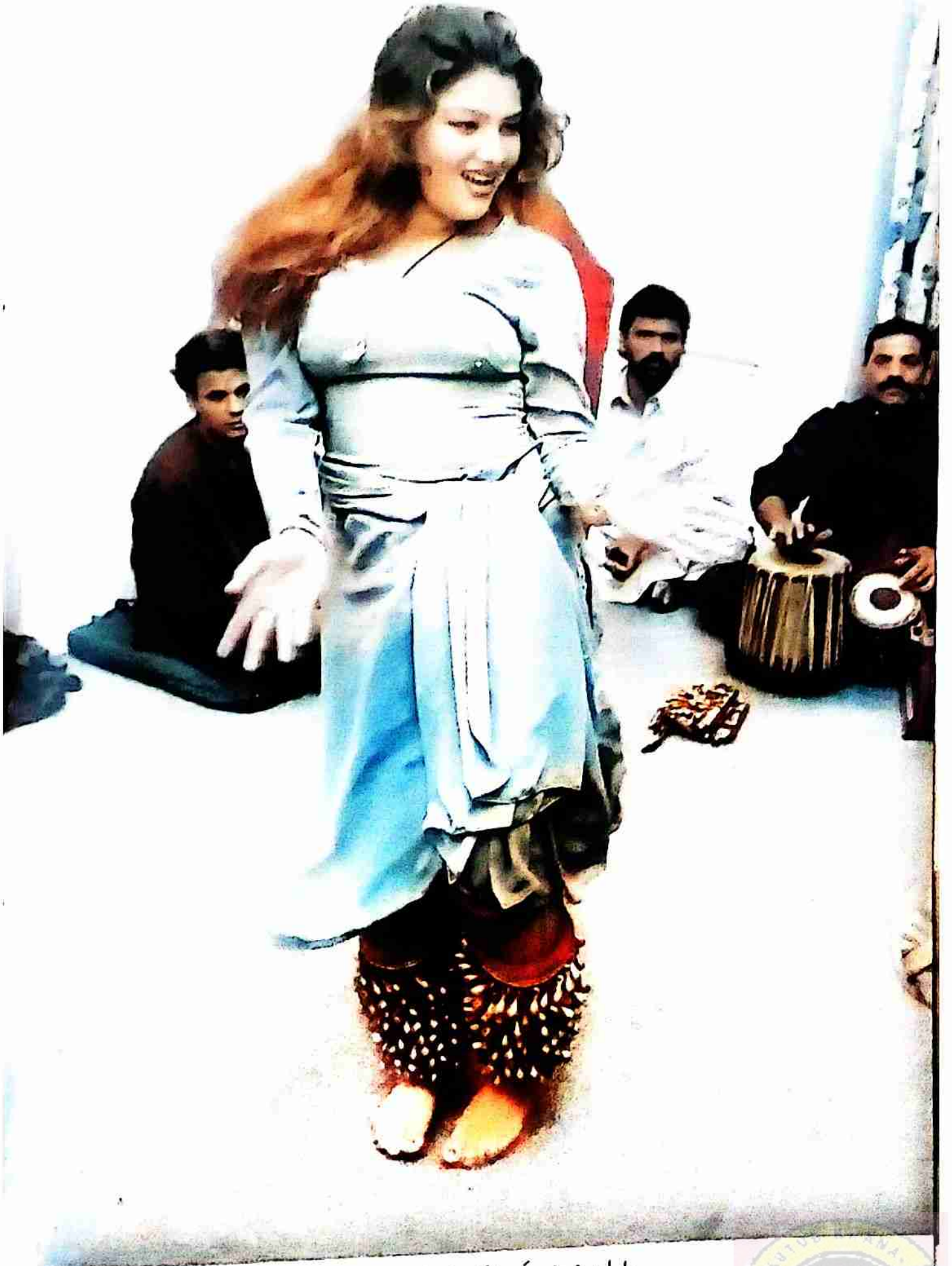
دل لبھانے والی ادائیں، گاہکوں کے دل جیتنے کے لیے
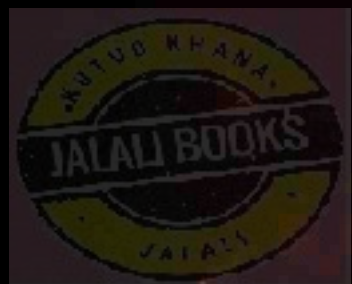
ایک نوجوان طوائف گاہک کو لبھاتے ہوئے

گی۔اس نے لیلیٰ کو مشورہ دیا تھا۔"اگر تم نے اپنی بیٹی سے یہی کاروبار کروانا ہوتو اُسے بچپن سے ہی اس کے لیے تیار کرنا۔" قیصرہ کی یہ بہت خواہش تھی کہ اس کی بیٹی اپنے کاروبار میں پکی ہو اور دنیا میں کسی سے مات نہ کھائے۔

لیلیٰ پشاور سے لوٹی تو اب اس میں خوداعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔اس نے آتے ہی کوٹھے کا تمام انتظام سنبھال لیا۔اسے اچھی طرح معلوم ہوگیا تھا کہ جسم و جان سلامت رکھنے کے لیے اسے جان توڑ محنت کرنی پڑے گی اور یاسمین کو ایک کامیاب رقاصہ اور طوائف بنانے کی تربیت بھی دینی ہوگی۔

تاثرات

سلمان شاہد

سلمان شاہد اسٹیج اور ٹی وی کے اداکار ہیں اور میرے دوست بھی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ جو عورتیں اپنے خیالات کا اظہار کھل کر کرتی ہیں سماج انہیں اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔ پاکستانی مرد ایک حد تک دوسری عورتوں کا اظہارِ خیال برداشت کر سکتے ہیں لیکن وہ یہ بالکل برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کی بیوی اپنے خیالات کا اظہار کُھل کر کرے۔ انہیں یہ خوف ہوتا ہے کہ وہ اس طرح اپنے حالات کا تجزیہ شروع کرے گی اور چاہے گی کہ اس کے ماحول میں تبدیلی آئے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستانی مرد ایسی کسی بھی بات سے خوفزدہ رہتے ہیں جس سے حالات میں تبدیلی آنے کا اندیشہ ہو۔

میں نے پوچھا، "تو پھر وہ طوائف کا پیشہ کرنے والی عورتوں میں کشش کیوں محسوس کرتے ہیں؟"

ان کا جواب تھا: "وہ اس لیے ان عورتوں کو پسند کرتے ہیں کہ وہ عورتیں روزمرہ کے جھمیلوں سے بے پروا ہوتی ہیں۔ یہ عورتیں ان کے دل موہ لیتی ہیں۔ یہ ایک بہت عجیب و غریب سی کشش ہے۔ یہ طوائفیں ان کے لیے ایک معمہ ہوتی ہیں، اپنے گھروں میں رہنے والی عورتوں سے بالکل مختلف، جنہیں یہ پہلے ہی فتح کر کے قابو کر چکے ہوتے ہیں۔ طوائف ان کے حکم کے تابع نہیں ہوتی۔ وہ خوبصورت چیز ہوتی ہے جو ایک مرد کے خوابوں کو پورا کر سکتی ہے۔ دلکش، اپنے آپ کا اظہار کرنے والی اور جنسی تکلفات سے بے پروا۔ مرد اسے چاہتے ہیں۔ وہ ان کو فتح کر لیتے ہیں لیکن کسی بھی طور ایک ناچنے والی کے آزادانہ اظہار کو قابو نہیں کرسکتے۔ ہمارے پاس کئی مثالیں موجود ہیں جو اداکارائیں شادی کر لیتی ہیں اور پھر یہ فیصلہ سنا دیتی ہیں کہ وہ آئندہ اداکاری نہیں کریں گی۔ کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟"

میں نے کہا، "ہاں، مجھے اداکاراؤں، گلوکاراؤں اور ناچنے والیوں کے ایسے کئی قِصّوں کا علم ہے۔"

سلمان نے کہا، "شبنم کے علاوہ کہ جس کا شوہر ترقی پسند تھا اور ویسے بھی (جاری)
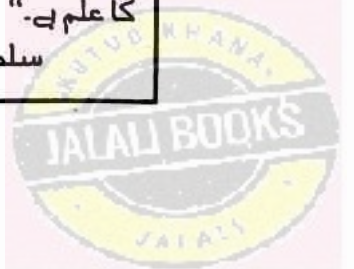
شبنم کا تعلق کسی شاہی محلّے سے نہیں ہے، کسی اور پاکستانی اداکارہ کا نام بتائیں جس نے شادی کے بعد بھی اپنا پیشہ جاری رکھا ہو یا فلموں میں کام کرتی رہی ہو۔ کبھی کبھار اگر اس کا شوہر ہدایتکار یا پروڈیوسر ہوتا ہے تو وہ اسے اداکارہ کے طور پر کام کرنے کی 'اجازت' دیتا ہے، لیکن صرف اپنی فلموں میں تاکہ اس پر نظر رکھ سکے اور اگر شوہر اداکار ہوتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ وہ صرف میرے ساتھ کام کر سکتی ہے کسی اور کے ساتھ نہیں۔"

"تو پھر بات کیا بنی؟" میں نے پوچھا۔

"میں کہوں گا تسلط (control) جو کہ معاشرتی درجہ بندی قائم رکھتا ہے، جہاں عورت ہمیشہ کمتر رہتی ہے۔" سلمان نے جواب دیا۔

باب ۳۲

سراغوں کی تلاش

اگرچہ اس کتاب کی بنیاد شاہی محلے کے باسیوں کی زندگی ہے۔ مگر یہاں کی داستانوں نے مجھے اپنے معاشرے کے بارے میں وہ علم دیا جو دوسری صورت میں مجھے نہیں مِل سکتا تھا۔ یہاں رہنے والے میرے اتنے قریب آگئے کہ چندا، لیلیٰ اور ببلی کے چہرے مجھے خواب میں بھی نظر آتے رہتے تھے۔ اس کے باوجود میں نے شدت سے محسوس کیا کہ کچھ عرصے کے لیے مجھے ان سے دور ہٹنا چاہیے۔ تاکہ ایک فاصلے سے میں اس پورے تانے بانے پر غور کرسکوں۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اسے پوری طرح سمجھنے کے لیے مجھے اس کے ماضی کے بارے میں علم ہونا چاہیے اور اس موضوع پر دوسرے محققین نے جو کچھ کہا ہے، اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

جسم فروشی کیوں؟ جسم فروشی پر کلنک کیوں؟؟ اور یہ سلسلہ صدیوں سے کیونکر قائم ہے؟؟؟ میں جسم فروشی کی جڑوں تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اگر چکلے موجود ہیں تو انہیں ایک ناسور کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اور اس نفرت کے بلند بانگ اظہار کے باوجود یہ ہمیشہ جاری کیوں رہتے ہیں؟

میں نے لائبریریاں کھنگال ڈالیں، کمپیوٹر پر انٹرنیٹ سے مجھے جتنی معلومات حاصل ہوسکتی تھیں ان میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس تلاش نے گو مجھے میرے سوالوں کا مکمل جواب نہ دیا لیکن مجھے کئی سراغ ملے جن پر میں کسی دوسرے محقق کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتی تھی۔

ایک دن اسلام آباد میں محکمہ نیشنل آرکائیوز کی تنگ راہداریوں میں اچانک مجھے پال امین نظر

آئے۔ یہ میرے پرانے دوست تھے اور سندھ اور راجستھان میں موسیقی کی روایات پر تحقیق کرنے کے لیے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ دعا سلام کے بعد ان سے غلطی یہ ہوگئی کہ انہوں نے مجھ سے میری تحقیق کے موضوع کے بارے میں سوال پوچھ لیا۔ پھر کیا تھا! میں تو جیسے منتظر ہی بیٹھی تھی۔ میں نے اپنی تحقیق، اپنے خیالات، احساسات، سب کچھ ایسی روانی سے سنانے شروع کر دیے کہ پال دم بخود ہو کر رہ گئے۔

یہ سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب لائبریرین نے ہمارے قریب آ کر ہمیں سختی سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پال سخت شرمندہ ہوئے اور مجھے گھسیٹ کر لائبریری سے نکال لائے۔ بقیہ گفتگو ہم نے اس دفتر کی کینٹین میں کی۔ میرا جوش و خروش اور تجسس بھلا ایسی معمولی دخل اندازی سے کہاں ختم ہونے والا تھا۔ میں نے پھر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں کہہ رہی تھی:

''پال، جتنے مضامین میں نے اس موضوع پر پڑھے ہیں، انہوں نے مجھے اور بھی غیر مطمئن کر دیا ہے۔ ان میں جسم فروشی کی وجوہات پر تو بحث کی گئی ہے لیکن اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ آخر چکلے ہر دور میں موجود کیوں رہتے ہیں۔ ان دونوں حقائق کی وجوہات ہرگز ایک نہیں ہیں۔''

پال نے پوچھا: ''دوسرے محقق جسم فروشی کی کیا وجوہات بتاتے ہیں؟''

''وہ غربت کو اوّلین وجہ بتاتے ہیں۔'' میں مسکرائی۔ ''غربت کو معاشرے کی ہر برائی کی وجہ بتایا جاتا ہے۔ لیکن انہیں جاری و ساری رکھنے میں، بلکہ انہیں کامیاب کرنے میں جو عوامل کارفرما ہیں ان کا ذکر تک نہیں کیا جاتا۔ اور بھی کئی پہلو نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کیا وجہ ہے کہ جنسی تعلق کی خرید و فروخت میں آخر مرد ہمیشہ گاہک اور عورت بکاؤ مال ہوتا ہے؟ کیا غربت صرف عورت کو متاثر کرتی ہے، مرد پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا؟ اس کی وضاحت بھی نہیں ملتی کہ قابل نفرت صرف جنسی خدمات پیش کرنے والیاں ہی کیوں سمجھی جاتی ہیں؟ خریداروں کو معاشرے کی نفرت و حقارت کا سامنا کیوں نہیں کرنا پڑتا؟ کسی بھی زبان میں ''رنڈی'' اور ''دلال'' گالی سمجھے جاتے ہیں۔ گاہک اور خریدار کے الفاظ گالی نہیں بنے۔ آخر کیوں؟ میرے لیے یہ بھی ایک معمہ ہے کہ جب اسے اس قدر برا سمجھا جاتا ہے تو یہ ختم کیوں نہیں ہو سکتا؟''

میری بات پر پال نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا: ''تم اپنے موضوع کا بہت گہرائی سے مطالعہ کر رہی ہو۔ میں اس ہفتے ہر روز یہاں آتا رہوں گا تا کہ اس موضوع پر ہم سنجیدگی سے مزید گفتگو کر سکیں۔''

اس طرح ہماری گفتگو کا آغاز ہوا اور میرے ذہن میں کلبلاتے ان گنت سوالوں کو ایک راستہ مل سکا۔ کتابوں اور کاغذات کے ڈھیر میں پال اور میں محوِ گفتگو رہتے۔ ہم اس موضوع پر گفتگو کرتے

کہ موسیقی اور بازارحسن میں کیا ربط رہا ہے اور راجستھان کے راج گھرانے نے اس کی سرپرستی کس طرح کی؟

اسی نوعیت کی ایک گفتگو کے دوران میں نے کہا: ''پال! مجھے تحقیق کے دوران ناقابلِ یقین ''سراغ'' ملے ہیں۔ ڈول گو پول نے اپنے مقالے ''دوسری جنگِ عظیم کے دوران ایشیا میں جسم فروشی'' میں لکھا ہے کہ مفتوحہ علاقوں کی عورتوں کو جبراً ایسے چکلوں میں کام کرنے کے لیے لایا جاتا تھا جو جاپانی فوجیوں کے لیے قائم کیے گئے تھے۔ چکلے قائم کرنے کے اور عورتوں کو وہاں تک لے جانے کے اخراجات جاپانی حکومت ''اخراجاتِ جنگ'' کی مد میں درج کرتی تھی۔ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان تقریباً دو لاکھ مفتوحہ عورتوں کو ان چکلوں میں بھرتی کیا گیا۔ ایک وقت میں ان عورتوں کو ''خصوصی خدمات مہیا کرنے والے گروہ'' کا نام بھی دے دیا گیا تھا۔ ان چکلوں کا انتظام و انصرام جاپانی فوج خود کرتی تھی اور یہ خاص توجہ دی جاتی تھی کہ کوئی فوجی کسی طوائف سے جذباتی تعلقات قائم نہ کرے۔ میری نظر میں یہ واضح ثبوت ہے کہ مردوں کا ایک طاقتور ادارہ جسم فروشی کو کسی طرح بطور کاروبار جنم دے کر قائم رکھتا ہے۔ اور یہ صرف زمانہ جنگ میں ہی نہیں ہوتا۔ جنوبی ایشیا میں ہمیں حکمران طبقوں اور بازارِ حسن کے مابین مضبوط کڑیاں نظر آ سکتی ہیں۔ بادشاہوں نے صرف ان کے فنونِ رقص و موسیقی کی ہی سرپرستی نہیں کی، انہوں نے جسم فروشی کو بھی ایک معاشرتی ادارے کی حیثیت سے دوام دیا۔ ان میں درجات پیدا کیے اور انہیں قابلِ قبول بنایا۔

''کڑیوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' پال نے پوچھا۔ ''اور ''حکمران طبقے'' تم کن لوگوں کو کہتی ہو؟''

میں نے فوراً جواب دیا۔ ''اس سے میری مراد حکمران ہیں جو ریاست یا مملکت کا انتظام و انصرام کرتے تھے اور دوئم فوجی سالار، فوج جن کے زیرِ نگیں ہوتی ہے۔ اکثر یہ دونوں کام ایک ہی قسم کے لوگ کرتے تھے۔ تیسرے نمبر پر مذہبی رہنما آتے ہیں جن کا انصرامِ حکومت میں عمل دخل رہا ہے۔ آپ جانیں، جنوبی ایشیا میں فاتح اقوام کے مذاہب مقامی مذہبی راویتوں پر چھا سے گئے۔''

''اور کڑیاں کیا ہیں؟'' پال نے پوچھا۔

''میں نے اس تحقیق کے دوران یہ دریافت کیا کہ ان تینوں طبقات نے طوائفوں کے پیشے کی ترویج کی اور طوائفوں کو تحفظ دیا۔''

''لیکن اسے ثابت کیسے کروگی؟'' پال نے کہا۔

''ثابت!!'' میں نے جوش و خروش سے کہا۔ ''ایسے ایسے ثبوت موجود ہیں کہ کوئی سوچ بھی

نہیں سکتا۔ یہ دیکھیے۔'' میں نے ایک کھلی ہوئی کتاب اس کے سامنے رکھ دی۔

''اس تاریخ دان Joardar نے تین سو برس قبل مسیح کا ایک متن پیش کیا ہے۔ چندر گپت موریہ کے زمانے میں لکھی اس دستاویز سے پتا چلتا ہے کہ حکومت محصولات وصول کرنے کے لیے چکلوں کی نگہداشت کرتی تھی۔ جسم فروشی کو ایک کارِ مملکت سمجھا جاتا تھا۔ ریاست یا مملکت کے اربابِ حل وعقد جسم فروشی کو جاسوسی کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ حکومت طوائفوں کا ایک مہتم مقرر کرتی تھی جو رقص وموسیقی کی تربیت کی نگہداری کرتا تھا اور ان کے کاروبار اور آمدنی کا انتظام کرتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں حکومت وہ کام کرتی تھی جو نائیکہ کرتی ہے۔ بہر حال وہ تو حکومت تھی جو نائیکہ سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ اگر کوئی طوائف بادشاہ کی نافرمانی کرتی تو اسے سزا دی جاتی تھی۔''

''اچھا؟'' پال نے کہا۔

''یہ سب کچھ... ان کتابوں میں موجود ہے۔'' میں نے اشتیاق سے بتایا۔ ''ایک ہزار سال قبل مسیح سے ہندوستان میں رقص وموسیقی کی ماہر طوائفوں کا رواج موجود ہے۔ آریہ نسل کے حکمران غیر ملکی بادشاہوں کو ان عورتوں کا تحفہ بھی پیش کیا کرتے تھے۔ لیکن جسم فروش عورتوں تک عام شہری کی رسائی نہیں تھی۔ صرف طبقۂ اشرافیہ ان سے فیض یاب ہو سکتا تھا۔''

پال نے میری کتابوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا: ''یہ... البیرونی کے متن پر تم نے نشان کیوں لگائے ہیں؟''

''البیرونی ۱۰۳۰ء کے دور کا نامور دانشور اور سیاح تھا۔ دیکھیے اس نے کیا لکھا ہے۔''

پال نے پڑھا: ''... راجہ مہاراجہ طوائفوں کے ذریعے دولت کماتے ہیں۔ طوائفوں پر جرمانے اور محصولات کے ذریعے وہ ایسی رقم دوبارہ خزانے میں ڈال دیتے ہیں جو فوج پر خرچ کرتے ہیں۔''☆

''دیکھا!'' میں نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں نے ان کڑیوں کو شناخت کر لیا!''

پھر میں نے اضافہ کیا۔ ''اور یہ بھی دیکھیے... مغل سلطنت سے پہلے ہندوستانی رجواڑے طوائفوں سے حاصل ہونے والی رقومات سے پولیس کی بڑی بڑی نفریاں... قائم رکھتے تھے۔''

میرا جوشِ اشتیاق قابلِ دید تھا۔ پال نے ہنس کر کہا: ''چلو کہیں چائے پیتے ہیں۔''

ہم دونوں اٹھ کر ایک ریستوران میں آ گئے۔ پال نے چائے اور میں نے اپنے لیے کوک

☆ جارڈر، ۱۹۸۴ء، 'طوائفیت: تاریخی اور جدید تناظر میں'، نئی دہلی: انٹر انڈیا پبلیکیشنز۔

منگوائی۔ ایسا لگا جیسے لیلیٰ نے چپکے سے میرے کان میں کہا ہو... ''کوک؟ وہ تو پینڈو پیتے ہیں۔'' کوک پیتے ہوئے ہمیشہ مجھے لیلیٰ کا یہ تبصرہ یاد آ جاتا ہے۔

''پال! اب مجھے مغلوں کے بارے میں بتایئے۔'' میں نے درخواست کی۔

''اچھا؟'' پال نے میری ہنسی اڑائی۔ ''ڈھائی سو برس تک نصف جنوبی ایشیا پر انہوں نے حکومت کی تھی۔ آپ کی فرمائش ہے کہ میں آپ کو چائے کی پیالی پر ان کے بارے میں سب کچھ بتا دوں!''

پھر وہ دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ انہوں نے بالآخر کہا:

''سچ تو یہ ہے کہ میں نے مغلوں کو صرف فنونِ لطیفہ کے بے مثال سرپرستوں کے روپ میں ہی دیکھا ہے۔ رقص... موسیقی... ان کی ادائیگی... ظاہر ہے طوائفیں کرتی تھیں۔ ادھر میرا دھیان گیا ہی نہیں تھا۔ یوں بھی، وہ معاشرہ آج کے معاشرے سے بالکل مختلف ہوگا۔ جن کو آج ہم ''طوائفیں'' کہتے ہیں... وہ کچھ اور سمجھی جاتی ہوں گی۔ ویسے... عزت، دولت اور شہرت سے قطع نظر،... یہ بات خیر تسلیم شدہ تھی کہ وہ دربار کو اپنی جنسی خدمات بھی پیش کریں گی۔''

''اور یہ مغل بادشاہ!'' میں نے کہا، ''جی، حرم بھی رکھتے تھے۔ ان میں سینکڑوں کنیزیں ہوتی تھیں۔ شاہی خاندان کا کوئی بھی فرد ان کا جسم استعمال کر سکتا تھا۔''

پال نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ ''ہاں... مگر میں نے ہمیشہ اسے ثقافتی پہلو سے دیکھا۔''

میں چند لمحے خاموش رہی۔ پھر میں نے کہا: ''مگر پال...! میں ایک عورت ہوں۔ کسی بھی نام نہاد تمدنی، تہذیبی، ثقافتی پہلو میں، عورتوں کا جو جسمانی استعمال ہوا، اسے کیسے فراموش کر سکتی ہوں؟ دیگر یہ کہ میں طاقت کا کھیل بھی سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ یہ سب حقائق میری نظر میں ہیں۔'' میں نے مضبوطی سے کہا: ''اور یہ وضاحت بھی کر دوں کہ میری نظر میں اس استعمال کے باعث مغلوں کی فنونِ لطیفہ سے دلچسپی اور ان کی سرپرستی بے وقعت نہیں ہو جاتی۔ اونچے اونچے درجے کی طوائفوں نے بھی موسیقی اور شعر و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں گہرائی میں جا کر بھی دیکھنا پڑے گا۔'' میں نے انہیں سمجھایا۔ ''جب مصر میں، میں نے اہرامِ مصر دیکھے تو وہ اس قدر شاندار تھے کہ میں انگشت بدنداں رہ گئی۔ لیکن مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ ان کی تعمیر کرتے ہوئے ہزاروں غلام موت کے گھاٹ اتر گئے تھے۔ عظیم الشان محلات دیکھتے ہوئے بھی مجھے یہی خیال آتا ہے کیونکہ میں عورت ہوں پال۔ اور ایک عورت محکومی اور مغلوبیت کی کیفیت خوب اچھی طرح سمجھتی ہے۔''

پال بہت غور سے میری بات سن رہے تھے۔ میں نے کہا: ''ان کتابوں کو کھنگالتے ہوئے

مجھے بہت سی باتوں کا علم ہوا ہے۔ مغل بادشاہ طوائفوں کے کاروبار کی نگہبانی اور انتظام کرتے تھے۔ شہنشاہ اکبر نے اپنے دورِ حکومت میں دو تین سرکاری افسران بطورِ خاص اسی کام کے لیے مقرر کیے ہوئے تھے۔ اکبر کے دور میں صرف شہر لاہور میں ہی طوائفوں کے چھ ہزار گھر موجود تھے۔ یہ ان سترہ برسوں کی بات ہے جب وہ لاہور میں دربار کیا کرتا تھا۔''

پال نے خوش ہو کر کہا۔ ''شاباش! تحقیق تو تم نے گہرائی میں جا کر کی ہے۔ مگر یہ سب تو ایک روایت کا حصہ تھا۔''

''لیکن یہ روایت کسی کے حکم سے چلتی تھی؟'' میں نے تڑخ کر کہا۔ ''مذہبی ہو یا سماجی۔ روایت حکمران طبقہ نافذ کرتا تھا۔'' پھر میں نے کہا: ''بادشاہوں کے اہم مقاصد میں دفاع اور نئی سرزمینوں کی فتح شامل تھے۔ طوائفیں افواج کے ساتھ ساتھ رہتی تھیں تاکہ ان کو تفریح کا سامان فراہم کر سکیں۔ ان کے لیے علیٰحدہ خیمے نصب کیے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ سلطنت کے اختتام تک جاری تھا۔ ساتھ ہی کئی نئی سیاسی قوتیں بھی منظرِ عام پر آ رہی تھیں۔''

''مثلاً؟'' پال نے پوچھا۔

''تاریخی دستاویزات شاہد ہیں کہ پرتگالی، فرانسیسی اور انگریز تاجروں کے آنے پر یہ پیشہ خوب پھلا پھولا۔ ان کے مراکز بمبئی، کلکتہ، کوچین اور مدراس تھے۔ تاریخ دان کپور کے مطابق، سترھویں صدی عیسوی میں غیر ملکی تاجر طوائفوں کے سب سے بڑے خریدار تھے۔ ان بندرگاہوں سے وسعت پا کر یہ بازار دوسرے بڑے شہروں تک جا پہنچے۔ اسی طرح مالی منفعت نے رفتہ رفتہ روایت پر سبقت حاصل کر لی۔ ساتھ ہی عورتوں سے جبری جسم فروشی بھی کروائی جانے لگی۔''

''ہاں!'' پال نے کہا: ''یہ لوگ غیر ملکی طوائفیں بھی درآمد کرتے تھے۔''

میں نے کہا: ''۷۱-۱۸۷۰ء کے برطانوی بجٹ میں، چالیس ہزار پونڈ ایسی دو ہزار سات سو طوائفوں کی مد میں مختص کیے گئے جو برطانوی افواج کی دل بستگی کا سامان کر سکیں۔''

پال نے مسکرا کر کہا: ''کلکتہ کی رقاصائیں، موسیقار اور سازندے۔ سب مسلمان تھے۔ مقامی اشرافیہ کے علاوہ برطانوی بھی ان سے مسحور رہتے تھے۔ ان کو مصوروں نے اپنی تصاویر کے بے لباس ماڈل کے طور پر بھی پیش کیا تھا۔ انگریز انہیں 'ناچ گرلز' (nautch girls) کہتے تھے۔''

میں نے کہا: ''سینہ بہ سینہ روایت یہ ہے کہ لاہور کا انارکلی بازار برطانوی فوجوں کے باعث وجود میں آیا۔ وہ شہر سے باہر چھاؤنیاں قائم کرتے تھے۔ لاہور میں پرانے شہر سے کچھ دور انہوں نے ایسی ہی چھاؤنی بنائی تھی۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے رفتہ رفتہ ایک پورا بازار بن گیا۔

جلد ہی سپاہیوں کی کشش طوائفوں کو بھی یہاں لے آئی۔ دکانوں کی بالائی منزلوں پر انہوں نے اپنے اڈے جما لیے۔''

''اس بازار کا نام انارکلی کیوں ہے؟''

''کہتے ہیں کہ برٹش آرمی کی چھاؤنی انارکلی کے مزار کے پاس قائم ہوئی تھی۔ انارکلی ایک کنیز تھی جس کی مغل بادشاہ جہانگیر کے ساتھ عشق کی داستان بہت مشہور ہے۔'' میں نے کہا۔

''اوہ!'' پال نے کہا۔''اب کبھی ادھر سے گزر ہوا تو میں انارکلی کو سلام کرنے ضرور جاؤں گا۔''

میں مسکرانے لگی۔ پھر میں نے کہا:'' دیکھیے! میرا مؤقف یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی ایک طرف تو طوائفوں کے گاہک تھے تو دوسری طرف وہ اسی پیشے کی نوک پلک سنوارنے کے لیے طرح طرح کے قوانین وضع کر رہے تھے۔ گویا اس کاروبار کی حدود مقرر کر رہے تھے۔ انہوں نے تمام طوائفوں کا پولیس کمشنر کے دفتر میں اندراج کروایا۔ قوانین کے تحت سولہ برس سے کم عمر لڑکی یا حاملہ عورت یا شادی شدہ عورت جس کی باضابطہ طلاق نہ ہوئی ہو، اپنا اندراج نہیں کروا سکتی تھی۔ اگر لڑکی کنواری ہو تب کبھی کبھی اس کے سرپرستوں کو تنبیہ کی جاتی تھی کہ اتنی کم عمری میں اس سے پیشہ نہ کرائیں۔ اس دور میں طوائفوں کے طبّی معائنے کروائے گئے۔ ان کے طبی معائنوں کی تاریخیں ریکارڈ میں درج ہوتی تھیں۔ کلکتہ کی ۱۹۲۱ء کی مردم شماری میں دس ہزار آٹھ سو چودہ عورتوں کا پیشہ ''طوائف'' درج ہے۔ یہ برسرِ روزگار عورتوں کا دوسرا بڑا گروپ تھا۔ بیس ہزار نو سو ننانوے عورتیں گھروں میں نوکرانیاں تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ برٹش راج نے طوائف کا پیشہ ختم کرنے کے کوئی اقدامات بالکل نہیں کیے۔ اس کے برعکس ان کی انتظامیہ نے اس پیشے کو قانونی بنایا اور اسے معاشرے کے تسلیم شدہ حصے کی حیثیت دی۔''

پال میری بات پر غور کر رہے تھے۔ پھر ہم دونوں لائبریری چلے گئے۔ پال اپنے موضوعات کی کتابوں میں کھو گئے اور میں اپنے موضوع کے ایک اہم حصے پر تحقیق میں مصروف ہو گئی جس پر میں ایک لیکچر دینے والی تھی۔ یہ موضوع نازک تھا، یعنی مذہبی اداروں نے اس پیشے کو قائم کرنے یا رکھنے میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

دوسرے دن جب میں پال سے ملی تو میری تحقیق کا حاصل میرے پاس تھا جو میں نے فوراً پیش کیا۔ میں نے پال سے کہا:''میری تحقیق کے مطابق، قبرص میں سینیرا س نامی بادشاہ نے جسم فروشی کو ایک مقدس رسم میں تبدیل کیا۔ اس مملکت کے باسی اپنی بیٹیوں کو جہیز کی رقم کمانے کے لیے جسم فروشی کی خاطر ملک سے باہر بھیجتے تھے۔ اس رقم سے وہ دیوی وینس پر بھینٹ بھی چڑھاتے تھے تاکہ وہ

مستقبل میں ان کی مددگار ثابت ہو سکے۔ میسو پوٹامیا کی سومیری تہذیب میں ہر مندر میں عورتیں مشقت کے کام اور پروہت کی جنسی تسکین کے لیے موجود ہوتی تھیں۔ مفتوح اقوام کی عورتیں عبادت گاہوں سے اسی مقصد کے لیے منسلک کر دی جاتی تھیں۔ دنیا کی کئی تہذیبوں میں یہ رواج عام تھا۔"

"رومیوں نے ایک طرف تو طوائفوں سے ٹیکس وصول کیے، دوسری جانب انہیں سماجی طور پر مطعون کیا۔ انہوں نے سخت احکامات جاری کیے کہ طوائفوں سے شادی نہ کی جائے لیکن چند صدیوں بعد طوائفوں کی معاشرتی حیثیت بحال کر دی گئی۔ ہرنیق کی یادداشتوں میں درج ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں رومی شہنشاہ جسٹینین نے خود ایک طوائف سے شادی کی۔ اس نے طوائفوں کی معاشرتی بحالی کی کوشش بھی کی۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں ایک طرف تو طوائفوں کو سزائیں دی جاتی تھیں اور دوسری طرف ان کو ایک "ضروری برائی" سمجھ کر سرکاری خرچ پر رکھا جاتا تھا۔ طوائفوں کو ایک مخصوص لباس پہننا پڑتا تھا اور ان کی رہائش کے لیے بھی چند علاقے مخصوص کر دیے گئے تھے۔ ان سے ملنے والے محصولات حکومتِ وقت اور چرچ کے اربابِ حل و عقد آپس میں مساوی تقسیم کر لیتے تھے۔" میں نے کہا: "اور اب کچھ دیوداسیوں کے بارے میں..."

"میں تو صرف ان کی موسیقی کے بارے میں جانتا ہوں..." پال نے کہا۔ "وہ بھجن بہت اعلیٰ پائے کے گاتی تھیں۔ امراء کے گھروں میں انہیں پوجا کے لیے بلایا جاتا تھا۔ یہ رواج برصغیر میں تیسری صدی عیسوی میں قائم ہوا تھا۔"

"جی ہاں! میں نے کہا۔ "لیکن رواج یہ بھی تھا کہ نچلی ذات کی کسی لڑکی کو خرید کر 'مکتی' حاصل کرنے کے لیے مندر کو دے دیا جاتا تھا۔ جنوبی ہندوستان میں ان نوجوان لڑکیوں کو 'دیوداسی' اور شمال میں 'منگل مکھی، دیوار تیال یا کودی کھار' کہا جاتا تھا۔ مندر کی صفائی کرنا، دیوی دیوتاؤں کو پنکھا جھلنا اور پوجا کرنے والوں کے لیے دیوتاؤں کے سامنے رقص کرنا ان کے فرائض تھے۔ مندر کے لیے وقف کی جانے والی جائیداد ان کے نام بھی لکھی جاتی تھی اور مندر کی آمدنی میں بھی ان کا حصہ ہوتا تھا۔ اس بارے میں جو تاریخی مواد موجود ہے اس سے اشارہ ملتا ہے کہ ان لڑکیوں کے جسمانی استحصال کا آغاز چوری چھپے کیا گیا تھا لیکن جلد ہی یہ راز نہ رہا اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہیں 'مقدس طوائفیں' کہا جانے لگا۔" میں نے مزید معلومات فراہم کیں۔ "چھٹی سے تیرھویں عیسوی صدی تک پلّو اور چولہ حکمرانوں کے دور میں، جنوبی ہند میں دیوداسیوں کے رواج نے انتہائے عروج کا زمانہ دیکھا۔ کئی مورخین متفق ہیں کہ نویں اور دسویں عیسوی صدی میں یہ رواج سب سے زیادہ پھلا پھولا اور اسی زمانے میں بہت سارے مندر بھی بنائے گئے۔ بیسویں صدی کے اوائل

میں اس رواج پر حکومتِ وقت نے پابندی لگا دی، لیکن اس کے باوجود، یہ کئی جگہ جاری رہا۔"

پال نے سوال کیا: "کیا مسلمان مذہبی شخصیتوں کی، اس پیشے کی سرپرستی کے بھی کچھ ثبوت ملے؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ان دستاویزات سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ صوفیوں یا علماء نے طوائفوں کو ملازم رکھنے یا ان کی آمدنی کا انتظام و انصرام کرنے میں کبھی کوئی کردار ادا کیا۔"

پال نے انگڑائی لی اور کہا: "ویسے دیوداسیوں کا سماجی رتبہ خاصا پیچیدہ تھا۔ وہ نیچی ذات کی سمجھی جاتی تھیں۔ اس کے باوجود سماج میں ان کی عزت بھی تھی اور ایک مقام بھی تھا۔ ان کی شادی دیوتاؤں سے ہوتی تھی جو لافانی ہوتے ہیں اس لیے وہ کبھی بیوہ نہیں ہوسکتی تھیں۔ اسی لیے عوام الناس سمجھتے تھے کہ دیوداسیاں خوش بختی اور خوشحالی کا شگون ہوتی ہیں۔"

میں نے کہا: "اگلے وقتوں میں ایک طرح طوائفوں کا بھی سماجی رتبہ تھا۔ میرا موقف یہ ہے کہ جس طرح طوائفیں حکمران طبقوں کے مفادات پورے کرتی تھیں، اسی طرح دیوداسیاں مندر کے مفادات کی تکمیل کرتی تھیں۔"

پال نے ایک لمبی سانس بھر کر کہا: "بات تو سمجھ میں آتی ہے! لیکن... اس تاریخی عمل کو تم آج کی صورتِ حال سے کس طرح جوڑو گی؟"

"یہ ہوا کام کا سوال!" میں نے خوش ہوکر کہا۔ "یہ رشتہ جو صدیوں سے قائم تھا، آج بھی موجود ہے۔ ذرا موجودہ حکمران طبقے پر تو نظر ڈالیے!"

پال نے غور کرتے ہوئے کہا: "بھئی، حکمران طبقہ پاکستان میں... سیاستدانوں، بزنس کی بڑی شخصیات، فوج اور نوکر شاہی پر مشتمل ہے۔ مذہبی رہنما اور شخصیتیں غالباً براہ راست اس کا حصہ نہیں ہیں۔"

"ہاں! لیکن آج کی صورتِ حال اس تاریخی عمل کا نتیجہ ہے۔ ہم اسے اسی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اس صورت حال پر مکمل قابو کسی کا نہیں ہے۔ ایک چھوٹے سے طاقتور طبقے کی تفریح کے لیے ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اس ادارے کو استحکام دینے والی روایتیں اپنی موت مرچکی ہیں۔ پاکستانی معاشرہ سرعت سے بڑی بنیادی تبدیلیوں سے گزر رہا ہے۔ حکمران طبقے کی زیادہ تر اقدار حالتِ تشکیل میں ہیں۔ جسم فروشی کی طرف معاشرے کا رویہ اس پوری بدلتی ہوئی فکر کا صرف چھوٹا سا جزو ہے۔" میری بات جاری تھی۔

"کنجر اور میراثی برادری کو پولیس ہراساں کرتی ہے لیکن پولیس معاشرے کے تمام کمزور طبقوں کو ہراساں کرتی ہی رہتی ہے۔ فرق ہے تو بس اتنا کہ شاہی محلے میں یہ عمل روزانہ ہوتا ہے۔ شاہی محلے کا پیچیدہ عمرانی نظام آج شکست و ریخت کا شکار ہے۔ پولیس اور حکومت کی سختی سے شہر میں

جسم فروشی میں کمی نہیں آ رہی، صرف پرانی روایتوں کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ ہم جیسے عام شہری یہ منظر دیکھ کر صرف اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اشرافیہ جن رواجوں کو جنم دیتا ہے انہیں نیست و نابود بھی کر دیتا ہے۔ یہ پیشہ شاہی محلے سے نکل کر اب کئی دوسری بستیوں میں پھیل گیا ہے۔ اس نے نائیکہ اور رقص و موسیقی کا خاتمہ کر کے ''کوٹھی خانوں'' کے رواج کی بنیاد ڈال دی ہے جو کسی تکلف یا فنون لطیفہ کے اضافے کے بغیر محض جسم فروشی کا کاروبار ہے۔ حکومتوں اور حاکموں کے فیصلے ہمیشہ دانشمندانہ نہیں ہوتے۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے بھی فنونِ لطیفہ کو ایک گہرا گڑھا کھود کر دفن کر دینے کا حکم دیا تھا۔ اس سے موسیقی کا خاتمہ نہیں ہوا۔ یہ عوامی قوتوں کا مثبت اظہار تھا۔ لیکن شاہی محلے کے باسیوں کو ہراساں کرنے، ان کو نابود کرنے کی کوششوں کے نتائج پورے معاشرے کے لیے منفی ثابت ہو سکتے ہیں۔''

باب ۳۳

چندا اور فائزہ سے دل کی باتیں

میری تحقیق اب اپنے اختتام تک پہنچ رہی تھی لیکن میں اب بھی معاشرے کی واضح منافقت اور دہرا معیار سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ پال پاکستان سے جا چکے تھے۔ مجھے کسی ایسی ہستی کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو میری باتیں سُن سکے۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ ''اصلاح'' کا زور وشور سے اعلان کرنے والے خود ہی یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ طوائفوں کی اصلاح ناممکن ہے۔ تحقیق کے دوران میرے مطالعہ نے یہ ثابت کیا تھا کہ اس پیشے کے باقاعدہ کاروبار سے طبقۂ اشرافیہ کا مضبوط رشتہ ہمیشہ رہا ہے (اور اس میں حکمران، فوجی سالار، مذہبی رہنما اور مقتدر سیاسی شخصیات سب ہی شامل ہیں)۔ ان طبقات نے اس کاروبار کی اعانت بھی کی ہے، اسے تحفظ بھی دیا ہے، اس کے لیے قواعد وضوابط تشکیل دیے ہیں اور وقتاً فوقتاً اس میں اصلاحات بھی جاری کی ہیں۔ یہاں تک تو بات صاف تھی۔ مگر اس پیشے کے ساتھ جو ''کلنک'' کا تصور وابستہ کر دیا گیا تھا، میں اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔

آخر ایک دن میں نے چندا کے گھر جانے کی ٹھانی تاکہ اپنے دل میں اُٹھنے والے سوالوں پر اس سے گفتگو کر کے دل کی بھڑاس نکال سکوں۔ میری رشتے کی چھوٹی بہن فائزہ نے اصرار کیا کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے گی۔ محلّے میں تحقیق کے دوران میں فائزہ سے اکثر اپنی الجھنیں سلجھانے کے لیے گفتگو کرتی رہی تھی، میں اسے ساتھ لے جانے پر فوراً رضامند ہو گئی۔ پہلے ہم اس کے کالج گئے جہاں اسے ایک دو کام کرنے تھے۔ اس کے بعد گیارہ بجے کے قریب ہم شاہی محلّے کے لیے روانہ ہو

گئے۔ راستے میں، میں نے فائزہ سے کہا: ''میرے گرو نے مجھے ایک بات بتائی ہے''۔
فائزہ حیران ہوگئی۔ اس نے کہا: ''آپ کے گرو بھی ہیں؟''
میں نے کہا: ''ایک نہیں میرے تو کئی گرو ہیں۔ ہاں.... میرے گرو نے کہا تھا کہ کسی مسئلے کا حل ٹھیک طرح سے نظر نہ آئے تو مجھے آنکھیں چندھیا کر دیکھنا چاہیے۔ اس طرح جب بصارت کے سب آثار دھندلا جائیں گے تب جو شے اہم ہے وہ واضح ہو کر ابھر آئے گی...''
فائزہ کچھ نہ سمجھی، میں نے مسکرا کر کہا: ''جب ہم اپنی نگاہ کسی شے پر مرکوز کر دیتے ہیں تو اس کا سیاق و سباق ہماری نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ہم اس کا مطلب سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن جب ہماری نظر اتنی مرکوز نہ ہو تو ہمیں اس شے کا گرد و پیش کے ساتھ رشتہ اور رابطہ نظر آنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی منظر کے ایک جزو کی جگہ پورا منظر دیکھنا زیادہ اہم ہوتا ہے۔''
جب ہم چندا کے گھر پہنچے تو خوش قسمتی سے اس کی ماں داتا دربار گئی ہوئی تھی۔ چندا ابھی پوری طرح جاگی بھی نہیں تھی۔ ہم وہیں اس کے بستر کے پاس فرش پر بیٹھ گئیں۔ میں نے چندا سے کہا، ''میں تمہارے کاروبار کی وجوہات کے بارے میں تم سے سنجیدگی سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔''
چندا نے اداسی سے ہنس کر کہا: ''میں کیا گفتگو کروں گی۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ انجانی قوتوں نے میرے لیے یہ راستہ منتخب کیا اور میں بلا چون و چرا اس پر چلتے رہنے پر مجبور ہوں۔ خدا گواہ ہے! اس میں ہمارا اپنا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ مجھے یہی بتایا گیا کہ اچھی بیٹیاں اپنی ماں کو خوش رکھتی ہیں اور یہی کرنے کی میں کوشش کرتی ہوں مگر اس راستے کو میں نے خود نہیں چُنا۔''
میں نے کہا: ''چندا، تمہیں معلوم بھی ہے ابھی ابھی تم نے کتنے پتے کی بات کہی ہے۔'' چندا کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی۔ اس نے بستر کی چادر ٹھیک کر کے فائزہ کو زیادہ آرام سے بستر پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں نے بات شروع کی: ''میں اس مسئلے پر کافی غور کرتی رہی ہوں، اس پر دوسروں نے جو کچھ لکھا، وہ سب بھی میں نے پڑھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ان سب باتوں کا تعلق پدرسری نظام سے ہے۔'' ''وہ کیا ہے؟''، چندا نے حیرت سے پوچھا۔
فائزہ نے کہا: ''یہ سماج کا ایسا نظام ہے جس کا واحد مرکز مرد ہوتے ہیں، ٹھیک ہے نا باجی؟''
''ہاں''، میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''پدرسری نظام اس تصور پر مبنی ہے کہ نسل مرد کی ہی ہوتی ہے اور سماج کی ہر تنظیم مثلاً گھر، کنبہ، خاندان، محلّہ، گاؤں، قبیلہ یا ملک کا سربراہ مرد ہی ہوتا ہے۔ اس پورے نظام کی بنیاد اس سوچ پر ہے کہ مرد کو اپنے نطفے اور نام کے تسلسل کو برقرار رکھنا ہے۔ مرد نے یہی بات یقینی بنانے کے لیے ہر نظام وضع کیا ہے''۔

چندا نے سوچتے ہوئے کہا: ''تو مردوں نے یہ نظام اپنے فائدے کے لیے ہی بنایا ہے؟''
میں نے جھجکتے ہوئے کہا: ''ایسا نہیں ہوا تھا کہ کچھ مردوں نے جان بوجھ کر یہ نظام بنایا تھا اور جان بوجھ کر عورتوں کو اس سے باہر رکھا تھا۔ مگر اس کا ارتقا مقتدر مردوں کے زیر اثر ہی ہوا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر مرد کو اس سے فائدہ پہنچے۔ ہاں اس کا فائدہ صاحبِ اختیار اور سربرآوردہ مردوں کو ضرور پہنچتا ہے۔''

فائزہ بہت غور سے میری بات سن رہی تھی۔ اس نے کہا: ''اگر اس روشنی میں ہم جسم فروشی کے پیشے کا تجزیہ کریں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس خاص کاروبار سے فائدہ کن لوگوں کو ہوتا ہے؟'' پھر اس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا: ''اس کا فائدہ بھی معاشرے کے بااثر اور طاقتور مردوں کو ہی ہوتا ہے۔ کیوں باجی ٹھیک ہے؟''

''شاباش فائزہ!'' میں نے کہا، ''تم نے صحیح نتیجہ نکالا!''

چندا نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا: ''وہ تم نے نطفے کے بارے میں کیا کہا تھا... ذرا پھر سے بتانا۔''

''پدرسری نظام میں نسل مرد سے چلتی ہے''، میں نے بتانا شروع کیا۔ ''اولاد مرد کی ملکیت ہوتی ہے۔ وہ مرد کا نام، اس کا مذہب، اس کی جائیداد، غرضیکہ سب کچھ مرد سے ہی ورثے میں حاصل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کو مرد کے گھر لے جایا جاتا ہے۔ مرد کو عورت کے گھر منتقل نہیں کیا جاتا۔ عورت کے ساتھ خاوند کا نام جڑ جاتا ہے اور اولاد کو بھی باپ کا نام ہی ملتا ہے۔''

پھر میرے ذہن میں بچپن کی ایک بھولی بسری یاد اس طرح روشن ہوگئی کہ میں نے بے ساختہ کہا:
''ایک بار میرے ابا کو دادا جان (مرحوم) کے کاغذات میں خاندانی شجرہ ملا تھا۔ انہوں نے سب بچوں کو وہ شجرہ دکھایا تھا۔ وہ ہمارے خاندان کا شجرہ تھا... اس کا تنا کہاں سے پھوٹا؟ اس کی شاخوں کے ثمر کیا ہیں؟ میں نے بہت اشتیاق سے پوچھا تھا۔ اس میں میں کہاں ہوں؟ جانتی ہو، اس میں میرا نام کہیں نہیں تھا، صرف میرے بھائی کا نام تھا۔ پورے شجرے میں خاندان کی کسی بھی عورت کا نام نہیں تھا۔ صرف مردوں کے نام تھے اور ان کی نرینہ اولادوں کے نام...'' چندا اور فائزہ مبہوت ہو کر میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں اپنی رو میں کہہ رہی تھی۔ ''ہاں... صرف مردوں کے نام! خاندان مردوں کا، صرف مردوں کا سمجھا جاتا ہے۔''

فائزہ نے کہا: ''لیکن مغرب میں تو اب شجرے میں عورتوں کے نام شامل کیے جاتے ہیں۔''
''ہاں!'' میں نے کہا ''لیکن درحقیقت مغرب میں شجرہ اب بھی مرد کی نسل سے ہی چلتا ہے۔

آج بھی مغرب کی زیادہ تر عورتیں شادی کے بعد اپنا خاندانی نام بدل کر شوہر کا نام اختیار کر لیتی ہیں۔''

پھر میں نے ہنس کر کہا: ''وہاں طلاق عام ہوگئی ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ وہ ہر نئی شادی پر اپنا نام بدلتی رہتی ہیں۔ عورت کے ساتھ شوہر کا نام لگانے کا طریقہ ہم نے انگریزوں سے ہی سیکھا ہے۔''

فائزہ نے ہوا میں تکتے ہوئے کہا: ''اس کا مجھے تھوڑا سا احساس تو تھا، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ بس ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا ہے، اس پر سوال نہیں اٹھاتے۔''

چندا نے کہا: ''لیکن... ہمارے محلے میں عورتیں زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ بیٹی پیدا ہونے پر خوشی منائی جاتی ہے۔''

''ہاں چندا!'' میں نے کہا: ''اس محلے کا نظام ہمارے برصغیر کے مخصوص کلچر کی ایک زیریں شاخ ہے۔ ہم اس کی کھوج بھی لگائیں گے کہ یہ کیوں مختلف ہے؟ اور یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ کیا واقعی یہ مختلف ہے یا صرف بظاہر مختلف ہے؟...''

''مرد اپنا نطفہ نئی نسل کو منتقل کرنے کے لیے شادی کرتے ہیں۔'' میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''دھوم دھام سے معاشرے میں اعلان کیا جاتا ہے کہ فلاں عورت اپنے باپ کے خاندان سے جدا کر کے شوہر کے خاندان میں داخل کی گئی ہے۔ ایک مرد نے اب اسے اپنا خاندان بڑھانے کے لیے قبول کر لیا ہے۔''

فائزہ نے اضافہ کیا: ''بالکل یہی بات ہے۔ اسی لیے تو شادی کے وقت دلہن والے روتے ہیں کیونکہ ان کی بیٹی ان سے لے لی جاتی ہے اور دولہا والے خوشی مناتے ہیں کیونکہ دلہن ان کے خاندان میں شامل ہو جاتی ہے۔''

میں نے کہا: ''درست! اگر ہم بغیر تکلف کے دیکھیں تو اس نظام میں عورت بس ایک ''کوکھ'' ہے۔ مرد یہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ عورت کی کوکھ میں صرف اس کا ہی نطفہ جائے۔ تو اس کے لیے وہ کیا کرے؟''

فائزہ نے کہا: ''وہ اس کے لیے ''اخلاقیات'' کے جال بُننا شروع کر دیتا ہے۔ وہ عورت کو صرف اپنے لیے مخصوص رکھنا چاہتا ہے اور اسے ''عصمت'' کا نام دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ عورت چار دیواری کے اندر رہے، زیادہ باہر نہ جائے، زیادہ بات نہ کرے، زیادہ سفر نہ کرے، زیادہ دنیا نہ دیکھے۔ وہ بالکل نہیں چاہتا کہ عورت زیادہ ہوشیار ہو جائے، زیادہ پڑھ لکھ لے، زیادہ سمجھدار ہو جائے....''

فائزہ اپنے خیالوں میں ڈوب کر نیم دراز ہوگئی تھی۔ پھر وہ چونک کر سیدھی بیٹھ گئی اور کہنے لگی: ''باجی، عورتوں کی فرمانبرداری اسی لیے رشتہ دیکھتے ہوئے بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ مرد ایسی عورتیں

چاہتے ہیں جن کو وہ اپنے قابو میں رکھ سکیں۔'' ''باجی!'' اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میرے رشتے کے لیے مجھے دیکھنے جب بھی کوئی خاندان آتا ہے تو امّی مجھے ہدایت کرتی ہیں کہ جب تک مجھ سے کوئی سوال نہ کیا جائے، میں اپنی زبان نہ کھولوں، بالکل خاموش رہوں۔ خود سے کوئی بات شروع نہ کروں...''

چندا نے کہا: ''یہ تو میں نے بھی سنا ہے کہ جب پاکستانی مرد ولایت جاتے ہیں تو وہاں کی عورتوں کے ساتھ خوب رنگ رلیاں مناتے ہیں مگر شادی کے لیے اپنی اماں کے پاس دوڑے جاتے ہیں جو ان کے لیے، ان سے آدھی عمر کی ایسی معصوم بے زبان گائے لے آتی ہے جس نے زندگی بھر مرد کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔'' یہ کہہ کر چندا ہنس پڑی۔

میں نے کہا: ''جب میں امریکا میں پڑھ رہی تھی تو یہ تماشا میں نے خود کئی بار دیکھا تھا۔''

فائزہ نے کہا: ''چال چلن بھی صرف عورت کا ہوتا ہے۔ مردوں کے لیے ایسی کوئی قید نہیں۔ مرد عورتوں کے چال چلن ٹھیک رکھنے کے ٹھیکیدار بنے رہتے ہیں مگر ان کا چال چلن درست رکھنے کا اختیار عورتوں کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہماری نام نہاد اخلاقیات کا مقصد ہی صرف عورتوں کے ہر عمل کو مردوں کی مرضی کے تابع کرنا ہوتا ہے۔ مرد عورتوں کی بیباکی سے ڈرتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ ایسی عورت ان کی بیوی بن کر دوسرے مردوں سے تعلقات پیدا کرے گی اور ان کے لیے 'ناپاک' ہو جائے گی۔'' پھر فائزہ نے کہا: ''مرد نے عورت کو قابو میں رکھنے کے لیے 'اخلاقیات' بنائیں اور مذہب کو بھی اسی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ بیشتر معاشروں میں مذہب کے نام پر ان اخلاقی احکامات پر زور دیا جاتا ہے جو صرف عورتوں پر صادر ہوتے ہیں کہ وہ اپنے جسم کو کیسے ڈھانپیں اور کس طرح حیا کا مظاہرہ کریں اور عام زندگی میں انکا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔ مرد کے اخلاق اور حیا کو درست رکھنے کے تمام احکامات یکسر فراموش کر دیے جاتے ہیں۔''

چندا نے ہنس کر کہا: ''مجھے تو ان مولویوں پر بڑا ترس آتا ہے۔ انہاں دا اسلام عورتاں تے ای مکدا اے (ان کا اسلام عورتوں پر ہی ختم ہوتا ہے)۔ یہ بس عورتوں پر ہی پابندیاں لگاتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ مردوں کے اخلاق کے بارے میں تو کبھی اخباروں کو کوئی بیان نہیں دیتے جبکہ ہمارے سارے گاہک مرد ہی تو ہوتے ہیں۔ ان مولویوں کو خوب پتا ہے مگر ان کے بارے میں کبھی ایک لفظ نہیں کہتے۔ دوسری طرف اگر کوئی لڑکی خاندان کی مرضی کے بغیر شادی بھی کرنے لگے، جو اس کا قانونی اور مذہبی حق ہے، تو یہ مولوی صاحبان اسے گالیاں دیتے ہیں بلکہ اسے کافر قرار دیتے ہیں۔''

چندا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''عورت کا جسم تو چھپانے کی چیز ہے، مگر عورت کو گھورنے اور نظر بازی کرنے والے کو کسی نے کب سزا دی ہے؟ عورتوں کے لیے ہی سارے

احکامات..... بال چھپاؤ، ہاتھ ڈھانپو، کالا لبادہ اوڑھے رکھو...'' وہ قہقہہ لگا کر ہنسی، پھر بولی: ''سچ کہوں فوزیہ! طوائف ہو کر کہہ رہی ہوں میرا تو یہ خیال ہے کہ ان لوگوں کے سر پر عورت بہت ہی سوار رہتی ہے۔''

میں نے مسکرا کر کہا، ''اخلاقیات تو عورتوں کو قابو میں رکھنے کا جال ہے۔ وہ خود اپنے لیے یہ جال کیوں بنائیں گے۔'' میں نے چندا کو مخاطب کر کے کہا: ''اگر مرد شاہی محلّے میں آتے ہیں اور ''گناہ'' کرتے ہیں تو یہ تمہارا قصور ہے۔ ان پر کوئی اخلاقی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ معاشرے کی ہر برائی کی ذمہ داری عورت ہی کو دی گئی ہے۔ اس لیے اگر بس اسٹاپ پر مرد کسی عورت کو چھیڑے تو عورت کو کہا جاتا ہے کہ وہ گھر بیٹھ جائے، جیسے قصور اس کا ہی تھا۔ آخر وہ گھر سے نکلی ہی کیوں؟ چھیڑنے والے مرد کو کوئی قصوروار نہیں سمجھتا۔''

فائزہ نے کہا: ''اسی لیے اخلاقیات کا دہرا معیار ہے۔ ایک عورت کے لیے اور دوسرا مرد کے لیے۔ میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ میرے بھائی کو اتنی آزادی ہے جبکہ میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر اعتراضات ہوتے ہیں۔ وہ بلند آواز میں ہنس سکتا ہے، جب چاہے گھر سے باہر جا سکتا ہے۔ خدا نے مجھے بھی ٹانگیں دی ہیں، مگر کچھ بازار سے لانا ہو تو باہر وہی جاتا ہے۔ وہ ہر شام جب تک چاہے دوستوں کے ساتھ گزار سکتا ہے۔ لیکن اگر میں کوئی شام گھر سے باہر گزاروں تو وہ ہر ایک کی نظروں میں آجاتی ہے۔'' پھر اس نے کہا: ''ہمارے اپنے گھر میں، اگر میرے بھائی کی کوئی ہم جماعت لڑکی کسی وجہ سے اسے ٹیلی فون کرے تو کوئی پروا نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ مذاق کر لیا جاتا ہے کہ اچھا بھئی! لڑکا اب بڑا ہو گیا... لیکن اگر میرا ہم جماعت کوئی لڑکا مجھے ٹیلی فون کرے تو اس قدر سوالات پوچھے جاتے ہیں کہ میں جواب دیتے دیتے عاجز آجاتی ہوں۔ یہ دہرا معیار کیوں ہے؟ یہ میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ بااثر اور طاقتور مرد اخلاقیات کے تمام ضابطے اپنے مفاد میں بناتے ہیں مگر افسوس تو یہ ہے کہ وہ ہماری معاشرتی قدروں کا ہی ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ خاص طور پر اگر ان پر مذہب کا غلاف بھی چڑھا دیا جائے تب تو ان کے بارے میں سوچ بچار کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔''

چندا نے سوال کیا: ''کیا یہی وجہ ہے کہ مرد تو معاشقے کر سکتے ہیں لیکن عورتوں کو اس کی اجازت نہیں۔ شادی سے پہلے مرد کسی عورت سے جنسی تعلقات قائم کرے، یا شادی کے بعد ایسا کرے تو کوئی اعتراض نہیں کرتا بلکہ وہ دوستوں میں اس کا ذکر بڑے فخر سے کرتا ہے، لیکن اگر اس کی بیوی، بہن یا منگیتر ایسا عمل کرے تو کیا ہوگا؟''

فائزہ نے زور سے کہا: ''اگر وہ عورت اس کی بہن یا بیوی ہو تو وہ اسے جان سے مار دے گا

اور اگر وہ اس کی منگیتر ہو تو وہ اس سے ہرگز شادی نہیں کرے گا۔''

میں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا: ''بالکل درست! کیونکہ ایسی عورت سے تو وہ خوفزدہ رہے گا جس کی جنسی خواہش کو وہ ہمیشہ پوری طرح اپنے قابو میں نہ رکھ سکے۔ اسی لیے عورت کے کنوارپن کو معاشرے میں اس قدر زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ بعض قبائل اور دیہی خاندانوں میں یہ عام رسم ہے کہ شادی کی دوسری صبح لڑکی کی بکارت ختم ہونے کا خون چادر یا رومال پر باقاعدہ سب لوگوں کو دکھایا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں صرف کنواری دلہن سفید عروسی جوڑا پہننے کی حقدار ہوتی تھی۔ اگر وہ کنواری نہ ہو تو اسے کسی دوسرے ہلکے رنگ کا ملبوس پہننا پڑتا تھا۔''

فائزہ نے اشتیاق سے کہا: ''ہاں ہاں!! جب شہزادی ڈیانا کے کنوارپن کا طبی معائنہ ہوا تھا تو ہم سب سوچتے تھے کہ آخر شہزادہ چارلس کا ایسا کوئی معائنہ کیوں نہیں ہوا۔ کم از کم اسے بائبل پر ہاتھ رکھ کر اپنی پاکبازی کی قسم تو کھانی ہی چاہیے تھی۔''

فائزہ نے کہا: ''اور لڑکیوں کو ہمیشہ یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ وہ جنسی تعلقات سے بالکل نابلد ہیں، بلکہ یہ ظاہر کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ جنس کو بالکل پسند نہیں کرتیں۔''

میں نے کہا: ''موجودہ نظام کو برقرار رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ عورت ہر حال میں خاوند کے ساتھ ہی رہے، اس کے لیے مزید ضابطے بنائے گئے ہیں۔''

چندا نے حیرت سے پوچھا: ''وہ کیا ہیں؟''

میں نے کہا: ''کوئی سمجھدار عورت اس ناانصافی اور دہرے معیار کو برداشت نہ کرتی اگر اس پر یہ سماجی دباؤ نہ ہوتا کہ اگر عورت مرد کو چھوڑ دے تو اس کو ہولناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

میں نے کہا: ''مردانہ سماج نے ایک یہ اصول بھی بنایا ہے کہ عورت کو ہر حال میں شوہر کے پاس ہی رہنا چاہیے۔ خواہ وہ اسے مارے پیٹے، اس کی جان لے لے، تب بھی اسے شوہر کے ساتھ ہی رہنا چاہیے۔ ظلم اور ناانصافی سہنے کی خُو کو 'وفا شعاری' کا نام دیا گیا ہے۔ ان اصولوں سے روگردانی کرنے والی عورت 'باغی' سمجھی جاتی ہے اور اسے سماج کے لیے بھاری خطرہ سمجھا جاتا ہے۔ دنیا بھر کی لعنت و ملامت ایسی عورت کا مقسوم ہوتا ہے۔ میں نے سماجی تنظیموں میں کام کیا ہے۔ مجھے ایسی عورتوں سے گفتگو کر کے ہمیشہ حیرت ہوتی تھی جو برسوں سے مار کھا رہی تھیں لیکن شوہروں کو نہیں چھوڑتی تھیں۔ وجہ یہی ہے کہ شوہر کو چھوڑنے پر معاشرے میں ان کا کوئی مقام نہیں رہے گا۔ عورتوں نے خود یہ سب اس طرح تسلیم کر لیا ہے کہ وہ اس پر سوال نہیں اٹھاتیں۔''

فائزہ نے کہا: ''مردوں کے لیے یہ سب کس قدر آسان بنا دیا گیا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ

ان کی بیویاں بلا چون و چرا، سب کچھ برداشت کرتی رہیں گی۔ وہ مردوں اور عورتوں کے ہر عمل کے لیے دوہرے معیار پر بھی اعتراض نہیں کریں گی۔"

میں نے کہا: "ان رسوم و رواج کی سماج میں اتنی گہری جڑیں ہوتی ہیں کہ لوگ بغیر سوچے ان پر عمل کرتے ہیں۔ سماجی رسموں کو وہ فطرت کا یا خدائی قانون سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ معاشرے میں مردوں کی یہی کوشش ہے کہ جو آزادیاں خود انہیں نصیب ہیں ان کی ہوا بھی عورتوں کو نہ لگنے پائے۔ عورت کی جنسیت کے حوالے سے سماج کا جو بھی رویہ ہے، یا اصول ہیں، وہ صرف عورت کی محکومیت قائم رکھنے کے مقصد سے بنائے گئے ہیں۔ ان کی تہہ میں یہی بات ہے۔ اس پر مستزاد یہ..." میں نے بات جاری رکھی۔ "کہ عورت کے جنسی حوالے کو مرد نے اپنی غیرت کا مسئلہ بنا دیا ہے۔ 'غیرت' کا تصور مرد نے تخلیق کیا اور اسے عورت کے جسم سے وابستہ کر دیا! لہٰذا میں اپنے بھائی، اپنے باپ، اپنے شوہر کی 'غیرت' ٹھہری۔ میرا کوئی بھی عمل ان کی 'غیرت' کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ مردوں کی اپنی بدکرداری اور بداعمالی سے ان کی غیرت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن جو کچھ میں کروں، اس سے ان کی غیرت فوراً متاثر ہو جاتی ہے۔"

پھر میں نے مسکرا کر پوچھا: "تم دونوں نے وہ طوطے اور جن والی کہانی تو سنی ہوگی نا؟ ایک تھا جن، اس نے اپنی جان ایک طوطے میں ڈال دی اور طوطے کو کہیں دور پہاڑوں کی کسی کھوہ میں چھپا دیا۔ اب جن کو پوری آزادی تھی کہ وہ جو چاہے کرے، جہاں چاہے جائے۔ اس کو کوئی گزند نہ پہنچا سکتا تھا کیونکہ اس کی جان تو طوطے میں تھی اور طوطا بہت دور پہاڑوں کی کسی کھوہ میں تھا!... بس اسی طرح، عورت وہ طوطا ہے جس میں مرد نے اپنی غیرت بند کر رکھی ہے۔ مرد جو چاہے کرے، خواہ شاہی محلے کے چکر لگائے، زنا بالجبر کرے، غرض کچھ بھی کرے، اس کی عزت اور غیرت برقرار رہتی ہے کیونکہ اسکی عزت تو عورت کے بدن میں ہے، اور عورت کو اس نے چار دیواریوں میں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ ویسے مردوں کو یہ نسخہ خوب سوجھا!... اب کوئی غیر مرد اگر اس کی ماں، بیوی، بہن یا بیٹی کے لیے جنسی خواہش رکھے تو اس کی غیرت اس قدر جوش مارتی ہے کہ وہ اس غیر مرد کا خون بھی کر سکتا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ وہ اپنی رشتہ دار عورت کو بھی قتل کر سکتا ہے جس کے لیے غیر مرد کے دل میں جنسی خواہش پیدا ہوئی ہو۔ خواہ وہ عورت بالکل معصوم اور بے قصور ہو۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

فائزہ نے کہا: "اس قسم کے قتل پاکستانی معاشرے میں عام ہیں۔ سندھ میں اسے کاروکاری اور بلوچستان میں سیاہ کاری کہتے ہیں۔ صوبہ سرحد اور پنجاب میں بھی غیرت کے نام پر اس نوعیت کے قتل ہوتے ہیں۔"

میں نے زور دے کر کہا: ''بعض علاقوں میں بھائی یا باپ ایسی لڑکی کو بھی قتل کر دیتے ہیں جو بے چاری خود زنا بالجبر کا نشانہ بنی ہو۔ اگر ان سے پوچھیں کہ اس کی منطق کیا ہے؟ اسے کس بات کی سزا دی جا رہی ہے؟ اس نے ان مردوں کی بے عزتی کیسے کی ہے جبکہ وہ خود ایک بہیمانہ جرم کا نشانہ بنی ہے، تو وہ اس کا کوئی جواب نہیں دے پائیں گے۔ جذبات کے اندھے طوفان میں انہیں کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ صدیوں سے انہوں نے اس موضوع پر اپنی عقل اور دماغ کا استعمال ہی نہیں کیا ہے۔''

''اگر نتائج اتنے المناک نہ ہوتے تو واقعی یہ بات ہنسی کی ہوتی، لیکن فوزیہ باجی'' فائزہ کہنے لگی، ''ذرا سوچیے، کسی بے کس لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کرنے والے کی عزت ذرا بھی داغدار نہیں ہوتی۔ اس کے خاندان کے وقار میں بھی فرق نہیں آتا۔ لیکن مظلوم خاندان کی عزت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی ہے۔ لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ ان کے تو گھر کی ایک لڑکی کی 'عزت لٹ گئی'، وہ ایسا کہتے ہیں!''

پھر میں چندا سے مخاطب ہوئی: ''اور اب چندا میں تمہاری کہی ہوئی بات کی طرف آتی ہوں۔ مردوں نے ان عورتوں کی جنسی خواہش پر تو اپنا پورا تسلط قائم کر ہی لیا جن کو وہ اپنی نسل بڑھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اپنے لیے وہ کچھ اور بھی چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے لیے تفریح اور کھلواڑ کے امکانات بھی پیدا کیے۔ انہوں نے یہ ذیلی طبقہ پیدا کیا، اس پر ستم ظریفی یہ کہ اسے ''برائی'' کا نام دے کر معاشرے سے علیحدہ بھی کر دیا تاکہ مقتدر اور طاقتور مرد ہی یہاں لطف اندوز ہو سکیں۔ منکوحہ بیویوں کے علاوہ دوسری عورتوں تک دسترس رکھنے کو مردوں نے کئی طرح سے ممکن بنایا ہے۔ ان میں حرم رکھنا، باندیاں اور لونڈیاں رکھنا اور طوائفوں سے رشتہ قائم کرنا، سب کچھ شامل ہے۔ انہوں نے عورتوں کا ایک ایسا طبقہ تخلیق کیا جن سے وہ آزادانہ جنسی تعلقات قائم کر سکتے تھے، جو ہر طرح ان کی تفریح کا سامان فراہم کر سکتی تھیں اور جن کے ساتھ وہ اپنی ہر ممنوعہ خواہش کی تکمیل کر سکتے تھے۔ مرد اِن عورتوں کے ساتھ دادِ عیش بھی دیتے ہیں مگر ساتھ ہی انہیں ''بُری عورتوں'' کا خطاب دے کر اپنے آپ کو بری الذمہ کر لیتے ہیں۔ ان کے ذہن میں عورتیں دو قسم کی ہیں؛ اچھی عورتیں اور بری عورتیں۔ اچھی عورتیں ماں، بہنیں، بیٹیاں اور بیویاں ہوتی ہیں۔ (یہ سب رشتے مرد کے ہی حوالے سے تسلیم کیے جاتے ہیں) اور بقیہ تمام عورتیں طوائفیں ہیں جو کہ بری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دفاتر یا فیکٹریوں میں کام کرنے والی خواتین کو اپنا مقام متعین کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔''

چندا ہماری باتیں دکھ سے سُن رہی تھی۔ کمرے میں ایک مغموم خاموشی چھا گئی۔ پھر چندا نے کہا: ''فوزیہ... میں نے اپنی زندگی خود سے تو نہیں چنی۔ بس ایک گھر میں پیدا ہو گئی۔ میں نے

اُسے اپنی قسمت سمجھا۔ شاید یہ سب کچھ صرف خدا کی مرضی سے نہیں ہوا۔ طاقتور امیر مردوں نے ہم سے یہ دھندا کروایا ہے اور اس معاشرے نے اسے ایک خاص نظر سے دیکھا ہے۔"

چندا کی آنکھوں میں آنسو جھلملا اٹھے۔ اس نے سخت افسردگی سے کہا: "لیکن... مجھے دیکھو... مجھے جس راستے پر ڈال دیا گیا اسی پر چلتی رہی ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ جب یہ سب ریتیں رسمیں میرے خلاف تھیں تو میری ماں نے کیوں مجھے یہی سکھائیں؟" یہ کہتے کہتے شدّتِ جذبات سے اس کی آواز بھرّا گئی۔

فائزہ کہنے لگی: "اور میری دنیا میں مائیں بیٹیوں کو فرمانبرداری کا سبق دیتی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ اس سماج میں ان کی بیٹیاں اسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہیں اگر وہ ان تمام رواجوں پر عمل کریں۔ وہ نہیں چاہتیں کہ ان کی بیٹیاں کوئی دوسرا راستہ اختیار کر کے دکھ اٹھائیں۔ شاید وہ اس نظام کی سیاست کو پوری طرح نہ سمجھتی ہوں، مگر وہ یہ ذمہ داری سمجھتی ہیں کہ اپنی اولاد کی پرورش انہی خطوط پر کریں جو معاشرے نے عورتوں اور مردوں کے لیے بنائے ہیں۔ میری امّی بھی بالکل ایسی ہی ہیں۔ ان کی دلی تمنا یہی تھی کہ سب لوگ میری تعریف کریں۔ ایسا تو ان کے ذہن میں بھی نہ آیا ہوگا کہ وہ اپنا احساسِ کمتری مجھ تک منتقل کر رہی ہیں۔ ان کی تو بس اتنی آرزو تھی کہ ان کی بیٹی اس سماجی نظام میں خوش رہے اور کامیاب زندگی گزارے۔"

"میں سمجھ گئی"۔ چندا نے کہا: "میری امّی بھی ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ وہ مجھے ناکام زندگی گزارتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتیں۔ ان کو ڈر تھا کہ کہیں میں دوسری طوائفوں سے پیچھے نہ رہ جاؤں۔ انہوں نے مجھے اس کاروبار کے سارے داؤ پیچ سکھائے تاکہ میں کامیاب رہوں۔" چندا نے فائزہ کے شانے پر سر رکھتے ہوئے کہا: "یہ سماج تو نہ ان کی سمجھ میں آیا اور نہ میں سمجھ پائی۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھیں کہ میری تربیت اس طرح کرنی ہے کہ میں ناکام نہ رہوں۔ انہوں نے مجھے یہی سکھایا کہ جسم فروشی ترک کرنا یا شادی کر لینا ہمارے سماج کی روایات کے خلاف ہے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی سکھایا کہ اپنی برادری میں شادی کرنا بھی روایت کے خلاف ہے۔ ایسا قدم اٹھانے پر میں برادری سے نکال دی جاؤں گی۔ وہ اسی لیے مجھے اس نظام کے اصولوں پر چلانا چاہتی تھیں تاکہ مجھے دکھ نہ پہنچے۔"

کمرے میں ایک بوجھل خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر میں نے کہا: "مرد اپنے لیے اولاد پیدا کرنے والی عورتوں اور تفریح کا سامان مہیا کرنے والی عورتوں میں امتیاز برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے طوائف کے پیشے کو 'کلنک' کا نام دینے کا حربہ استعمال کیا گیا۔ چکلے میں گاہک کا جانا معیوب

نہیں ہے، صرف طوائفیں ایک عیب، ایک 'کلنک' ہیں۔ یہ کلنک اس پورے نظام کو قائم رکھتا ہے۔ عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ عورتیں تو پیدائشی ہی بُری ہیں اور معاشرے کی ہر برائی کی جڑ بھی یہی ہیں۔ انہیں کبھی سماج کے دوسرے طبقوں کے مرد سے شادی کی اجازت نہیں دینی چاہیے، انہیں ہمیشہ شرفا سے دور رکھنا چاہیے۔ اس کلنک کے باعث مرد اُن کے ذریعے افزائشِ نسل نہیں کرتے۔ اگر ان سے مردوں کی اولاد پیدا بھی ہو جائے تو اسے 'نطفۂ حرام' کہا جاتا ہے۔ 'کلنک' کا ایک یہ بھی مقصد ہے کہ یہ عورتیں اپنا پہلے سے متعین کیا ہوا کردار ادا کرتی رہیں اور کسی دوسری طرح کی زندگی گزارنے کا خیال تک ان کے قریب نہ پھٹکے۔ یہ تمام نام نہاد کہاوتیں کہ طوائف ہمیشہ طوائف ہی رہتی ہے اور معاشرہ کبھی طوائف کو قبول نہیں کر سکتا، اسی لیے بنائی گئی ہیں کہ معاشرتی پابندیوں سے آزاد، عورتوں کا ایک گروہ مردوں کی دلبستگی کے لیے موجود رہے۔ تیسرا مقصد یہ ہے کہ کلنک کا ٹھپہ طوائفوں کو 'اچھی عورتوں' سے ہمیشہ دور رکھے، عام عورتیں ان سے خوفزدہ رہیں اور 'اچھی' عورتوں اور 'بری' عورتوں کی تفریق قائم رہے۔''

پھر میں نے کہا: ''شریف گھرانوں کی کوئی بھی لڑکی یا عورت اگر موسیقی یا رقص سے دلچسپی کا اظہار کرے، یا بلند آواز میں قہقہہ ہی لگا کر خوشی کا اظہار کرے تو معاشرتی دباؤ اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ ایسا نہ کرے ورنہ اسے 'بُری' عورت سمجھا جائے گا، اچھی عورت کو ہمیشہ 'بُری' عورتوں سے خوف کھانا چاہیے اور ان سے دور رہنا چاہیے۔''

فائزہ چونک گئی۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی آواز کو دباتے ہوئے کہا: ''ہائے فوزیہ باجی! یاد ہے جب میں پہلی بار نئے سال کی شام آپ کے ساتھ یہاں آئی تھی تو کتنا ڈر رہی تھی؟'' پھر اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ''کس بات سے ڈر رہی تھی میں؟'' اس نے بے چینی سے کمرے پر نظر ڈالی اور بولی، ''دراصل میں ایک ممنوعہ کام کر رہی تھی۔ 'اچھی' اور 'بُری' عورت کے درمیان اٹھائی ہوئی دیوار کو پھلانگ رہی تھی، ایک ممنوعہ دنیا میں داخل ہو رہی تھی... اور آج...'' فائزہ کا چہرہ ایک مسکراہٹ سے روشن ہو گیا۔ ''آج میں کس طرح چندا سے کھل کر اس موضوع پر بات کر رہی ہوں۔''

پھر فائزہ نے کہا: ''چندا... میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ کبھی کبھی، بہت غصے میں... میں طوائف کا لفظ گالی کی طرح استعمال کرتی تھی۔''

چندا نے اداسی سے کہا: ''معافی کیسی؟ خود اس محلّے میں، ہم لوگ 'گشتی' گالی کے طور پر ہی استعمال کرتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو ایک گالی سمجھتی ہیں۔'' یہ کہہ کر چندا رونے لگی۔

فائزہ نے کہا: ''اچھی بہن! رو مت... میں تمہیں بتاتی ہوں... مجھ جیسی لڑکیاں خود 'عورت'

کے لفظ کو گالی کی طرح ہی استعمال کرتی ہیں۔ اگر میرا بھائی رونے لگے تو میں کہتی ہوں۔ کیا عورتوں کی طرح رو رہے ہو؟ اگر وہ بزدلی دکھائے تو میں کہتی ہوں، جاؤ، عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جاؤ! مجھے خیال بھی نہیں آتا کہ اس طرح میں خود اپنے وجود کی توہین کرتی ہوں۔"

چندا اور فائزہ ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔ چندا جانتی تھی کہ آئندہ جب کبھی اس کے گاہک کوٹھے پر اسے پسند کرنے یا مسترد کرنے کے لیے آئیں گے تو وہ شادی کے بازار میں سجی ہوئی فائزہ کے بارے میں سوچے بنا نہیں رہ سکے گی۔ فائزہ بھی جانتی تھی کہ اس کے گھر میں "لڑکی دیکھنے والے" اب جب آئیں گے تو اس کے ذہن میں چندا کا خیال ضرور آئے گا۔

فائزہ نے دھیرے سے کہا: "اچھا ہوا کہ میں تم سے ملی چندا! بہت کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔"

چندا اور فائزہ نے میری طرف دیکھا جیسے میں انہیں مسئلے کا حل بتاؤں گی۔ میں نے بے ساختہ کہا:

"میری طرف مت دیکھو۔ میرے لیے تو سب برابر ہے۔ ایک درمیانے درجے کی عورت کا اس 'طوائف' کو گالی دینا جو کہ شرفا کے پڑوس میں آ بسی ہو، ایک مرد کا بس سٹاپ پر اکیلی لڑکی پر آواز کسنا، ایک افسر کا یہ سمجھنا کہ وہ اپنی ماتحت پر عشقیہ جملے کس سکتا ہے، ایک خاوند کا اپنی بیوی کو مار مار کر نیل ڈال دینا، ایک ماں کا اپنی بچی کو تابعداری کا سبق دینا، یہ سب عوامل ایک عورت کو 'اچھی' یا 'بری' عورت کے سانچے میں مقید کرتے ہیں جو اس نظام کا اولین مقصد ہے۔ سو میرے لیے یہ سب ایک ہی بات ہے۔ یہ دونوں صورتیں زیادہ مختلف نہیں۔

میں نے ایک بازو چندا کے گلے میں ڈالا اور ایک فائزہ کے تو میرے بھی آنسو چھلک گئے۔

ایک ہی تصویر کے دو رُخ، میں نے سوچا ایک 'بری' عورت جو بازار میں گناہ کے نام پر بکتی ہے اور دوسری 'اچھی' عورت جو غیرت اور عزت کے نام پر بکتی ہے۔ دونوں اپنا اپنا کردار ادا کر رہی ہیں جو ایک ہی پدرسری نظام نے متعین کیے ہیں۔

کلنک: ہیرامنڈی کی درپردہ ثقافت

فوزیہ سعید　　　　ترجمہ: فہمیدہ ریاض

یہ کتاب آپ کو لاہور کے مشہور شاہی محلے کی دریافت کے سفر پر لے جاتی ہے۔ مصنفہ اس بازار سے وابستہ لوگوں کی زندگیوں کے ذریعے شاہی محلے کی حقیقت سناتی ہیں: طوائفیں اور ان کے دلال، نائکہ، اور گاہک اور ان کے ساتھ میراثی اور دوسرے بہت سے افراد۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر لوگ اپنی روزی کمانے کے لیے قدیم روایات پر سختی سے قائم ہیں لیکن انہیں نہیں معلوم کہ آج کے سماج میں ان کی حیثیت کیا بنتی ہے۔ جنوبی ایشیا میں طوائف کے پیشے کا رقص و موسیقی سے ہمیشہ قریبی تعلق رہا ہے۔ یہ کتاب پاکستان کے فنونِ لطیفہ میں ان لوگوں کے اہم کردار کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

یہ ظاہر کرنے کو کہ کیوں ''اچھے لوگوں'' کا طوائف کے پیشے سے کوئی تعلق نہیں ہے، پاکستانی معاشرے نے کئی مفروضات تخلیق کیے ہوئے ہیں۔ یہ مفروضات اُن ''بدکردار'' عورتوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں جو ''شریف مردوں'' کو گناہ کے کاموں میں پھنساتی ہیں۔ ہمارا معاشرہ ان مفروضات پر سوال اُٹھانے کی بھی ہر طرح سے حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ ان مفروضات کی گتھی سلجھانے کے ساتھ ساتھ یہ کتاب ہماری سمجھ بوجھ کے پردے سے گرد و غبار ہٹاتے ہوئے ہمیں اپنے معاشرے میں عورتوں سے غیر منصفانہ رویے کو سمجھنے میں بھی مدد دیتی ہے۔

مصنفہ کے بارے میں: فوزیہ سعید نے یونیورسٹی آف منی سوٹا سے شعبۂ تعلیم میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

وہ گزشتہ چودہ برسوں سے مختلف اداروں جیسے لوک ورثہ، آغا خان فاؤنڈیشن اور یونائیٹڈ نیشنز ڈولپمنٹ پروگرام میں مختلف عہدوں پر کام کرتے ہوئے پاکستان میں معاشرتی تبدیلی لانے کے لیے کوشاں رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ غیر سرکاری سطح پر ہونے والی ان کوششوں میں بھی شریک رہیں جن کے توسط سے پاکستان میں صنفی ناانصافی کے خاتمے کے امکانات کو واضح کیا جا سکے۔ فوزیہ غیر سرکاری تنظیم بیداری کی بانی بھی ہیں جو عورتوں کو زنا بالجبر اور گھریلو تشدد کی وجہ سے درپیش نفسیاتی بحران سے نمٹنے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ پاکستان میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا ادارہ ہے۔ آج کل وہ بین الاقوامی ترقیاتی ادارے ایکشن ایڈ پاکستان کی سربراہ ہیں اور ایک شہری ہونے کے ناتے انسانی حقوق کی روزمرہ جدوجہد میں بھرپور حصہ لے رہی ہیں۔

اس کتاب کے بارے میں مزید معلومات www.pak-philes.com/klunk سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

ISBN 0-19-579887-2

www.oup.com